سفرنامہ اسپین و فلسطین

مولانا وحید الدین خاں

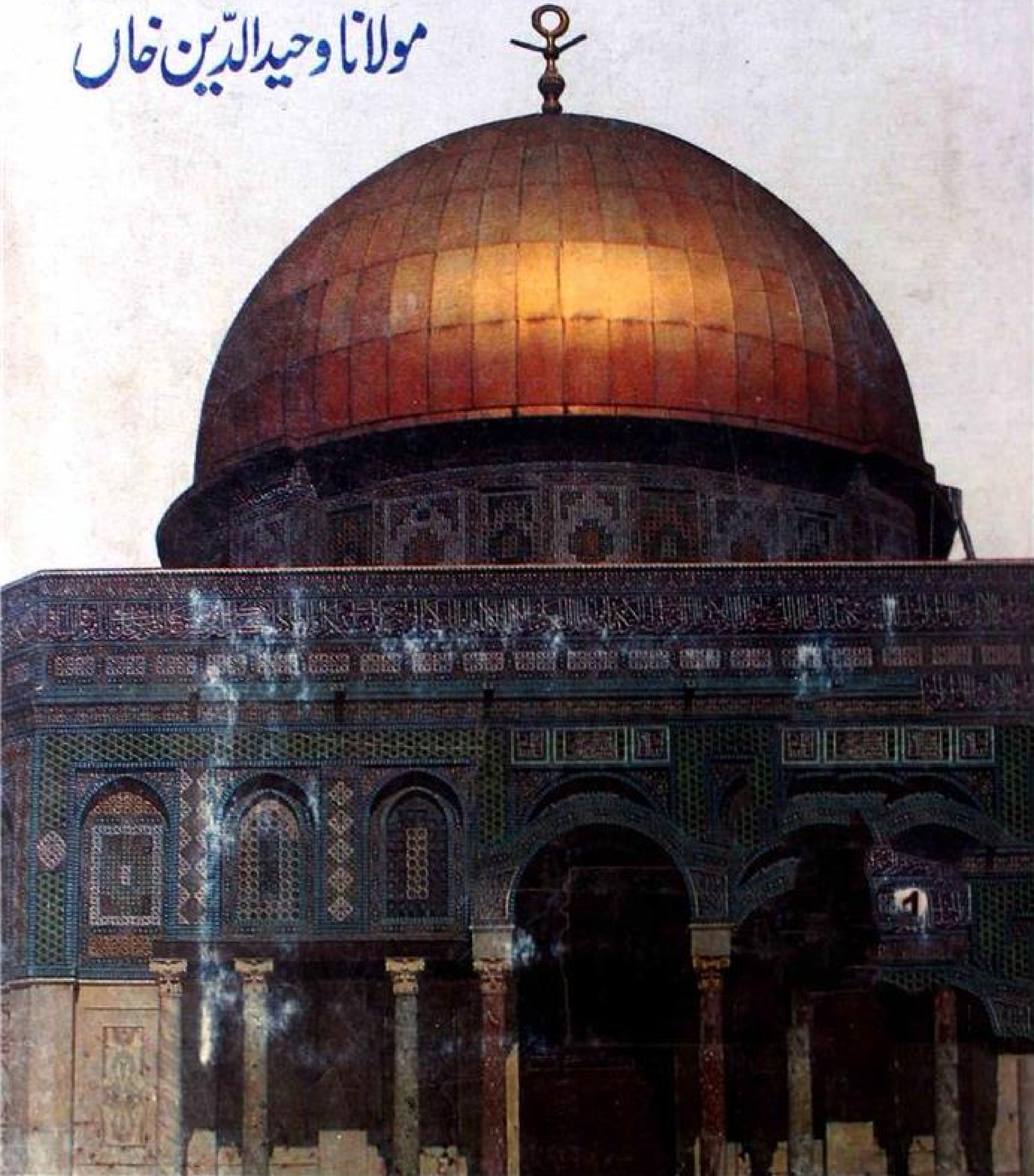

103066

سفرنامہ اسپین و فلسطین

مولانا وحیدالدین خاں

Safarnama Spain wa Falsteen
By Maulana Wahiduddin Khan

First published 1998

No Copyright
This book does not carry a copyright.
The Islamic Centre, New Delhi being a non-profit making institution,
gives its permission to reproduce this book in any form or
to translate it into any language for the propagation
of the Islamic cause.

Al-Risala Books
The Islamic Centre
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128, 4611131
Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

Printed by Nice Printing Press, Delhi

تمہید

اس مجموعہ میں دو سفرنامے شامل کیے گئے ہیں ــــــــ اسپین کا سفرنامہ اور فلسطین کا سفرنامہ۔ دونوں سفر دو الگ الگ وقتوں میں کیے گئے۔ تاہم دونوں میں بہت سی مشابہتیں ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ دونوں کو ایک ساتھ شائع کیا جائے۔

یہ سفرنامہ صرف سفرنامہ ہے، وہ اسپین یا فلسطین کی تاریخ نہیں۔ راقم الحروف کے لیے یہ دونوں سفر اکتشافی نوعیت کے تھے۔ اس نے اس سفر کے دوران اسپین اور فلسطین کو ازسرنو دریافت کیا۔ ان سفرناموں میں اس کے اسی اکتشافی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ جو لوگ ان ملکوں کی تاریخی تفصیلات جاننا چاہیں وہ متعلقہ کتابوں میں اسے دیکھ سکتے ہیں۔

اندلس یا مسلم اسپین کی تاریخ، دوسرے اکثر مسلم ملکوں کے مقابلہ میں، غالباً سب سے زیادہ پُراز واقعات ہے۔ اندلس میں ہر قسم کے واقعہ کی مثال موجود ہے۔ فتح کی مثالیں بھی اور شکست کی مثالیں بھی، ترقی کی بھی اور تنزل کی بھی۔ مادیات کی بھی اور روحانیات کی بھی۔ علمی اور فکری بھی اور عملی اور انقلابی بھی۔ گرنے کی بھی اور گرنے کے بعد دوبارہ اٹھ جانے کی بھی۔

اسپین کا موجودہ سفرنامہ سادہ معنوں میں صرف ایک سفرنامہ نہیں ہے۔ وہ ملت کی طویل تاریخ کے ایک نمایندہ صفحہ کا مطالعہ ہے اور اسی کے ساتھ ملت کی نشاۃ ثانیہ کے لیے مہمیز بھی۔ وہ ماضی کا مرقع اور حال کی رہ نمائی ہونے کے ساتھ مستقبل کی نوید ہے۔

اسپین میں مسلمانوں کا داخلہ بڑا عجیب تھا۔ وہاں انھوں نے جو ترقیاں کیں وہ بھی اپنے زمانہ کے لحاظ سے استثنائی حد تک عجیب تھیں۔ اس کے بعد وہاں سے مسلم اقتدار کا خاتمہ بھی عجیب انداز سے ہوا۔ مگر ان سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ غیر معمولی قسم کی مخالفانہ کارروائیوں کے باوجود اسلام وہاں موجود رہا اور آج بھی مزید اضافہ کے ساتھ وہ وہاں موجود ہے۔

مسلم اسپین کا مطالعہ کوئی تاریخی المیہ کی صورت میں کرتا ہے اور کوئی فردوس گم گشتہ کی صورت میں۔ لیکن زیر نظر سفرنامہ میں مسلم اسپین کا مطالعہ سبق اور نصیحت کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔ بظاہر وہ سفرنامہ ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے ایک مکمل نصیحت نامہ۔

یہی معاملہ فلسطین کا ہے۔ فلسطین میں اسلام کی تاریخ اتنی ہی طویل ہے جتنا کہ خود اسلام کی تاریخ طویل ہے۔ اسلام ابھی مکہ میں تھا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کا وہ واقعہ پیش آیا جس کو اسراء کہا جاتا ہے۔ یہ خدائی انتظام کے تحت ہونے والا ایک سفر تھا جس میں آپؐ مکہ سے روانہ ہو کر یروشلم پہنچے اور یہاں تمام نبیوں کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔

اس کے بعد خلیفۂ ثانی عمر فاروقؓ کے زمانہ میں فلسطین اسلامی مملکت میں شامل ہوا۔ مختلف وجوہ سے یہ ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ تھا۔ چنانچہ اس وقت سے لے کر اب تک یہ علاقہ طرح طرح کے نشیب و فراز سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ تاریخ کے بہت سے باب یہاں بند ہو گئے۔ اور غالباً تاریخ کے بہت سے نئے باب یہاں کھلنے والے ہیں۔ اس سے تعلق رکھنے والی ماضی اور حال کی داستانیں بھی ہیں، اور مستقبل کی بابت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں بھی۔

اس طرح زیر نظر یہ دو سفر نامے اسلام کی وسیع تاریخ کا دو اہم صفحہ ہیں۔ ان میں انفرادی پہلوؤں کے ساتھ باہم خاص مناسبت بھی ہے۔ اس لیے دونوں سفر ناموں کو ایک ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

وحید الدین

۵ ستمبر ۱۹۹۷

سفرنامۂ اسپین

سفرنامۂ اسپین

اسپین کی مشہور الکلہ یونی ورسٹی (University of Alcala) کے رجسٹرار ڈاکٹر گالا (Mankel Gala) کے دستخط سے ان کا خط مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۹۴ ملا۔ اس میں مجھے میڈرڈ کی تین روزہ کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ انٹرنیشنل کانفرنس ۲۸۔۳۰ نومبر ۱۹۹۴ کو تین سامی مذاہب (یہودیت، عیسائیت، اسلام) کے اشتراک سے ہوئی۔ یہ امن عالم کے بارے میں تھی اور اس کا موضوع تھا :

Three Religions: A commitment for peace

اس دعوت نامہ میں مجھے خصوصی مہمان (special guest) کے طور پر مذکورہ کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کے مطابق اسپین کا سفر ہوا۔

اس سفر کا پہلا سبق آموز تجربہ اس وقت ہوا جب کہ مجھے اس کا "کوپن" ملا۔ ہوائی سفر کا روایتی طریقہ یہ ہے کہ آدمی متعلقہ ایر کمپنی سے ٹکٹ حاصل کرتا ہے۔ اس کے بعد ایر پورٹ پر اسے بورڈنگ کارڈ دیا جاتا ہے۔ اس بار پی ٹی اے کی بنیاد پر ایر فرانس سے ہمیں جو چیز دی گئی وہ معروف ٹکٹ نہ تھا۔ بلکہ چار کوپن جو گویا ٹکٹ بھی تھا اور بورڈنگ کارڈ بھی۔ مغربی ممالک اسی طرح اپنی ترقی کا سفر مسلسل جاری رکھتے ہیں۔ مگر ہندستان جیسے ملکوں میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔

۲۷ نومبر کی صبح کو گھر سے ایر پورٹ جانے کے لیے نکلا تو سورج کی روشنی پھیل چکی تھی۔ سڑک پر حسب معمول گاڑیاں دوڑتی ہوئی نظر آئیں۔ قدیم زمانہ کے ایک شاعر نے کہا تھا :

ہوئی صبح اور ادھر ہم کان پر رکھ کر قلم نکلے

موجودہ زمانہ کا آدمی شاید کہے گا کہ صبح ہوئی اور ہم اپنی گاڑی لے کر روانہ ہوئے۔ مشینی انقلاب نے قدیم وجدید میں جو فرق کیا ہے اس کی یہ ایک علامتی مثال ہے۔

دہلی کے انٹرنیشنل ایر پورٹ پر داخل ہوا تو اندر کا وسیع ہال پلاسٹک کے بڑے بڑے بنڈلوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر ایک پر لکھا ہوا تھا، باکو (Baku) یہ سب ایر ٹرانسپورٹ کے ذریعہ روس بھیجے جا رہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ تمام بنڈل سلے ہوئے لباس اور گرم کپڑے سے بھرے

ہوئے ہیں۔ روس سے ہندستان جنگی ہتھیار خرید رہا ہے۔ مگر ضرورت کی چیزوں کے لیے خود روس مجبور ہے کہ وہ ان کو ہندستان اور دوسرے ملکوں سے خریدے۔ اشتراکی نظام کی یہ غیر متوازن ترقی بھی کیسی عجیب ہے۔

انتظار گاہ کے اندر دیوار پر دو شیروں کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ شیر لکڑی کاٹ کر اور اس پر قدرتی رنگ دے کر بنائے گئے تھے۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سچ مچ دو شیر کھڑے ہوئے ہیں۔ شیر فطرت کا ایک عجیب مظہر ہے۔ شیر تمام جانوروں میں سب سے زیادہ طاقت ور جانور ہوتا ہے۔ مگر ماہرین کا کہنا ہے کہ شیر سب سے زیادہ غیر جنگجو جانور ہے۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہونے کے ساتھ اعراض کا بادشاہ بھی ہے۔

ایرپورٹ کی انتظار گاہ میں تھا کہ قریب کی خالی کرسیوں پر کچھ نوجوان مرد اور عورت آکر بیٹھ گئے۔ یہ سب مغربی سیاح تھے اور انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ میرا رخ الٹی طرف تھا مگر قریب ہونے کی وجہ سے ان کی آواز کانوں میں آرہی تھی۔ ان میں سے ایک نے پوچھا کہ تم نے دہلی میں کیا کیا دیکھا۔ بتانے والے نے جن چیزوں کے نام بتائے ان میں سے ایک "جامع مسجد" بھی تھی۔ میں نے سوچا کہ دہلی کی تاریخی جامع مسجد کو دیکھنے کے لیے ہر روز ملکی اور غیر ملکی لوگ کثرت سے آتے ہیں۔ گویا مدعو خود داعی کے پاس آرہا ہے۔ دور جدید میں سیاحت کے فروغ کی بنا پر یہ ممکن ہوا ہے۔ جامع مسجد کے ساتھ اگر ایک دعوتی شعبہ ہوتا تو اس کے ذریعہ ملک میں اور ملک کے باہر زبردست دعوتی کام ہو سکتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے بے فائدہ سیاسی شغف نے تمام دعوتی امکانات کو برباد کر رکھا ہے۔

دہلی سے ایر فرانس کی فلائٹ نمبر ۱۷۱ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایر فرانس کی فلائٹ میگزین اٹلس (atlas) دیکھا۔ مگر اس میں یا فیشن والی چیزوں کے اشتہار تھے یا سیاحوں کی دل چسپی کی باتیں تھیں۔ کوئی خاص مضمون قابل ذکر نہیں ملا۔

ڈیڑھ سو صفحہ کے اس خوب صورت میگزین میں ایک سادہ شیٹ لگی ہوئی تھی۔ یہ برائے تجاویز (suggestions) تھی۔ اس میں آٹھ زبانوں میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ پرواز کے دوران یا گراؤنڈ پر ہماری سروس کے بارہ میں آپ جو بھی تبصرے (comments) لکھنا چاہیں بلا تردد لکھ کر ہمیں یا دستی

طور پر دے دیں یا بذریعہ ڈاک بھیج دیں۔ آٹھویں نمبر پر عربی عبارت تھی۔ اس کے الفاظ یہ تھے :

الرجاء تزويدنا بملاحظاتكم على خدمتنا على الأرض واثناء السفر وان تدونوا كذلك مقترحاتكم على هذه البطاقة ثم ارسالها بالبريد أو تسليمها الى طاقم الطائرة. شكرا. الخطوط الجوية الفرنسية.

ہوائی کمپنی ایک تجارتی ادارہ ہے۔ تاجر اپنے بارہ میں لوگوں کا تبصرہ جاننے کا حریص ہوتا ہے۔ تاکہ وہ لوگوں کے مزاج کی رعایت کرکے اپنی تجارت کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنائے۔ اسی طرح داعی بھی مدعو کی ہر بات کو نہایت دھیان کے ساتھ سنتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح اس کے لیے ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ مدعو کے مزاج کو سمجھ کر اپنی دعوت کو اس کے لیے زیادہ موثر اور قابل قبول بنا سکے۔

ہوائی جہاز کی سواری مجھ کو ایک خدائی نشانی نظر آتی ہے۔ ہوائی جہاز کی ایک عجیب صفت یہ ہے کہ وہ انسان کی اُس کمزوری (vulnerability) کو ممثل کرتا ہے جو زمین کے اوپر اسے حاصل ہے۔ زمین فٹ بال کی مانند ایک بڑا سا گولا ہے جو خلا میں تیز رفتاری کے ساتھ گھوم رہا ہے۔ خلا میں گردش کرتے ہوئے اس کرہ پر انسان آباد ہے۔ زمین کی اس مسلسل خلائی پرواز میں اگر ذرا سا بھی خلل پڑ جائے تو ایک لمحہ میں پوری انسانی نسل کا خاتمہ ہو جائے۔

کرۂ زمین پر اپنی اس غیر محفوظیت کو انسان اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا، اس لیے وہ اس کو محسوس بھی نہیں کر پاتا۔ ہوائی جہاز آدمی کی اسی غیر محفوظ حالت کا محدود سطح پر ایک وقتی مظاہرہ ہے۔ ہوائی جہاز انسان کی حیثیتِ عجز کی گویا ایک مشینی یاددہانی ہے۔

اس دنیا کی ہر چیز اس لیے ہے کہ آدمی اس سے روحانی تجربہ حاصل کرے۔ مگر یہ روحانی تجربہ صرف اس کے حصہ میں آتا ہے جو میٹر میں نان میٹر کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

راستہ میں وال اسٹریٹ جرنل (بروسیلز) کا شمارہ ۲۵-۲۶ نومبر ۱۹۹۴ دیکھا۔ اس میں سب کی سب تجارتی نوعیت کی خبریں تھیں۔ ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ترکی کپڑے کے اکسپورٹ میں فرانس اور اٹلی کے بعد یورپ میں تیسرے نمبر پر تھا۔ پچھلے سال اس نے چار بلین ڈالر سے زیادہ کے کپڑے اکسپورٹ کیے۔ مگر اب مقابلہ کی وجہ سے ترکی کی یہ صنعت زوال کی طرف جا رہی ہے۔ ایک ترک اکسپورٹر نے کہا : Ours could soon be a dying industry. (p. 4)

ایر ہوسٹس مشروبات کی گاڑی لے آئی ۔ میرے قریب کی سیٹ پر جو صاحب بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے وہسکی مانگی ۔ میں نے آرنج جوس کے لیے کہا۔ میز پر جب دونوں گلاس رکھے گئے تو میں نے دیکھا کہ دونوں مشروب کا رنگ بالکل یکساں ہے ۔ اگرچہ ایک شراب تھی اور دوسرا خالص آرنج کا رس ۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ دنیا میں چیزیں مشابہ انداز میں پیدا کی گئی ہیں۔ حتی کہ حق جس طرح عمدہ الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے ، اسی طرح باطل بھی خوب صورت الفاظ میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ مشابہت برائے امتحان ہے ، اس لیے آدمی کو موجودہ دنیا میں بے حد چوکنا ہو کر رہنا ہے ۔ ورنہ وہ ایک مشروب کو فروٹ جوس سمجھ کر پینے لگے گا۔ حالاں کہ بعد کا انجام بتائے گا کہ وہ پھل کے رس کے رنگ میں شراب تھی جس کو وہ نادانی اور بے شعوری کے تحت پی گیا۔

جس ہم سفر نے شراب لی تھی، ان سے بات کرتے ہوئے میں نے پوچھا کہ شراب پینے سے آپ کو کیا فائدہ ملتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کچھ نہیں۔ میں نے پوچھا کہ پھر آپ کیوں شراب پیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تناؤ دور کرنے (relaxation) کے لیے ۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی عمر ۴۰ سال ہو چکی ہے ۔ مگر وہ کئی گھریلو مسائل سے دوچار ہیں، اب تک انھوں نے شادی بھی نہیں کی۔ اس لیے ذہن پر مستقل بوجھ رہتا ہے اس بوجھ کو اتارنے کے لیے وہ شراب پیتے ہیں۔ اکثر شراب نوشوں کا یہی حال ہے ۔

اس جہاز میں مدراس کے ایک ہندستانی سے ملاقات ہوئی ۔ وہ میکانیکل انجینیر ہیں اور ان کا نام آر وجے کمار ہے ۔ وہ ایک شپنگ کمپنی (اینگلو ایسٹرن شپ مینجمنٹ لمیٹڈ) میں ملازم ہیں۔ وہ پانچ سال سے سمندری جہاز میں کام کرتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے پوچھا کہ سمندر میں جب طوفان آتا ہے تو اس وقت آپ لوگ کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس وقت ہم انتظار کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہم نیچر کے خلاف نہیں جا سکتے :

We are supposed to wait. Because we cannot go against the nature.

انتظار بے عملی نہیں ، اس دنیا میں انتظار بھی ایک عملی پالیسی ہے ۔ مذکورہ مسافر کو میں نے ایک حدیث سنائی۔ اس حدیث کو سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں : افضل العبادۃ انتظار الفرج (کشادگی کا انتظار کرنا افضل عبادت ہے)

ساڑھے نو گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد ہمارا جہاز فرانس کی راجدھانی پیرس میں اتر گیا۔ پیرس کا

ہوائی اڈہ غیر معمولی طور پر بڑا ہے۔ وہ خود ایک شہر ہے۔ میں یہاں کئی بار آچکا ہوں۔ مگر اب تک اس کا جغرافیہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کاؤنٹر پر ایک خاتون ساڑی پہنے ہوئے تھیں۔ انھوں نے میرے حلیہ سے سمجھا کہ میں بھی ایک ہندستانی ہوں۔ انھوں نے میرا ٹکٹ کمپیوٹر پر چیک کرنے کے بعد کہا: پتاجی، آپ کی فلائٹ "ٹرمنل ون" سے ہے۔ وہاں تک آپ کو بس سے جانا ہوگا۔ آپ اس کرسی پر بیٹھ جائیں۔ میں ابھی آپ کو لے جاکر بس پر سوار کرا دیتی ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ہوائی کمپنی کی بس میں تھا۔ یہ بس پیرس کے مختلف حصوں سے گزرتی رہی یہاں تک کہ اس نے مجھے ٹرمنل ون پر پہنچا دیا۔

یہاں ایرپورٹ پر مجھے باتھ روم جانا تھا۔ میں اتفاق سے معذوروں کے باتھ روم میں چلا گیا۔ وہ غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ اس کے اندر ہر قسم کی سہولتیں موجود تھیں۔ حتی کہ اس کے اندر انٹرکام بھی لگا ہوا تھا۔ تاکہ معذور شخص کو کوئی مشکل پیش آجائے تو فوراً وہ انٹرکام پر بتاکر اپنی مدد کے لیے ایرپورٹ کے آدمی کو بلا سکے۔ میں نے کہا کہ خدایا، میں بھی ایک معذور ہوں۔ دنیا میں معذور شخص کو خصوصی رعایت کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ کاش آخرت میں بھی مجھ کو معذور قرار دے کر میرے ساتھ خصوصی رعایت کا معاملہ کیا جائے۔

فرانس میں تقریباً ۱۵۰۰ چھوٹی بڑی مسجدیں ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد کے بارہ میں قطعی اعداد و شمار حاصل نہیں۔ تاہم عام اندازہ یہ ہے کہ یہاں پانچ ملین مسلمان آباد ہیں۔ فرانسیسی مسلمانوں میں زیادہ تر مراکو، الجزائر اور تونس وغیرہ سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ فرانس میں مسلمانوں کی تقریباً نوّے تنظیمیں پائی جاتی ہیں۔ حال میں ان کا ایک وفاق قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۱۹۹۰ میں پیرس میں ایک اسلامی کانفرنس ہوئی جس میں پانچ ہزار سے زیادہ مسلمان شریک ہوئے۔ اس کا موضوع تھا: الحریات وحقوق الانسان فی الاسلام۔

فرانس کی آبادی میں تقریباً ۸۰ فی صد کیتھولک عیسائی ہیں۔ پندرہ فی صد مسلمان ہیں۔ اور پانچ فی صد میں پروٹسٹنٹ اور یہودی ہیں۔ آپ فرانس کے کسی بھی حصہ میں جائیں، آپ کی ملاقات کسی نہ کسی مسلمان سے ہو جائے گی۔ خواہ وہ ایرپورٹ ہو یا کوئی کھیت۔

پیرس کے ایرپورٹ پر ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ انگریزی جانتے تھے اس لیے مشکل پیش نہیں آئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ فرانس ہمیشہ "اسلام دشمنی" میں امریکہ اور مغربی ملکوں کے

ساتھ رہا ہے۔ لیکن آج اسی ملک میں زبردست اسلامی لہر آئی ہوئی ہے :

But now a severe Islamic wave is sweeping the same nation.

مگر سوالات کے دوران اندازہ ہوا کہ "اسلامی لہر" کا یہ نظریہ زیادہ تر خوش فہمی پر مبنی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ فرانس کے چالیس ہزار مسلم نوجوان مکمل طور پر اسلام کے زیر اثر ہیں۔ مگر جب میں نے مزید سوالات کیے تو معلوم ہوا کہ یہ وہی نوجوان ہیں جو بے روزگاری کا شکار ہیں یا اس احساس میں مبتلا ہیں کہ فرانس کی سوسائٹی میں انھیں باعزت مقام نہیں ملا۔ دوسرے لفظوں میں اس اسلامی لہر کے پیچھے اصل محرک مادی محرومی کا احساس ہے نہ کہ آخرت کی جواب دہی کا احساس۔ یہ اسلام کا اکسپلائٹیشن ہے۔ اور اسلام کے اس قومی اکسپلائٹیشن کا یہ الٹا نتیجہ نکلا ہے کہ، مذکورہ فرانسیسی مسلمان کے اعتراف کے مطابق، یہاں کی رائے عامہ شدت سے مسلمانوں کے خلاف ہوگئی ہے :

Public opinion is extremely against Muslims.

ان انتہا پسند مسلمانوں نے اسلام کی نمایندگی اس طرح کی ہے کہ فرانسیسیوں کو نظر آتا ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ان کے سسٹم سے ٹکراتا ہے۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے بہت سی غیر ضروری رکاوٹیں یہاں کے مسلمانوں کو پیش آرہی ہیں۔ فرانس کے وزیر داخلہ چارلس پاسک (Chartes Pasqua) نے شہر لیان (Lyon) کی مسجد کے افتتاح کے وقت اپنی تقریر میں کہا کہ ہمیں فرانس میں صرف اسلام نہیں چاہیے بلکہ ہمیں وہ اسلام چاہیے جو فرانس کا اسلام ہو :

We would not have just an Islam in France. There must be an Islam of France.

فرانس کے مسلمانوں میں بہت تھوڑی تعداد کو چھوڑ کر سب کے سب نارتھ افریقہ کے مہاجرین ہیں۔ نوآبادیاتی دور میں فرانس نے ۱۸۳۰ میں الجیریا کو فتح کیا، ۱۹۰۹ میں اس نے افریقی صحارا کے بڑے حصہ پر اپنا کنٹرول قائم کرلیا۔ تیونس کو اس نے ۱۸۸۱ میں فتح کیا۔ اسی طرح ۱۹۰۵ میں مراکو کو اپنی سیاسی ماتحتی میں لے لیا۔ اس وقت اسپین کو بھی مراکو کا ایک حصہ دے دیا گیا تھا۔ نارتھ افریقہ کے علاقہ پر اسی قبضہ کے زمانہ میں دونوں ملکوں میں آمد و رفت بڑھی۔ اور بڑی تعداد میں افریقہ کے مسلمان اپنے ملکوں سے نکل کر فرانس میں روزگار کے لیے آگئے۔ ان لوگوں نے فرانس کو سستا مزدور فراہم کیا جس کی اس

وقت فرانس کو سخت ضرورت تھی۔

اب یہی لوگ فرانس کے شہری بن کر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس طرح حالات نے مسلمانوں کو اپنے مدعو کے ملک میں پہنچا دیا تھا۔ اگر وہ معاشی حصول کے بعد صرف دعوت کو اپنا نشانہ بناتے تو یہاں ان کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ اس کی ایک انفرادی مثال ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ہیں۔ انھوں نے صرف علمی اور دعوتی دائرہ تک اپنے کو محدود رکھا۔ چنانچہ وہ فرانس میں ایک مقبول شخصیت بن گئے۔ مگر نام نہاد اسلام پسندوں نے کلچرل تشخص اور قومی حقوق کے نام پر فرانسیسیوں سے زور آزمائی شروع کر دی۔

اس غلط پالیسی کا یہ نتیجہ تو نہیں نکلا کہ فرانس میں ان مسلمانوں کے قومی مطالبات پورے ہو جائیں۔ البتہ یہ احتجاجی سیاست فرانس میں ان کے خلاف نفرت اور غصہ کی فصل اگا رہی ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں دعوت کے مواقع برباد ہو رہے ہیں۔

پیرس میں ایک لڑکی ملی۔ اس نے اپنا نام شاذیہ بتایا، نام سے اس کی شخصیت واضح نہیں ہو رہی تھی۔ مزید دریافت پر معلوم ہوا کہ اس کا باپ ایک مصری مسلمان ہے۔ اس نے یہاں ایک عیسائی خاتون سے شادی کی۔ اس خاتون نے اپنا مذہب نہیں بدلا، اس کے بعد ان کے یہاں مذکورہ لڑکی (شاذیہ) پیدا ہوئی۔ ایک عرصہ بعد مصری مسلمان اور اس کی عیسائی بیوی میں اختلاف ہو گیا۔ بڑھتے بڑھتے دونوں میں طلاق ہو گئی۔ اب یہ عورت اپنی لڑکی کے ساتھ علیحدہ مکان میں رہتی ہے۔

گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ اصل مسئلہ غالباً یہ تھا کہ شاذیہ کا بوائے فرینڈ گھر میں آتا تھا۔ وہ ڈرنک بھی کرنے لگی۔ ان باتوں پر اس کی ماں کو اعتراض نہیں تھا۔ مگر مصری مسلمان سخت اعتراض کرتا تھا۔ فرانس چونکہ ایک مسیحی ملک ہے، بیوی کا پلہ بھاری ثابت ہوا۔ آخر کار مصری مسلمان کی مرضی کے علی الرغم اس نے طلاق لے لی۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے مسلمان کس قسم کے نازک مسائل سے دوچار ہیں۔

فرانس کے مسلمانوں میں محدود تعداد نومسلموں کی ہے۔ تاہم یہ نومسلم مسلمانوں کی کسی تبلیغ سے اسلام کی طرف راغب نہیں ہوئے ہیں بلکہ زیادہ تر اپنے ذاتی مطالعہ سے اسلام کی طرف آئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو دور جدید کے "حنفاء" کہا جا سکتا ہے۔ انسان کے اندر فطری طور پر حق کی طلب موجود

ہے۔ تاہم بعض افراد کے اندر یہ طلب زیادہ طاقت ور صورت میں ہوتی ہے۔ یہ لوگ خود اپنے اندرونی تقاضے کے تحت اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر اپنی روحانی طلب کا جواب پاکر اس کو قبول کر لیتے ہیں۔

ایک نومسلم خاتون (مسز زرینہ) نے ایک بڑا عجیب واقعہ بتایا۔ حال میں ایک فرانسیسی عیسائی نے اسلام قبول کیا ہے۔ قبولِ اسلام سے پہلے وہ صرف اسلامی لٹریچر سے آشنا ہوا تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد اس کا ربط مسلمانوں سے ہوا۔ اس نے بعد کو اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں اسلام سے اس وقت واقف ہوا جب کہ میری ملاقات ابھی کسی ایک مسلمان سے بھی نہیں ہوئی تھی:

Thank God I was introduced to Islam before I was introduced to a single Muslim.

فرانس میں بڑی تعداد میں مستشرق پیدا ہوئے۔ انھوں نے عربی زبان سیکھی اور اسلامی علوم کا گہرا مطالعہ کیا۔ عام طور پر ہمارے یہاں استشراق کو اسلام کے خلاف ایک مغربی سازش سمجھا جاتا ہے مگر یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم دانشور اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر ایسا کرتے ہیں کہ کسی کے یہاں اگر کوئی چیز خلافِ مزاج یا خلافِ حق دیکھتے ہیں تو بس اسی کو جنرلائز کرنے لگتے ہیں۔ وہ آدمی کی تمام مثبت باتوں کو بھلا کر چند اختلافی باتوں ہی کو اس کی کل بات قرار دے دیتے ہیں۔

مستشرقین میں بہت سے ایسے افراد ہیں جنھوں نے اسلام کے گہرے مطالعہ کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ انھیں میں سے ایک فرانس کا مستشرق آتین دینیہ (Etienne Dinet) ہے۔ وہ ۱۸۶۱ء میں پیرس میں پیدا ہوا، اور ۱۹۲۹ء میں پیرس ہی میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے ۱۹۲۷ میں الجزائر میں اسلام قبول کر لیا۔ اس کے قبولِ اسلام کی تقریب میں عرب علما کی بڑی تعداد شریک تھی۔ اس نے اپنا اسلامی نام ناصرالدین رکھا۔ اس کی اسلام پر کئی اعلیٰ تصنیفات ہیں۔ ان میں سے ایک فرانسیسی زبان میں لکھی ہوئی سیرتؐ (Mohamet) ہے۔ اس کی مختلف اسلامی کتابوں میں سے ایک کتاب عربی میں اشعۃ من نور الاسلام کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق، اس کی تدفین الجزائر کے ایک گاؤں بوسعادہ میں ہوئی۔

دکتور محمود المقداد کی کتاب تاریخ الدراسات العربیۃ فی فرنسا ۱۹۹۲ میں کویت سے

چھپی ہے۔ ۳۰۰ صفحہ کی یہ کتاب فرانس میں عربی مطالعات کے موضوع پر ایک اچھی کتاب ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۸۳۰ء میں جب فرانس نے الجزائر پر قبضہ کیا تو یہ فرانسیسیوں کے لیے عربی زبان اور عربی علوم کے مطالعہ کا نہایت طاقت ور محرک بن گیا۔ اس کے بعد فرانس میں بڑے بڑے مستعرب (مستشرق) پیدا ہوئے۔ انھیں میں سے ایک اہم شخصیت ہنری ماسیہ (H. Masse) کی ہے جس نے خاص اس موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ شائع کیا ہے (صفحہ ۲۲۹)

عرب دنیا میں سیاسی نفوذ حاصل کرنے کے بعد فرانس نے عربوں کو فرانسیسی بنانے (فرنسة الشعب العربی) کی مہم چلائی تھی، مگر سیاسی اور فوجی بالادستی کے باوجود فرانس ناکام رہا۔ فرنسة الشعب العربی کی مہم عملاً اسلمة الشعب الفرنسی کے ہم معنی بن گئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظریہ کی طاقت ہر دوسری طاقت سے زیادہ عظیم ہے۔

بنگلہ دیش کی مصنفہ تسلیمہ نسرین، جو اپنے وطن سے بھاگ کر سویڈن میں مقیم ہے، آجکل فرانس کے دس روزہ دورہ پر ہے۔ اس کو فرانس بلاکر انسانی حقوق کی مجاہدہ کا انعام دیا گیا ہے۔ یکم دسمبر ۱۹۹۴ کو موصوفہ سے فرانس کے صدر متراں (Francois Mitterrand) نے ریلیزی پیلس میں ملاقات کی۔ تسلیمہ نسرین نے صدر فرانس کو بتایا کہ کس طرح وہ اپنی روشن خیالی کی بنا پر انتہا پسند مسلمانوں کے عتاب کا شکار ہو رہی ہے۔ ۲۰ منٹ کی یہ ملاقات خود پریسیڈنٹ متراں کی درخواست پر ہوئی۔ کیونکہ صدر موصوف یہ چاہتے تھے کہ وہ فرانس کی طرف سے موصوفہ کی قدر دانی کا اظہار کریں۔

نام نہاد مسلم دانشور اس واقعہ پر صدر فرانس کو برا کہیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جنھوں نے اعراض کے اشو کو ہنگامہ آرائی کا اشو بنایا۔ اور اس طرح انتہائی غیر ضروری طور پر تسلیمہ نسرین کو ہیرو کا درجہ دے دیا۔

کسی طالب علم سے پوچھا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ غیر کمیونسٹوں کو رائٹسٹ اور کمیونسٹوں کو لفٹسٹ کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی ذہانت کے زور پر جواب دیا ——— اس لیے کہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ وہ کبھی رائٹ (درست) نہیں ہوتے:

Because, the events in communist countries have proved that they might not be right.

مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ اصطلاح فرانس میں بنی۔ فرانسیسی ریولیوشن کے زمانہ میں نیشنل اسمبلی میں دو بڑے سیاسی گروپ تھے۔ کنزرویٹو گروپ بادشاہ کی حمایت کرتا تھا۔ اور ریڈیکل گروپ سسٹم میں ڈراسٹک تبدیلیوں کی مانگ کر رہا تھا۔ اسمبلی ہال میں ان کی نشستیں اس طرح تھیں کہ کنزرویٹو (شاہ پسند) ممبران اسپیکر کے دائیں طرف بیٹھتے تھے۔ اور انقلاب پسند اسپیکر کے بائیں طرف۔ اس وقت سے سیاسی اصطلاح میں انقلابی تبدیلی (radical change) چاہنے والوں کو لفٹسٹ کہا جانے لگا۔

پیرس آج کل ایک نئی تحریک کا مرکز بن رہا ہے جس کو اٹلانٹا پلس (Atlanta Plus) کہا جاتا ہے۔ ان کی مانگ ہے کہ ۱۹۹۶ میں اٹلانٹا میں ہونے والے اولیمپک گیم میں عورتوں کو بھی برابر کی حیثیت سے شریک کیا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۹۲ میں بارسلونہ (اسپین) میں جو اولیمپک کھیل ہوئے تھے، اس موقع پر یہ طے کیا گیا تھا کہ کھیلوں میں جنسی امتیاز کا خاتمہ کیا جائے۔ مگر ۳۴ مسلم ملک ابھی تک اس کے لیے راضی نہیں ہوئے ہیں۔ تحریک کی ایک پُرجوش حامی خاتون نے کہا کہ جنسی امتیاز بھی نسلی امتیاز ہی کی مانند ہے:

Sex discrimination is analogous to the racial discrimination.

میں نے ایک خاتون سے کہا کہ کیا آپ پسند کریں گی کہ اگلے اولیمپک میں فرانس کی ایک خاتون افریقہ کے ایک مرد باکسر کا مقابلہ کرے۔ وہ اس پر راضی نہیں ہوئیں۔ میں نے کہا کہ خود آپ کی اسکیم کے مطابق، عورتوں کو عورتوں کے مقابلہ میں کھیلنا ہے نہ کہ مردوں کے مقابلہ میں۔ یہ تو خود ایک جنسی امتیاز ہے، پھر آپ اس کو جنسی برابری کا نام کیوں دیتی ہیں۔

پیرس میں کچھ وقت گزارنے کے بعد وہاں سے میڈرڈ کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ سفر آئبیرین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۳۴۴۵ کے ذریعہ طے ہوا۔ مقامی وقت کے لحاظ سے ۲۷ نومبر کی شام کو ساڑھے سات بجے جہاز روانہ ہوا۔ یہ ڈیڑھ گھنٹہ کا ایک خوش گوار سفر تھا۔ ہوائی جہاز آگے کی طرف جا رہا تھا اور میرا ذہن پیچھے کی طرف مڑ کر "فرانس میں اسلام" اور "اسپین میں اسلام" کی تاریخ کے صفحات الٹنے میں مصروف تھا۔

راستہ میں اسپینی ایرلائنز (Iberia) کی فلائٹ میگزین رونڈا ایبیریا کا شمارہ نومبر ۱۹۹۴ دیکھا۔ ۱۳۰ صفحہ کا یہ میگزین زیادہ تر سیاحوں کے نقطۂ نظر سے مرتب کیا گیا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ لمبا

مضمون غرناطہ کے بارہ میں تھا۔ رنگین تصویروں کے ساتھ یہ مضمون میگزین کے ۲۰ صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ بیک وقت اسپینی اور انگریزی دونوں زبانوں میں تھا۔ اہل اسپین نے ایک عرصہ تک مسلم دور کو نظر انداز کیا۔ پھر انھیں معلوم ہوا کہ اسپین کی مسلم یادگاروں کی اہمیت ان کے لیے مزید اضافہ کے ساتھ وہی ہے جو ہندستان میں تاج محل کی ہے۔ چنانچہ مضمون کا عنوان اس طرح قائم کیا گیا تھا —— غرناطہ، جنّت کی دوبارہ یافت :

Granada, paradise regained

یہ مضمون یہاں سے شروع کیا گیا تھا کہ یہ عمارتیں اور یہ باغات اس لیے بنائے گئے تھے کہ ہم اپنے تصور کی جنت کا ایک پیشگی نظارہ کر سکیں۔ یہاں زمینی ماحول کو ہماری تصوراتی جنت میں ڈھالا گیا تھا۔ اندلس کا مسلم غرناطہ زمین پر جنت بنانے کی ایسی ہی ایک مثال ہے۔

مضمون کی اگلی سطروں میں بتایا گیا تھا کہ ان مسلم بادشاہوں کو ان کے علامتی شہر غرناطہ سے اور ان کی بنائی ہوئی جنتِ عدن سے نکالے جانے کے پانچ سو سال بعد اب کچھ لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کی کھوئی ہوئی جنت کو دوبارہ حاصل کر سکیں :

Now, five hundred years after they were expelled from Granada, their private Eden and their most emblematic city, there are some who are trying to regain that lost paradise of theirs. (p. 62)

اسپین میں داخل ہونے کے بعد جب میں نے دیکھا کہ یہاں مسلمان آزاد ہیں، اور یہاں اسلام کی سرگرمیاں جاری ہیں تو میں نے کہا : ہندستان میں کچھ نادان لوگ یہ کہتے رہتے ہیں کہ انتہا پسند ہندو انڈیا کو دوسرا اسپین بنانا چاہتے ہیں۔ مگر ان کو زمانہ کے فرق کا علم نہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ پہلا اسپین بنانے کی کوشش ابھی کامیاب بھی نہیں ہوئی تھی کہ زمانہ نے عالمی حالات کو بدل کر "اسپین سازی" جیسے منصوبہ کا امکان ہی ختم کر دیا۔

اسپینی ایرلائنز کی اس فلائٹ میگزین (Ronda Iberia) میں اسپین کے مسلم عہد کا نہایت شاندار باتصویر تعارف کرایا گیا تھا۔ اس کو سیاحوں کے لیے اسپین کے سب سے زیادہ پُرکشش مقام کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس ذیل میں اعتراف کیا گیا تھا کہ مسلم دور کے اسپین میں موجودہ اسپین سے بہتر حالات تھے۔ مزید یہ کہ الاندلس (مسلم اسپین) کی وراثت کبھی اسپین سے ختم نہیں ہوئی

اور نہ وہ کبھی ملک بدر کی گئی۔ وہ مختلف صورتوں میں یہاں باقی رہی (اصل عبارت ذیل میں ملاحظ فرمائیں)

میڈرڈ ایرپورٹ پر زیادہ وقت نہیں لگا۔ کانفرنس کی طرف سے دو خواتین موجود تھیں۔ انھوں نے ایک گاڑی میرے حوالے کی جس نے مجھے ہوٹل ایورو بلڈنگ (Hotel Eurobuilding) پہنچا دیا۔ جہاں میرا قیام کمرہ نمبر ۴۴۶ میں تھا۔

ہماری گاڑی جب میڈرڈ کی سڑکوں سے گزر رہی تھی تو اس کو دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ میڈرڈ مغربی یورپ کے بڑے شہروں کے مقابلہ میں دوسرے درجہ کا شہر ہے۔ ابتدائی مرحلہ میں اسپین نے مغربی یورپ کو سائنسی ترقی کا راستہ دکھایا تھا۔ مگر آخری مرحلہ میں اسپین پیچھے اور مغربی یورپ آگے ہوگیا۔ اس کی وجہ یہاں کے مذہبی طبقہ کا غلط کردار ہے۔ انھوں نے اسپین کے مسلمانوں کے ترقیاتی پہلو کو نہیں دیکھا۔ انھوں نے صرف یہ دیکھا کہ وہ غیر مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ اس پہلو کو لے کر انھوں نے مسلمانوں کے خلاف خوب نفرت پھیلائی اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کے علم کے خلاف بھی۔ اس منفی روش نے اسپین میں علمی ترقی کے عمل کو کئی سو سال پیچھے کر دیا۔

انگریز مؤرخ لین پول (Lane-Pool) نے موجودہ صدی کے آغاز میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام اسپین کے مسلمان (Moors in Spain) تھا۔ اس کتاب میں مصنف نے اسپینی مسلمانوں کے علمی اور تمدنی کارناموں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ پھر اس نے لکھا ہے کہ اسپین کی مسلم حکومت کا خاتمہ اور وہاں سے جبراً مسلمانوں کو نکالنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسپین دوبارہ اسی غیر ترقی یافتہ حالت کی طرف لوٹ گیا جہاں وہ پہلے تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ مسلمان اسپین سے نکال دیے گئے۔ کچھ دیر کے لیے مسیحی اسپین چمکا تھا

The people of today's Granada have now come up with an all-embracing scheme aimed at directing people's attention to the past which still surrounds them in the present, helping them in this way to retrieve it. The project, christened The Legacy of Al Andalus, is all set to become a reality next year, and its tempting selection of special tours, designed to rescue the history that lies down half-forgotten byways, is guaranteed to lure travellers on a fascinating journey through the past of these lands, back to times when there were better dreams than there are now: dreams of openness and pluralism. The legacy of Al Andalus never died, and was never conquered or expelled. It left with us its architecture, its monuments, its customs, its speech, its food, its sciences, its odours and its poems. The Granada of the Nasrids, the city of bliss in the midst of the convulsions of the Middle Ages, now wants to raise its head. (*Rondaiberia*, November 1994, page 64)

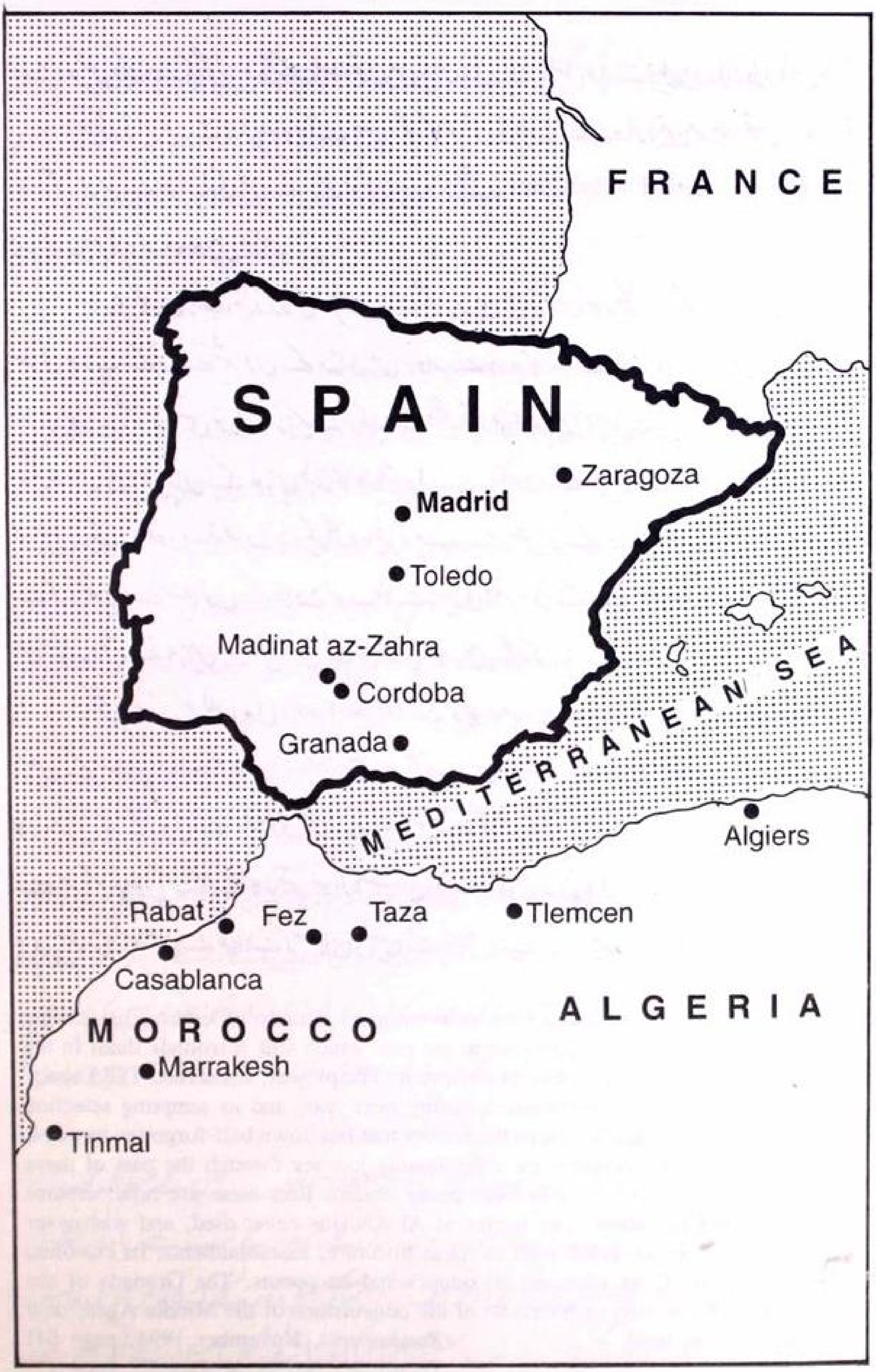
FRANCE
SPAIN
Zaragoza
Madrid
Toledo
Madinat az-Zahra
Cordoba
Granada
MEDITERRANEAN SEA
Algiers
Rabat
Fez
Taza
Tlemcen
Casablanca
ALGERIA
MOROCCO
Marrakesh
Tinmal

جس طرح چاند غیر کی روشنی سے چمک اٹھتا ہے۔ پھر گرہن آگیا۔ اور اسی تاریکی میں اسپین اب تک پڑا ہوا ہے :

The Moors were banished, for a while Christian Spain shone, like the moon, with a borrowed light, then came the eclipse, and in that darkness Spain has grovelled ever since. (p. 280)

مسلم اسپین کا تعارف سب سے پہلے مجھے مسدس حالی کے ذریعہ ہوا۔ اس میں اسپین کے مسلم عہد کا ذکر بڑے جذباتی انداز میں کیا گیا ہے۔ مگر وہ سلبی نوعیت کا تھا۔ مثلاً مسدس کے ایک بند کا دو مصرعہ اس طرح تھا :

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے　　وہ اجڑا ہوا کرّوفر جا کے دیکھے

اس کے بعد میں نے عربی یا اُردو میں جتنے تذکرے پڑھے وہ تقریباً سب کے سب مرثیہ خوانی کے انداز میں تھے۔ مثلاً اقبال نے مسلم نوجوان کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ " وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا " اقبال احمد سہیل کی ایک نظم میں میں نے اس قسم کے اشعار پڑھے :

ہمیں چھائے ہوئے تھے شرق سے تا غرب دنیا میں　　موافق جن دنوں تھی گردش دور زماں ہم سے

مسلم دانشور اور مسلم ادیب اس قسم کی مرثیہ خوانی میں کیوں مبتلا ہیں۔ اس کی وجہ بہت بعد کو مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب کہ اسلام کے وسیع مطالعہ کے بعد میں نے دوبارہ اسلام کو دریافت کیا۔ اب معلوم ہوا کہ ان لوگوں کی کمزوری یہ ہے کہ وہ اسلام کی عظمت کو الحمراء اور لال قلعہ کی سطح پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ سیاسی عظمت کے سوا کسی اور عظمت کی انھیں خبر نہیں۔ اگر وہ صاحب بصیرت ہوتے تو وہ جانتے کہ اسلام کی نظریاتی عظمت تمام عظمتوں سے زیادہ بڑی ہے۔ مزید یہ کہ یہ نظریاتی عظمت اس وقت بھی پوری طرح باقی رہتی ہے جب کہ در و دیوار کی عظمتیں کھنڈر ہو کر گزری ہوئی تاریخ کا حصہ بن چکی ہوں۔

۲۸ نومبر کی صبح کو اٹھا تو یہ سوچ کر عجیب احساس ہوا کہ کل میں ہندستان میں سو کر اٹھا تھا۔ آج میں سو کر اٹھا ہوں تو میں ہزاروں میل دور اسپین میں ہوں۔ وضو کر کے فجر کی نماز ادا کی۔ نماز میں جب میں قرآن کے ایک حصہ کی تلاوت کر رہا تھا تو غیر معمولی طور پر میری آواز اونچی ہو گئی۔ یہ احساس کہ آپ ایک نئی جگہ اللہ کا نام بلند کر رہے ہیں، آپ کے جذبات میں ایک ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ آپ

زیادہ بڑھی ہوئی کیفیت کے ساتھ ذکر اور عبادت کا فعل انجام دینے لگتے ہیں۔

اسپین کے وقت میں اور انڈیا کے وقت میں ساڑھے چار گھنٹہ کا فرق ہے۔ اس وقت جب کہ میں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں بیٹھ کر یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ یہاں رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ جب کہ اس وقت انڈیا کی گھڑیوں کی سوئی صبح چار بجے کا وقت بتا رہی ہے۔ وقت کے اسی فرق کی وجہ سے ایسا ہوا کہ میں ۲۷ نومبر کی صبح کو دہلی سے روانہ ہوا، اور اسی دن شام کو میڈرڈ پہنچ گیا۔ اگر مشارق ومغارب میں فرق نہ ہوتا اور دونوں ملکوں کی گھڑی ایک ہی ہوتی تو ۲۷ نومبر کو روانہ ہونے کے بعد جب میں یہاں پہنچتا اس وقت کلنڈر میں ۲۸ نومبر کی تاریخ شروع ہو چکی ہوتی۔

۲۷ نومبر کی شام کو جب میں کمپیوٹر کارڈ کے ذریعہ تالا کھول کر اپنے کمرہ میں داخل ہوا تو پہلی نظر میں کمرہ بہت شاندار نظر آیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ میڈرڈ کا ایک ممتاز ہوٹل ہے۔ لیکن اگلے ہی دن میری نظر میں اس کی جاذبیت ختم ہو چکی تھی۔ حتی کہ یہاں ٹھہرنے کا شوق کرنے کے بجائے اب میں واپسی کے دن گننے لگا۔ یہی دنیا کی تمام بظاہر عمدہ چیزوں کا حال ہے۔ دنیا کی ہر چیز ملنے کے پہلے دن اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگلے ہی دن وہ ایک معمولی چیز دکھائی دینے لگتی ہے۔ دور سے دیکھنے والے جس زندگی کو عیش کی زندگی سمجھتے ہیں وہ خود صاحب عیش کے لیے صرف بورڈم کے ہم معنی ہوتی ہے۔ یہ صرف جنّت کی خصوصیت ہے کہ اس کی جاذبیت کبھی ختم نہ ہوگی۔ بلکہ ہر دن اس کی لذت بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ دنیا میں اللہ تعالےٰ نے عمل میں لذت رکھ دی ہے اور آخرت میں عمل کے انجام میں۔

شیخ اسحاق ادریس سکوتہ کا تعلق سوڈان سے ہے۔ صبح کے ناشتہ پر ملاقات ہوئی تو ان سے میں نے مہدی سوڈانی (۱۸۸۵ - ۱۸۴۴ء) کے بارہ میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ وہ مجھے کچھ زیادہ سمجھدار آدمی معلوم نہیں ہوتے۔ خود یہ بھی ایک کم عقلی کی بات ہے کہ کوئی آدمی مہدی ہونے کا دعویٰ کرے۔ مگر عوام کی ایک بھیڑ ان کے گرد اکٹھا ہوگئی۔ انھوں نے ایسے اقدام کیے جن کو صرف ناپختہ اقدام ہی کہا جا سکتا ہے۔ شیخ سکوتہ نے جواب دیا : کان یری رسول اللہ کثیراً۔ ولکن مشیئۃ اللہ فوق ذلک۔ یعنی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں بہت زیادہ دیکھتے تھے۔ مگر اللہ کی مشیئت اس سے اوپر ہے۔

خواب میں کسی کو دیکھنا یہ ایک شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس کی بنا پر مہدویت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ اس طرح کے خواب کی بنیاد پر کوئی قومی یا اجتماعی پالیسی بنائی جا سکتی۔ قومی یا ملی پالیسی

کی بنیاد شوریٰ پر ہے۔اس طرح کے نازک معاملات میں اہل علم کے مشورہ سے جو بات طے ہوگی وہ قابل عمل ہوگی نہ کہ کسی کا یہ کہنا کہ میں نے رسول اللہ کو خواب میں دیکھا ہے۔ یہ بھی کس قدر عجیب بات ہے کہ مہدی سوڈانی پر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں تقریباً ۲۲۰ سطر کا مضمون ہے اور خلیفہ دوم عمر بن خطاب پر صرف ۹ سطر کا مضمون۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے کہ مہدویت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں، وہ کرکے دکھا جانے کی چیز ہے۔ مگر یہ بات بھی صحیح نہیں۔ مہدی کے معنی ہیں ہدایت یاب۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ کوئی بڑا سیاسی یا قومی کارنامہ کرے جس کو لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ مہدی کی اصل صرف یہ ہے کہ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی حقیقت گم ہوچکی ہوگی، وہ اسلام کی معرفت حاصل کرے گا۔ گویا مہدی اصلاً ہدایت کو پانے والا ہوگا نہ کہ ہدایت کا خارجی نظام قائم کرنے والا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی شخص کا مہدی ہونا یہ اللہ کے علم کی بات ہے، اس کا یقینی علم نہ خود مہدی کو ہوگا اور نہ اس کے معاصر لوگوں کو۔ کیوں کہ ہدایت یاب کون ہے، اس کا تعلق تمام تر علمِ الٰہی سے ہے۔

۲۹ نومبر کو دوپہر کے کھانے کی میز پر قاہرہ کے دکتور جمعہ (مصری بولی میں گمعہ) بھی موجود تھے۔ گفتگو کے دوران گائے (بقرہ) کا ذکر آگیا۔ انھوں نے فوراً سورہ البقرہ کی آیتوں کی تلاوت شروع کردی۔ سب لوگ خاموش ہوکر سننے لگے۔

مصری قاریوں کی قرأت تو مجھ کو پسند نہیں لیکن مصری علماء کی قرأت مجھ کو بہت پسند ہے۔ میں نہایت شوق کے ساتھ اس کو سنتا رہا۔ عام قاری جس طرح اشباع کے ساتھ پڑھتے ہیں وہ تو مجھے بالکل غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ صحابہ اس طرح قرآن کو پڑھتے ہوں گے۔ لیکن عرب علماء خاص طور پر حجاز کے علماء کی قرأت مجھے وجدانی طور پر صحابہ کے انداز قرأت کا تسلسل معلوم ہوتی ہے۔ اس کو سن کر تھوڑی دیر کے لیے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے زمانہ کا فاصلہ ختم ہوگیا ہے اور ہم ایک زندہ ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ صحابہ کی تلاوت قرآن کو دوبارہ سن رہے ہیں۔

ایک مجلس میں کچھ عرب حضرات تھے۔ ایک صاحب نے اسپین میں مسلم سلطنت کے آخری زمانہ کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اندلس کے آخری مسلم سلطان ابوعبداللہ نے جب الحمراء کی کنجیاں عیسائی حکمراں

کے حوالے کردیں اور وہ روتا ہوا غرناطہ سے نکلا تو اس کی ماں نے اس کی توبیخ کی اور کہا: ابك کمثل النساء ملکا ضاع لم تحافظ علیه کمثل الرجال (اس کھوئے ہوئے ملک پر عورتوں کی طرح روؤ جس کو تم مردوں کی طرح نہ بچا سکے)

میں نے کہا کہ ابو عبد اللہ کی ماں کا یہ جملہ بہت زیادہ رائج ہے مگر وہ حقیقتِ حال کی صحیح ترجمانی نہیں۔ کیوں کہ ابو عبد اللہ اور اس کی فوجیں آخری دور میں بھی نہایت بہادری کے ساتھ لڑی تھیں۔ مگر کوئی سلطان ایک فوج سے لڑ سکتا ہے وہ حقائق سے نہیں لڑ سکتا۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ خود مسلمان ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے ہوئے تھے، پھر وہ کیسے کامیاب ہوتے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ابو عبد اللہ نے نہایت بہادرانہ مقابلہ کر کے عیسائی فوج کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ مگر اس کے بعد ابو عبد اللہ کا چچا الزغل عیسائیوں کے ساتھ مل کر اس کا داخلی دشمن بن گیا۔ اس طرح فتح دوبارہ شکست میں تبدیل ہوگئی۔

تاہم الزغل کو اس بے وفائی کا کوئی معاوضہ مسیحی حکمرانوں کی طرف سے نہیں ملا۔ سلطنت غرناطہ پر اپنے قبضہ کی تکمیل کے فوراً بعد انھوں نے الزغل کو اسپین سے نکال دیا۔ وہ الجزائر میں تلمسان کے مقام پر چلا گیا اور وہاں گم نامی کی حالت میں مرگیا۔ جو آدمی اپنوں سے بے وفائی کرے اس کو یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ غیروں کی طرف سے اس کو وفاداری کا انعام دیا جائے گا۔

اسپین کی مسلم سلطنت اپنے آخری مرحلہ میں غرناطہ کے قصر الحمراء تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، اسی طرح جیسے کہ ہندستان کی مغل سلطنت اپنے آخری مرحلہ میں دہلی کے لال قلعہ تک محدود ہوگئی تھی۔ مگر آخری مسلم حکمراں ابو عبد اللہ کے فوجی سردار موسیٰ بن ابی الغازان نہایت بہادر تھا۔ اس نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ وہ اپنی موت تک بہادری کے ساتھ لڑتا رہا۔

تاہم حقیقت سے لڑنا زیادہ دیر تک ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ ابو عبد اللہ نے ۳ جنوری ۱۴۹۲ء کو عیسائی حکمراں کے ساتھ صلح کر لی اور غرناطہ کو اس کے لیے خالی کر دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی عمومی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ اس پکڑ دھکڑ میں شدت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ خلیفہ کے ہتھیار ڈالنے کے باوجود مسلمانوں نے ابھی اس کو قبول نہیں کیا تھا۔ پہاڑی علاقوں میں بار بار انھوں نے بغاوت کا جھنڈا اٹھایا۔ مگر انھیں بری طرح شکست ہوئی اور آخر کار انھوں نے اس شرط پر جنگ بندی قبول کر لی کہ وہ اسپین کو

چھوڑ کر مراکو، ترکی اور مصر چلے جائیں گے۔

تاتاری سردار ہلاکو خاں نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کی مسلم سلطنت کا خاتمہ کیا تھا۔ اسپینی بادشاہ فرڈینڈ دوم نے ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کی مسلم سلطنت کو آخری طور پر ختم کر دیا۔ ایک صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: یہ اسلام دشمنوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔

میں نے کہا کہ اگر بغداد کی عباسی سلطنت کا خاتمہ اسلام دشمنوں کی سازش کی بنا پر ہوا تو اس کے صرف پچاس سال بعد انھیں دشمنوں کا خادمانِ اسلام بن جانا کس سازش کا نتیجہ تھا۔ میں نے کہا کہ سازش کے تصور کے تحت مسلم تاریخ کی توجیہہ کرنا مسلم قوم کو مقہور اور غیر مسلم قوم کو قاہر کے مقام پر بٹھانا ہے۔ اس طرح کا تصورِ تاریخ سراسر قرآن کے خلاف ہے۔

میں نے کہا کہ امتِ محمدی کا مستقبل تمام تر دعوت کے اوپر منحصر ہے۔ مسلمانوں کے لیے مقدر ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کی ذمہ داری کو ادا کر کے اٹھیں گے اور دعوت الی اللہ سے کوتاہی کر کے گریں گے۔ بغداد اور غرناطہ کی سلطنت کے زمانہ میں مسلمانوں نے علمی اور مادی اعتبار سے غیر معمولی ترقی کی۔ مگر یہ ترقیاں ان کے لیے حفاظت کا ذریعہ نہ بن سکیں۔

تاہم خود اسی المیہ میں یہ سبق بھی موجود ہے کہ عباسی خلافت کے خاتمہ کے بعد جب مسلمانوں کے پاس سیاسی اور فوجی طاقت نہ رہی تو انھوں نے اسلام کی دعوتی طاقت کو استعمال کیا۔ اور اس کے بعد تاریخ نے دیکھا کہ جہاں بظاہر کھنڈر تھا وہاں ایک شاندار قلعہ بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ تاریخ کا یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے ایک ابدی نشانِ راہ ہے۔

ایک عرب دوست نے مجھے ایک کتاب ہدیہ میں پیش کی۔ ۱۶۰ صفحہ کی یہ کتاب ۱۹۹۲ میں مکتبہ اشبیلیہ (الریاض) سے چھپی ہے۔ اس کتاب کے مصنف عبد الرحمٰن عبد الوہاب ہیں اور اس کا نام ہے: تصفية الوجود الاسلامی۔ یعنی اسلامی وجود کا خاتمہ۔ کتاب کے ایک حصہ میں بڑے جذباتی انداز میں سقوط غرناطہ کا ذکر ہے اور اس کے بعد کہا گیا ہے:

هاهي الاندلس ضاعت واصبحت ذكرى نبكي على اطلالها ونبكي تخاذل المسلمين وتفريطهم فيها (صفحہ ۱۰)

یہ ہے وہ اندلس جو کھو گیا اور محض ایک ایسی یاد بن کر رہ گیا جس کے کھنڈروں پر ہم روتے ہیں۔ اور جس کی حفاظت کے سلسلہ میں مسلمانوں کی کوتاہی اور دستبرداری پر آنسو بہاتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اس قسم کی مرثیہ خوانی اسلامی روح کے سراسر خلاف ہے۔ اسلام امید اور اعتماد کا دین ہے۔ اسلام عسر میں یسر کا راز بتاتا ہے۔ اسلام کے لیے خدا نے حفاظت و نصرت کا ابدی وعدہ کیا ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں چاہیے کہ ہم منفی پہلو میں بھی مثبت پہلو دریافت کریں۔ خود میڈرڈ کی موجودہ کانفرنس اس بات کی ایک علامت ہے کہ اسپین کے تاریخی کھنڈروں سے دوبارہ اسلام کا ایک نیا مستقبل پیدا ہو رہا ہے۔

کانفرنس کے شرکا، کو میڈرڈ شہر کے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ لیکن کانفرنس کے اجلاس الکلا یونیورسٹی میں ہوئے جو شہر سے ۳۰ کیلومیٹر دور ہے۔ لوگ روزانہ صبح کو سواریوں کے ذریعہ یونی ورسٹی لے جائے جاتے۔ دن کے کھانے کا انتظام وہیں یونی ورسٹی کے اندر ہوتا۔ شام کا کھانا اکثر کسی اور مقام پر کسی بڑے آدمی کی طرف سے ہوتا تھا۔ اس طرح صبح کو نکلنے کے بعد دوبارہ رات کو ہوٹل میں واپسی ہوتی۔

۲۸ نومبر کو صبح نو بجے ہم سب لوگ قافلہ کی صورت میں الکلا یونی ورسٹی لے جائے گئے۔ یہ یونیورسٹی شہر سے دور ایک تاریخی ٹاون میں ہے۔ شہر اور اس کے بیرونی علاقہ کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے ہم لوگ پتھر کی بنی ہوئی ایک بہت بڑی عمارت کے سامنے اترے۔ اسی قدیم محل نما عمارت میں الکلا یونی ورسٹی قائم کی گئی ہے۔ اسی یونی ورسٹی کے زیر اہتمام یہ کانفرنس ہو رہی ہے۔ کانفرنس کے اجلاس روزانہ اسی یونی ورسٹی کے مختلف ہال میں ہوں گے۔

میڈرڈ اسپین کی راجدھانی ہے۔ جب میں میڈرڈ کے مختلف حصوں سے گزرتا تھا تو بار بار مجھے یہ خیال آتا تھا کہ یہاں کی تمام چیزیں بظاہر یورپ کے انداز پر بنائی گئی ہیں۔ مگر وہ یورپ کے زیادہ ترقی یافتہ شہروں کے معیار سے کم ہیں۔

یونی ورسٹی کے بڑے ہال میں افتتاحی اجلاس ہوا۔ بتایا گیا کہ اس کانفرنس کا مقصد تینوں مذہبوں (یہودیت، عیسائیت، اسلام) میں تعلقات کو بہتر بنانا ہے۔ اظہارِ خیال کی زبان اسپینی، انگریزی، فرانسیسی اور عربی تھی۔ ہیڈ فون کے ذریعہ ہر آدمی اپنی مطلوب زبان میں مقرر کی بات کو سن سکتا تھا۔

میڈرڈ کے میئر نے تقریر کی تو پہلے کہا ——— سلام، شولوم۔ پھر انھوں نے اپنی تقریر شروع کی۔ انھوں نے کہا کہ قدیم اسپین میں تینوں مذہب کے لوگوں نے مل کر ایک تاریخ بنائی تھی۔ اب پھر ضرورت ہے کہ تینوں مذہب کے لوگ مل کر یہاں نئی دنیا کی تعمیر کریں۔

ایک اسرائیلی مقرر نے کہا کہ اسرائیل اور عربوں کے درمیان اقتصادی تعاون (economic cooperation) ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ کسی کو بھی یہ حق نہیں ہونا چاہیے کہ وہ خدا کے نام کو ہائی جیک کرے :

No one has right to highjack the name of God.

رات کو دوبارہ ہم لوگ اپنے ہوٹل میں واپس پہنچا دیے گئے۔

۲۸ نومبر کو افتتاحی اجلاس میں میڈرڈ کے میئر کے علاوہ ایک اسپینی یہودی اور ایک اسپینی عیسائی کی تقریر ہوئی۔ اس کے بعد ایک صاحب کھڑے ہوئے جن کا نام مسٹر تمارال بتایا گیا تھا۔ ان کے چہرے پر ہلکی داڑھی تھی۔ اور بظاہر نہایت سنجیدہ معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا اور اس کے بعد اسپینی زبان میں اپنی تقریر کی۔

ان کی شخصیت کے بارہ میں مجھے تجسس تھا۔ بعد کو ملا تو پتہ چلا کہ وہ ایک اسپینی مسلمان ہیں۔ وہ تھوڑی عربی اور تھوڑی انگریزی جانتے تھے اس لیے ان سے گفتگو ممکن ہو سکی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا اصل خاندانی نام فضل اللہ ہے۔ موجودہ نام ان کے اصل عربی نام کا اسپینی ترجمہ ہے۔ انھوں نے اپنا مکمل پتہ دیا جو اس طرح ہے :

Julio Torralbo Tamaral, Psicologia Clinia Escolar
Collegiado N. 1911 CPM, Madrid
(Tel. 96-5141433)

غرناطہ کی مسلم سلطنت کے خاتمہ کے بعد جب اسپینی مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور ان کو یہاں سے نکالا جانے لگا تو بہت سے لوگوں نے اپنے نام بدل لیے۔ تاکہ وہ یہاں رہ سکیں۔ اس طرح کے بہت سے خاندان ابھی تک اسپین میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ اس لیے ایسے مسلمان اب چھپ کر نہیں رہتے۔ بلکہ وہ اعلان کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس کی ایک مثال خود فضل اللہ صاحب ہیں۔ موجودہ کانفرنس جو ایک حکومتی ادارہ کی طرف سے کی گئی تھی، اس میں ان کو اسلام کے اسپینی نمایندہ کی حیثیت سے بولنے کا موقع دیا گیا۔

کانفرنس کے موقع پر میں نے انگریزی میں ایک پیپر پیش کیا۔ اس کا عنوان تھا : امن اسلام میں (Peace in Islam) اس کو ان شاء اللہ الرسالہ انگریزی میں شائع کر دیا جائے گا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ اسلام امن کا مذہب

ہے۔ اسلام کی تمام تعلیمات امن کے تصور پر مبنی ہیں۔ اسلام میں جنگ صرف ناگزیر دفاع کے لیے جائز ہے، کسی اور مقصد کے لیے اسلام میں جنگ کی اجازت نہیں۔

اس پیپر کے علاوہ مختلف مواقع پر میں نے اسلام کے امن اور رحمت اور انسانیت کے تصور کی وضاحت کی۔ اس کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ میڈرڈ کے اسپینی اخبار الکلا (Diario De Alcala) کا شمارہ ۲۹ نومبر ۱۹۹۴ کانفرنس نمبر کے طور پر شائع کیا گیا تھا۔ اس نے نمایاں انداز میں صفحہ اول پر میری تنہا تصویر شائع کی۔ اخبار کا یہ شمارہ مجھے یروشلم کے آوی شاکیت (Avi Shoket) نے لاکر دیا تھا۔ یہ اور اس سلسلہ کے بعض دوسرے اسپینی اخبار اسلامی مرکز کے دفتر میں بطور ریکارڈ موجود ہیں۔

۲۹ نومبر کو میں نے اپنا جو پیپر پیش کیا تھا۔ اس کے ساتھ لوگوں نے نہایت دل چسپی کا اظہار کیا۔ کچھ لوگوں نے مجھ سے اس کی کاپیاں مانگیں۔ ایک خاتون ورکر نے مجھ سے میرا نسخہ لیا اور یونی ورسٹی کے دفتر میں جاکر اس کی کئی فوٹو کاپی نکلوائی اور لوگوں کے درمیان تقسیم کردی۔

۲۸ نومبر کی شام کو اجلاس کی کارروائی ختم ہونے کے بعد تمام شرکا یونی ورسٹی سے واپس ہوکر اپنے ہوٹل کے کمروں میں آگئے۔ اس کے بعد ۹ بجے رات کو دوبارہ کھانے کے لیے روانگی ہوئی۔ اس کا انتظام اسپین کے ایک وزیر کی طرف سے ایک خصوصی گارڈن میں کیا گیا تھا۔ یہاں مختلف لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔

کھانے سے فراغت کے بعد واپسی ہوئی تو گاڑی میں ایک صاحب کا ساتھ ہوگیا۔ انھوں نے اپنا نام خواکین لومبا بتایا۔ وہ سرقسطہ (اسپین) کی یونی ورسٹی میں مسلم فلاسفی کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ مشہور مسلم فلسفی ابن باجہ کے ہم وطن ہیں اور انھوں نے ابن باجہ پر ریسرچ کرکے ایک کتاب شائع کی ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے شعبہ میں کتنے طالب علم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ تقریباً دو سو طلبہ ہیں۔ انھوں نے اپنا نام عربی میں لکھ کر مجھے دیا۔ ان کا پورا نام اور پتہ یہ ہے :

Joaqvin Lomba, Professor of Muslim Philosophy
University of Zaragoza
50005-Zaragoza, Spain.

خواکین لومبا ابن باجہ کی بہت تعریف کرتے رہے۔ ابن باجہ (Avempace) اسپین کے شہر سرقسطہ (Zaragoza) میں ۱۰۹۵ء میں پیدا ہوا، اور مراکو کے شہر فاس میں ۱۱۳۹ء میں اس کی وفات

ہوئی، وہ ابن طفیل اور ابن رشد کی طرح ایک عظیم فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ کچھ لوگ اس کو ملحد قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر خواکین لوما اسی شہر سرقسطہ میں پیدا ہوئے۔

پروفیسر خواکین لوما عربی بھی جانتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال نے لکھا ہے کہ بارھویں صدی کے بعد اسلامی فلسفہ کی ترقی رک گئی۔ اس کے بعد کوئی بڑا مسلم فلسفی پیدا نہیں ہوا۔ اس کا سبب آخر کیا ہے۔

میں نے کہا کہ جہاں تک میرا خیال ہے، یہ دور میں تبدیلی کا معاملہ ہے۔ قدیم معنی میں جس چیز کو اسلامی فلسفہ کہا جاتا ہے، اس کی تشکیل اس زمانہ میں ہوئی جب کہ دنیا میں یونان کی قیاسی منطق کا غلبہ تھا۔ مسلم فلسفیوں نے اس میں مہارت پیدا کی اور اس کی بنیاد پر اپنا فلسفہ مرتب کیا۔ مگر سائنسی انقلاب کے بعد یہ منطق ختم ہوگئی۔ اب سائنسی منطق کا دور آگیا۔ مگر مسلم ذہن سائنسی منطق میں مہارت نہ پیدا کرسکے، اس لیے وہ جدید علم کی بنیاد پر اسلامی فلسفہ (جدید علم کلام) بھی تشکیل نہ دے سکے۔

میں نے کہا کہ دور اول میں جب مسلمانوں کا مقابلہ یونانی منطق سے پیش آیا تو وہ فاتح کی نفسیات میں جی رہے تھے۔ انھوں نے بڑھ کر یونانی منطق کو سیکھا اور اس میں مہارت حاصل کی۔ اس طرح وہ اس قابل ہوگئے کہ یونانی منطق کو اسلامائز کریں اور اس کی بنیاد پر ایک طاقت ور علم کلام پیدا کرسکیں۔

مگر موجودہ دور میں جب سائنسی منطق کا زمانہ آیا تو مسلمان دوسری قوموں کے مقابلہ میں مفتوح اور مغلوب بن چکے تھے۔ چنانچہ ان میں اقدام کے بجائے تحفظ کا مزاج پیدا ہوگیا تھا۔ اس شکست خوردہ نفسیات کی بنا پر مسلم دانشور نئے علوم کو شک کی نظر سے دیکھتے رہے، وہ آگے بڑھ کر ان سے واقف ہونے اور ان کو استعمال کرنے کا حوصلہ نہ کرسکے۔

ایک مسلم اسکالر نے کہا کہ مسلم دور میں قرطبہ کی لائبریری میں چار لاکھ (400,000) کتابیں تھیں۔ جب کہ اس وقت سارے یورپ کی تمام لائبریریوں میں بھی اتنی کتابیں موجود نہیں تھیں۔

میں نے کہا کہ اس قسم کی باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ باتیں صرف جھوٹا فخر پیدا کرتی ہے۔ آج ضرورت یہ ہے کہ مسلمان وقت کو سمجھیں اور اپنے پچھڑے پن کو دور کرنے کے لیے محنت کریں۔ ہمیں ماضی کے علمی کارناموں پر فخر کرنے کے بجائے یہ کرنا چاہیے کہ ہم محنت کرکے آج کے علم انسانی

میں اضافہ کریں۔

اسرائیل سے بہت سے یہودی نیز عیسائی افراد یہاں آئے تھے۔ ان لوگوں سے میں معلوماتی انداز کی گفتگو کرتا رہا۔ ان میں ایک آوی شاکیت (Avi Shoket) تھے۔ ان کا تعلق فارین افیرس سے ہے۔ ان سے فلسطین کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ جب میں ان سے فلسطینیوں کے حق میں اپنے دلائل دے رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ہر دلیل کے جواب میں ایک متوازی دلیل ان کے پاس موجود ہے۔ میں نے سوچا کہ جب دونوں فریق یکساں طور پر اپنے آپ کو برحق سمجھ رہے ہوں تو آخر یہ مسئلہ کیوں کر حل ہو سکتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ یاسر عرفات اور حکومت اسرائیل کے درمیان حال میں جو معاہدۂ امن ہوا ہے اس کے بارہ میں اسرائیل کی اکثریت کی سوچ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں کی اکثریت خوف (fear) میں مبتلا ہے۔

انھوں نے کہا کہ ہم فلسطینیوں کو خاموش مدد پہنچا رہے ہیں۔ ہم نے مختلف حکومتوں کو ابھارا ہے کہ وہ فلسطینیوں کو مالی مدد دیں۔ حتیٰ کہ ہم بالواسطہ ذرائع سے کام لے کر خود بھی فلسطینیوں کو مالی مدد دے رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایسا ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ فلسطینی جب تک معاشی اعتبار سے مطمئن نہ ہوں، اس علاقہ میں امن کا قیام ممکن نہیں ہو گا۔

نادان آدمی اپنے حریف کو مار کر اسے ختم کرنا چاہتا ہے۔ دانش مند آدمی اپنے حریف کو خاموش کر کے اس کے اوپر فتح حاصل کر لیتا ہے۔

آوی شاکیت اسرائیلی حکومت میں اعلیٰ افسر ہیں۔ وہ شستہ انگریزی بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اسرائیل عالمی برادری میں تنہائی (isolation) میں پڑ گیا تھا۔ اس تنہائی کا پہلا فائدہ ہم نے یہ اٹھایا کہ ہم یکسو ہو کر اپنی داخلی ترقی میں لگ گئے۔ مثلاً ہم نے اپنی بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے پر اپنی توجہ لگا دی۔ اس خاموش جدوجہد کے نتیجہ میں ہم نے جو ترقی کی اس نے اب ہم کو اس پوزیشن تک پہنچا دیا ہے کہ ہم دنیا کی قوموں سے تعاون کر کے انھیں بہت کچھ دے سکیں۔

بنجر زمین کو کار آمد بنانے کے لیے ہمارے جو تجربات ہیں ان کی بنیاد پر ہمارے یہاں ایک مستقل شعبہ (Arid Zone Institute) قائم ہے۔ اس شعبہ کے تحت ہم مختلف ملکوں کو اپنا تعاون دے رہے ہیں۔ انھیں ملکوں میں سے ایک آپ کا ملک انڈیا بھی ہے۔ انڈیا میں گجرات اور راجستھان میں ہمارے

تعاون کے تحت کئی پروجکٹ چل رہے ہیں۔

یہاں یہودی اہل علم بڑی تعداد میں آئے ہیں۔ ان سے گفتگو کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ ان کی فکری سطح عام لوگوں سے اونچی ہے۔ یہی احساس مجھے ان کے بارہ میں پہلے بھی کئی بار ہوا ہے۔ شیخ ادریس سکوتہ سے میں نے کہا کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودی زیادہ ذکی ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے تجربہ میں ایسا ہی پایا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک امت کی مانند رہتے ہیں۔ ان کا ایک آدمی دوسرے کے لیے اضافہ علم کا سبب بنتا ہے (لانهم امة واحدة، يعلّم بعضهم بعضا)

یہ ایک فطری حقیقت ہے جو حدیث میں ان الفاظ میں بتائی گئی ہے: المومن كثير باخيه۔ یعنی مومن اپنے بھائی کے ساتھ مل کر کثیر ہو جاتا ہے۔ جس انسانی گروہ میں اجتماعی اوصاف نہ پائے جائیں، ان میں کا ہر شخص تنہا ہو جائے گا۔ اور جس انسانی گروہ میں اجتماعی اوصاف موجود ہوں، اس کا ہر فرد دوسروں کے لیے طاقت بنے گا اور خود دوسروں سے طاقت لیتا رہے گا۔

اسرائیل سے آئے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ اس وقت کئی مسلم ملکوں میں عورت حکمراں ہے —— ترکی، بنگلہ دیش اور پاکستان۔ روایتی اسلام میں تو عورت کی حکمرانی جائز نہیں۔ پھر یہ نیا ظاہرہ کیا اسلام میں ریفارمیشن کی علامت ہے۔

میں نے کہا کہ اس کا جواب دینے سے پہلے میں آپ سے ایک سوال کروں گا۔ آپ کے یہاں مسز گولڈا میر حکومت کے اعلیٰ عہدہ تک پہنچیں۔ ان کے دور حکومت کے بارہ میں آپ کا تجربہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ بہت جذباتی تھیں۔ اگر وہ حقیقت پسند ہوتیں تو فلسطینیوں سے آج امن کا جو معاہدہ ہوا ہے وہ گولڈا میر کے زمانہ میں ہی ہو گیا ہوتا، جب کہ انور سادات زندہ تھے۔ اس طرح ہم بہت سے جانی اور مالی نقصان سے بچ جاتے۔

میں نے کہا کہ خود آپ کے تجربہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کو سیاسی حکمراں بنانا مفید نہیں۔ گویا کہ صحیح فطری اصول یہی ہے کہ عورت کو اقتدار اعلیٰ کے مقام پر نہ بٹھایا جائے۔ پھر جب یہ ایک صحیح فطری اصول ہے تو اس میں تبدیلی یا ریفارم کی کیا ضرورت ہے۔ اور جہاں تک بعض ملکوں میں عورت کو حکمراں بنانے کا سوال ہے تو یہ اتفاقی نوعیت کے بعض سیاسی اسباب کی وجہ سے

ہے نہ کہ اسلام میں کسی ریفارمیشن کی تحریک کی وجہ سے۔

اسپین کی کانفرنس میں جو یہودی علماء آئے تھے ان میں سے بعض کو میں نے دیکھا کہ وہ پرجوش طور پر اسپین کی ماضی کی ترقیوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس کا راز مجھے کسی قدر بعد کو سمجھ میں آیا۔ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ماضی میں اسپین کی ترقیوں کو یہودی تاریخ کے خانہ میں درج کر دیں۔

ان کا کہنا ہے کہ اُس زمانہ میں سیاسی اقتدار اگرچہ مسلمانوں کے پاس تھا۔ مگر ترقیاتی کام زیادہ تر یہودی افراد نے انجام دیا۔ یہ یہودی اس زمانہ میں ایڈوائزر، اکسپرٹ اور ماہرین فن کی صورت میں کام کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر ابن میمون (Maimonide) اور ابن جیبرول (Gabriel) وغیرہ۔ اس لیے یہ تاریخ اگر سیاسی اعتبار سے عرب تاریخ کا حصہ ہے تو عین اسی وقت وہ علمی اعتبار سے یہودی تاریخ کا حصہ ہے۔

اس معاملہ میں وہ اس حد تک گئے ہیں کہ ابن رشد کو بھی وہ یہودی عالم بتاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلم سلطان منصور اسی لیے ابن رشد سے ناراض ہو گیا تھا اور اس کو قرطبہ سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد ابن رشد جا کر اسپین کے ایک گاؤں الیسانہ میں رہنے لگا جہاں کی آبادی میں بیشتر تعداد یہودیوں کی تھی۔ اس لیے ابن رشد یہودی تھا (فھو اِذن یھودی) چنانچہ یروشلم کی ہیبرو یونی ورسٹی میں مطالعاتِ رشدی کے نام سے ایک مستقل مرکز قائم کیا گیا ہے۔ اس مرکز کے تحت ابن رشد کی کتابیں عبرانی اور انگریزی زبان میں شائع کی جا رہی ہیں۔

میں نے کہا کہ اسپین کے ترقیاتی عمل میں خواہ کچھ یہودی افراد شریک ہوں۔ مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ ترقیاتی عمل اسلام کے فکری انقلاب کے تحت وجود میں آیا۔ اسلام نے اس دور کے توہماتی ذہن کو اگر نہ توڑا ہوتا تو سرے سے کوئی ترقیاتی عمل ہی ظہور میں نہ آتا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد اسپین میں بہت سے اہل علم اٹھے جنھوں نے زور و شور کے ساتھ یہ بات کہی کہ مسلم عہد کے اسپین کو نظر انداز کر کے ہم نے خود اپنا بہت بڑا نقصان کیا ہے۔ یہ عہد پوری اسپینی تاریخ کا سب سے زیادہ شاندار عہد تھا۔ مزید یہ کہ اسپین کی یہی وہ علمی ترقیاں تھیں جنھوں نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بنیاد فراہم کی۔ اس تاریخ کو لینے کی صورت میں ہم جدید تہذیب کے معمار قرار پاتے ہیں۔ اور اس تاریخ کو چھوڑ دینے کی صورت میں ہمارے پاس کوئی چیز نہیں رہتی جس کو ہم

فخر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس قسم کے اسپینی اہل علم کی فہرست بہت لمبی ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر گا ئینگوس، ڈاکٹر امریکو کاسترو، ڈاکٹر بدرو مارتینیز مونتابث وغیرہ۔

اسپین کے لوگوں کی اس کوشش کو عرب دانش وروں نے اسبنة التاريخ الاسلامي في الاندلس کا نام دیا ہے۔ یعنی اندلس کی اسلامی تاریخ کو اسپینی بنانا۔ مگر خود اسپینی اس کو اپنے بھولے ہوئے ماضی کی طرف واپسی قرار دیتے ہیں۔

۲۸ نومبر کی صبح کو میں ہوٹل میں ناشتہ کی میز پر تھا۔ اچانک کسی نے میرے اوپر اپنا ہاتھ رکھا۔ پیچھے مڑکر دیکھا تو شیخ اسحاق ادریس سکوتہ (۷۰ سال) تھے۔ وہ ایک سوڈانی عالم ہیں اور آج کل رابطۂ عالم اسلامی کے تحت مکہ میں مقیم ہیں۔ ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

میں نے پوچھا کہ شیخ حسن البنا تو ابتدا میں ایک مذہبی واعظ تھے اور اس اعتبار سے وہ ایک اچھا کام کر رہے تھے۔ پھر وہ غیر ضروری طور پر سیاست اور انتخابات میں کیوں کو د پڑے۔ آخر انھوں نے اس بات کو کیوں نہیں جانا کہ سیاست میں داخل ہو کر وہ صرف بگاڑ میں اضافہ کریں گے، حالات کے اعتبار سے یہ ناممکن ہے کہ اس طرح وہ ملک میں کوئی مثبت سیاسی نتیجہ پیدا کر سکیں۔

شیخ سکوتہ نے جواب دیا کہ وہ ایک صوفی آدمی تھے۔ وہ سیاست نہیں جانتے تھے۔ مگر ان کے وعظوں اور تقریروں سے جب مسلمانوں کی بھیڑ ان کے گرد اکٹھا ہونے لگی تو کچھ لوگوں نے انھیں استعمال کیا (كان الشيخ حسن البنا رحمه الله ليس عارفا للسياسة بل كان رجلا صوفيا، استعمله الذين أرادوا الحكم من خلاله)

انھوں نے مزید کہا کہ سلفی رجحان رکھنے والے نوجوان یہ چاہتے تھے کہ اپنے انتہا پسندانہ خیالات کی تائید کے لیے وقت کی کسی مشہور و مقبول شخصیت کو اپنے نمایندہ یا ترجمان کے طور پر پیش کریں۔ اس کے لیے وہ محمد عبدہ اور رشید رضا وغیرہ کو استعمال کرنے میں ناکام رہے۔ یہاں تک کہ حسن البنا ظاہر ہوئے جو بیک وقت اہل سنت والجماعت سے بھی تعلق رکھتے تھے اور اسی کے ساتھ متصوفانہ حلقوں سے بھی ان کے گہرے روابط تھے۔ چنانچہ انتہا پسند نوجوانوں کے مذکورہ طبقہ نے ان کی طرف توجہ کی اور وہ ان کو استعمال کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

کچھ عرب حضرات کی ایک مجلس میں یہ ذکر تھا کہ مسلمان ساری دنیا میں غیر مسلموں کے عدوان کا شکار کیوں

ہیں۔ ان لوگوں کی رائے یہ تھی کہ اسپین میں مسلم اقتدار کے خاتمہ سے لے کر اب تک جتنے مصائب پیش آرہے ہیں وہ سب اعداء اسلام کی عالمی سازشوں (موامرات) کا نتیجہ ہیں۔ اعداء اسلام متحد ہو کر اسلام اور مسلمانوں کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں، صدیوں سے پیش آنے والے تمام الم ناک واقعات اسی سازش کے مختلف مظاہر ہیں۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں کے پاس ان مخالفانہ واقعات کی توجیہہ کے لیے ایک ہی لفظ ہے، اور وہ موامرات اعداء ہے۔ مگر یہ توجیہہ کتاب اللہ کی نفی کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں بار بار مختلف الفاظ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ اہل اسلام کا ولی و کارساز ہے۔ دنیا میں ان کے معاملہ کو خدا نے اتنا زیادہ مستحکم کر دیا ہے کہ اب انھیں انسانوں سے نہیں ڈرنا ہے بلکہ صرف خدا سے ڈرنا ہے۔ مگر آپ لوگ اور مسلم دنیا کے دوسرے علماء جو کچھ کہہ رہے ہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاملاتِ دنیا کی باگ ڈور تمام تر صرف اعداء اسلام کے ہاتھ میں ہے، اور خدا کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ تاریخ کا یہ تصور سراسر اسلام کے خلاف ہے۔

میں نے کہا کہ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں انسان ایک دوسرے کے عدو (دشمن) رہیں گے۔ یہاں عداوت سے مراد تحدی ہے۔ یعنی انسان ایک دوسرے کے لیے چیلنج بنیں گے۔ تحدیات (چیلنج) کے زینوں کو طے کرتی ہوئی انسانی تاریخ اپنا ترقی کا سفر کرے گی۔ دنیا میں ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کو آپ فطرت کے اسی قانون کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

میں نے کہا کہ مخالفانہ واقعات کے وجود سے مجھے انکار نہیں۔ مگر آپ کو چاہیے کہ ان واقعات کی توجیہہ آپ موامرات کے تصور سے نہ کریں بلکہ تحدیات کے تصور سے کریں۔ یہ تحدیات کسی مفروضہ دشمنِ اسلام کی گھڑی ہوئی نہیں ہیں بلکہ خود خالق کائنات کا مقرر کردہ نظام ہی ہے۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ہم ان تحدیات کا سامنا کریں۔ فریاد اور احتجاج سے ہمیں کوئی فائدہ ملنے والا نہیں۔

۲۸ نومبر کی شام کو کھانے کی میز پر ایک اسپینی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ برشلونہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے :

Migule De Quadras Sans
Ronda General Thitre, 165-6
08022 Barcelona, Spain. (Tel. 34-3-4174160)

انھوں نے بتایا کہ انھوں نے ہندستان کے مختلف شہروں کا سفر کیا ہے۔ انھوں نے ہندو سادھوؤں اور سنتوں اور ہندوؤں کی مذہبی تنظیموں کا ذکر اتنی تفصیل کے ساتھ کیا کہ میں سمجھا کہ شاید وہ ہندو یا بدھسٹ ہیں۔ مگر پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک عیسائی ہیں۔ البتہ ہندو فلسفہ سے انھیں دل چسپی ہے۔ اسی سلسلہ میں وہ ہندستان بھی گئے۔

اسی میز پر ایک اور شخص بالکل عربوں کی طرح عربی زبان بول رہے تھے۔ میں سمجھا کہ وہ کوئی مسلمان ہیں۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ وہ عیسائی تھے۔ اس طرح کے ہزاروں عیسائی مختلف مذاہب کے قریبی مطالعہ کے لیے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ ہر مذہب کی زبان سیکھتے ہیں۔ وہ ہر ایک کے مذہبی پیشواؤں کے ساتھ رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں ایسے بھی ہیں جو کلچرل طور پر ان سے مماثلت اختیار کر لیتے ہیں۔

مسلمانوں میں ایسی لگن والے لوگ نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کا مذہب ان کے لیے دنیوی انٹرسٹ بن چکا ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہی چیز آخرت کے انٹرسٹ کی خاطر ہو سکتی تھی۔ مگر آخرت کے انٹرسٹ میں لوگوں کے لیے اتنی کشش نہیں کہ وہ اس درجہ لگن کے ساتھ اس کے لیے کام کر سکیں۔

ایک عرب عالم نے اپنی تقریر میں شام و فلسطین کے تاریخی مقامات کا ذکر کیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا: ھذہ الاماکن ملیئۃ بالرموز المقدسۃ۔ عام اُردو داں اس جملہ کو سنے تو شاید وہ سمجھے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مقدس مقامات اسرار سے بھرے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ مقامات مقدس نشانیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ رمز (جمع رموز) کا لفظ عربی میں علامت یا نشانی کے لیے ہے۔ مگر اُردو میں اس کو راز کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ ایک ہی لفظ عربی میں کچھ معنی میں ہے اور اردو میں کچھ معنی میں۔ زبانوں میں اس طرح کی توسیع عام ہے۔ ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں کبھی سابق مفہوم ہی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی بدلے ہوئے مفہوم میں۔

ایک مسیحی مقرر نے کہا کہ ہمارے اندر سلف کرٹسزم کی جرأت ہونی چاہیے۔ لوگ سلف کرٹسزم سے اس لیے گھبراتے ہیں کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ہم اپنی نفی کرنے لگیں گے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے ہم کو غیر یہودی اور غیر اسلامی اور غیر مسیحی بننا پڑے گا۔ تب صحیح ڈائیلاگ ہوگا:

If you want to start real dialogue, first you have to dejudise yourself, de Islamise yourself, de Chrischianise yourself.

میں نے کہا کہ کرٹسزم تو ٹھیک ہے۔ مگر ریل ڈائیلاگ کی یہ شرط صحیح نہیں کہ ہر آدمی پہلے اپنی حیثیت کا خاتمہ کرے۔ اس کی صحیح شرط یہ ہے کہ آدمی کے اندر سائنٹفک ذوق ہو۔ وہ کھلے ذہن کے ساتھ ایک دوسرے کی بات کو سنے اور تعصب کے بجائے دلائل کی بنیاد پر اپنے رویہ کا فیصلہ کرے۔

اس کانفرنس میں بہت سے عرب شریک ہوئے۔ ان میں سے ایک، نومولود حکومت فلسطین کے سفیر نبیل معروف بھی تھے۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ آپ کا مسئلہ پوری امت کا مسئلہ ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم امت کی طرف سے مدد کے منتظر ہیں (نحن منتظر والغیث من الامۃ) میں نے ان کا پتہ لکھتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ اپنی حکومت کو دولتِ فلسطینیہ کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں، ہم اس وقت اسی کے راستہ میں ہیں (نحن علی الطریق)

وہ یہاں کی تقریروں سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ اس یہودی عالم کی تقریر سے بھی خوش نہیں تھے جس نے کہا تھا کہ عرب اور اسرائیل کے درمیان اقتصادی تعاون (economic cooperation) کا بہت وسیع میدان ہے اور دونوں کو سیاسی ٹکراؤ کو چھوڑ کر اقتصادی ترقی کے مواقع کو استعمال کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔

اجلاس کے ختم پر ہم لوگ باہر نکلے تو ایک آدمی شیخ ادریس سکوتہ سے بہت تپاک کے ساتھ ملا۔ دونوں بہت زیادہ بے تکلفی سے عربی میں بات کرنے لگے۔ میں سمجھا کہ وہ کوئی عرب مسلمان ہیں۔ اتنے میں ایک اخبار کا رپورٹر آگیا۔ اس نے ہم تینوں کا تعارف جاننا چاہا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ وہ صاحب اسرائیل کے ایک یہودی تھے۔

یہاں یہودی بڑی تعداد میں آئے تھے۔ یہودی آج کل بڑے پیمانہ پر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ یہودیوں اور مسلمانوں کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ دونوں اپنے ملے ہوئے پر مطمئن ہو کر باہم اچھے تعلقات قائم کرلیں۔ مگر مجھ کو یہاں آئے ہوئے مسلمانوں میں سے کوئی بھی نہیں ملا جو دل سے اس نظریہ کا حامی ہو۔

دکتورہ بنت الشاطیٔ مصر کی مشہور خاتون ادیب ہیں۔ وہ بھی اس کانفرنس میں آئی تھیں میں نے دیکھا کہ وہ سراپا احتجاج بنی ہوئی ہیں۔ ایک موقع پر انھوں نے پرجوش انداز میں کہا کہ یہ ڈائیلاگ نہیں ہے، یہ سب کلنٹن کے اشارہ پر ہو رہا ہے۔ امریکہ نے ہم لوگوں کو مفلس بنا دیا ہے۔ انھوں نے اس پر بھی احتجاج کیا کہ تقریریں زیادہ ہو رہی ہیں مگر مناقشہ کا وقت کم دیا جا رہا ہے (تم جلسۃ بعد جلسۃ بدون مناقشۃ، ما ھذا)

وہ کبھی عربی میں بولتی تھیں اور کبھی انگریزی میں۔ ایک بار انھوں نے امریکہ کے خلاف جذباتی انداز میں بولتے ہوئے کہا کہ ہم غلام ہیں، ہم امریکہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے :

We are slave, we can't live without America.

میں نے کہا کہ خاتون محترم، اگر صورت حال بالفرض وہی ہے جو آپ بتاتی ہیں تب بھی یہاں لفظی احتجاج کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں اپنی کمیوں کو دور کرنا ہے، اس کے بعد ہی ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم دوسری قوموں کی زیادتی سے محفوظ رہ سکیں۔

مسلمانوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ اسلام میں جن باتوں کی تعلیم دی گئی ہے ان میں سے ایک تعلیم وہ ہے جس کو توبہ کہا جاتا ہے۔ یعنی غلطی کرنے کے بعد دوبارہ درست طریقہ کی طرف واپس آنا۔ یہ توبہ اسلامی زندگی کے لیے نہایت اہم ہے۔ جس آدمی کے اندر توبہ کا مزاج نہ ہو وہ کبھی ایمان و اسلام میں ترقی نہیں کر سکتا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاح کا معاملہ توبہ کے ساتھ بندھا ہوا ہے (القصص ۶۷) توبہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ جو آدمی غلطی کرنے کے بعد سچی توبہ کرے اور اس کی شرطوں کو پورا کرے تو اس نے توبہ سے پہلے جو برائی کی تھی اس کو بھی بھلائی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے (الفرقان ۷۰)

میں نے کہا کہ مسلمان توبہ کے اس حکم کو چھوٹے چھوٹے معاملات میں تو جانتے ہیں مگر وہ بڑے بڑے معاملات میں اس کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان ساری دنیا میں جس سب سے بڑی غلطی میں مبتلا ہیں وہ دوسری قوموں سے ٹکراؤ کی پالیسی ہے۔ یہ ٹکراؤ اللہ کی نظر میں جرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ٹکراؤ سے یک طرفہ طور پر صرف مسلمانوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ کسی بھی قسم کا کوئی فائدہ اس ٹکراؤ سے مسلمانوں کو نہیں ملا۔

غیر مسلم قومیں مسلمانوں کے لیے مدعو قوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان قوموں کے سلسلہ میں مسلمانوں کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ انھیں خدا کی تعلیمات سے باخبر کیا جائے۔ ہر قسم کے بہترین ذرائع کو استعمال کر کے ان لوگوں تک دین حق کا پیغام پہنچایا جائے۔ پیغام رسانی کے اس عمل کو معتدل انداز میں جاری رکھنے کے لیے یہ بھی مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ ان قوموں کی زیادتی کو برداشت کریں، وہ ان کی اشتعال انگیزی کے باوجود ان کے خیر خواہ بنے رہیں۔

مگر مسلم لیڈروں نے غیر مسلم قوموں کی بعض زیادتیوں پر بے برداشت ہو کر ان کے خلاف ٹکراؤ شروع کر رکھا ہے۔ اس ٹکراؤ کو وہ بطور خود جہاد سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ جہاد نہیں ہے بلکہ سرکشی ہے۔ مسلم لیڈروں کو اس سرکشی سے توبہ کرنا ہے۔ انھیں ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر نرمی اور محبت کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ یہ توبہ ہے اور وہ مسلم لیڈروں کے اوپر فرض کے درجہ میں ضروری ہے۔ اگر انھوں نے یہ توبہ نہ کی اور مدعو قوموں سے موجودہ ٹکراؤ کی پالیسی کو انھوں نے جاری رکھا تو یقینی طور پر وہ خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق بن کر رہ جائیں گے۔ اور ذلت اور ناکامی کے سوا کچھ بھی انھیں حاصل نہ ہوگا۔

حسب معمول ۲۹ نومبر کی صبح کو تمام لوگ گاڑیوں کے ذریعہ ہوٹل سے یونی ورسٹی لے جائے گئے۔ راستہ میں مختلف قسم کے اسپینی مناظر سامنے آتے رہے۔ یہ علاقہ پہلے مسلم اسپین میں شامل تھا جس کو اب ایبریا (Iberia) کہا جاتا ہے۔

یونی ورسٹی میں ایک صاحب پر تپاک طور پر ملے۔ انھوں نے کہا السلام علیکم۔ وہ عربی زبان میں بول رہے تھے۔ انھوں نے اپنا نام فادر چیری بیکر بتایا۔ ان کے چہرہ پر مسلمانوں جیسی سفید داڑھی تھی۔ وہ فرانس میں پیدا ہوئے۔ عرصہ سے وہ الجیریا میں مشنری کے طور پر کام کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ الجزائر کے مستقبل کے بارہ میں آپ کا اندازہ کیا ہے۔ انھوں نے انگریزی میں جواب دیا کہ امن ابھی قریب نظر نہیں آتا:

Peace is not very near.

ایک یہودی جن کا نام موریس رومانی بتایا گیا تھا۔ انھوں نے صبح کے اجلاس میں بولتے ہوئے کہا کہ اسپین کی قدیم تاریخ مسلم۔ کرسچین۔ یہودی کے کوآرڈی نیشن کی شاندار مثال ہے۔ اسی کوآرڈی نیشن نے اسپین کا گولڈن ایج پیدا کیا تھا۔ اس زمانہ میں عربی زبان کا عام رواج تھا۔ اس زمانہ میں کرسچین، یہودی اور مسلمان آزادانہ طور پر آپس میں عربی میں بات کرتے تھے۔ اب ہم کو دوبارہ اسی کوآرڈی نیشن کی ضرورت ہے۔

۲۹ نومبر کی شام کو آخری اجلاس تھا۔ اس میں اسپین کے کنگ اور کوئن دونوں شریک ہوئے۔ ہال کے اندر دونوں بالکل سادہ انداز میں داخل ہوئے۔ دونوں معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اسٹیج پر ان کے لیے کوئی خصوصی کرسی بھی نہیں رکھی گئی۔ میری نشست ان کے بہت قریب تھی، اس لیے

میں دونوں کو صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ دونوں اتنے زیادہ سادہ اور متواضع معلوم ہو رہے تھے کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس ملک کے بادشاہ ہیں۔

کنگ نے اپنی اسپینی تقریر میں خصوصیت کے ساتھ ٹالرنس کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس ملک میں یہودی آئے۔ عیسائی آئے۔ مسلمان آئے۔ سب مل جل کر ٹالرنس کے ساتھ یہاں رہے، سب نے ملک کی ترقی میں حصہ لیا۔ یہی ماحول ہم کو نئے اسپین میں بنانا ہے۔ یہی ہمارے لیے ترقی کا واحد راستہ ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ہمارے ملک میں ہر مذہب کو یکساں درجہ دیا گیا ہے۔ ہر مذہب کو اپنے اپنے دائرہ میں پوری آزادی حاصل ہے۔

شاہ اسپین کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس ملک کی جدید تاریخ میں افغانستان جیسے مسلم ملکوں کے لیے ایک بڑی سبق آموز مثال ہے۔ جنرل فرینکو (Francisco Franco) نے فوجی بغاوت کر کے یہاں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ۱۹۳۶ میں اسپین کے مطلق حکمراں بن گئے۔ لیکن بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر ۱۹۷۳ میں انھوں نے وزیر اعظم کے عہدہ سے استعفا دے دیا۔

جنرل فرینکو کا ایک بیٹا تھا۔ مگر انھوں نے اپنے بیٹے کے بجائے جان کارلوز (Juan Carlos) کو ۱۹۶۹ میں اپنا جانشین مقرر کر دیا جو قدیم شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے مطابق، ۲۰ نومبر ۱۹۷۵ کو جب جنرل فرینکو کی موت ہوئی تو فوراً ہی جان کارلوز اسپین کے کنگ بن گئے (17/442-43)

افغانستان میں روسی فوج کی واپسی (۱۹۸۶) یا ڈاکٹر نجیب اللہ خاں کے خاتمہ (۱۹۹۲) کے بعد اگر ایسا ہوتا کہ افغانی لیڈر ظاہر شاہ کو روم سے واپس بلا کر انھیں دوبارہ علامتی بادشاہ کے طور پر کابل کے شاہی محل میں رکھ دیتے اور ان کے رسمی اقتدار کے تحت الکشن کر کے حکومت بناتے تو یہ افغانستان کے حق میں بے حد مفید ہوتا۔ اس کے بعد فوراً افغانستان کو اتحاد اور سیاسی استحکام حاصل ہو جاتا اور افغانیوں کی طاقت جو برسوں سے باہمی جنگ میں برباد ہو رہی ہے وہ محفوظ رہ کر ملک کی تعمیر و ترقی میں استعمال ہونے لگتی، جیسا کہ آج اسپین میں ہے۔

جنرل فرانکو اگرچہ ایک ڈکٹیٹر آدمی تھا۔ مگر آخر عمر میں وہ معتدل ہو گیا تھا۔ اس نے حکومت کی پوری پالیسی میں سختی کے بجائے نرمی کا انداز اختیار کیا۔ استعماری دور کی باقیات کے طور پر افریقہ کے کئی علاقے اسپین کے قبضہ میں تھے۔ اسپین کی نئی حکومتی پالیسی کے تحت ان کو آزاد کر دیا گیا۔ افریقہ کے اسپینی صحارا

کو مراکو اور موریطانیہ کے حوالے کر دیا گیا۔ مراکو کے بعض ساحلی علاقے اسپین کے قبضہ میں تھے۔ مثلاً
اِفنی (Ifni) اور سبتہ (Ceuta) ۔ ۱۹۷۰ میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ
کے تحت اِفنی مُراکو کو مل گیا اور سبطہ بدستور اسپین کے پاس باقی رہا (12/444)

یہاں جنرل فرانکو (۱۹۷۵ - ۱۸۹۲) کی پانچ تصویریں دی جا رہی ہیں۔ یہ نوجوانی کی عمر سے لے کر بڑھاپے کی عمر تک کی ہیں۔ یہ تصویریں بڑی عبرت ناک ہیں۔ یہ بتاتی ہیں کہ کس طرح آدمی طاقت سے آغاز کر کے آخر کار ضعف کی حالت میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ تصویریں گویا قرآن کی اس آیت کی زندہ تفسیر ہیں کہ ـــــــــ اللہ ہی ہے جس نے تم کو ناتوانی سے پیدا کیا۔ پھر ناتوانی کے بعد قوت دی۔ پھر قوت کے بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کر دیا۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ علیم و قدیر ہے (الروم ۵۴)

میڈرڈ کی کانفرنس میں میری ملاقات سبتہ کے ایک مسلمان سے ہوئی۔ ان کا نام محمد علی البھلولی (۴۱ سال) تھا۔ انھوں نے بتایا کہ اسپین اور مراکو کے درمیان مذکورہ معاہدہ کے بعد اسپین میں مسلمانوں کے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ اب یہاں تعصب کے بجائے رواداری آگئی ہے۔ ممکن ہے کہ اندر اندر کچھ تعصب موجود ہو، مگر ظاہری طور پر ہم لوگوں کو مسلمان ہونے کی وجہ سے کسی مشکل کا سامنا پیش نہیں آرہا ہے۔

Generalissimo Francisco Franco in uniforms he wore as a cadet at infantry school at Toledo, Spain, around 1910, as a general in 1937 during the Spanish civil war, as head of Falange Party in 1945 and in 1962 when he celebrated his 70th birthday. He died in 1975.

گویا سبتہ پر جزئی مفاہمت کرنے کی بنا پر پورے ملک اسپین میں مسلمانوں کو کلی مواقع حاصل ہو گئے۔

محمد علی البھلولی نے ۲۹ نومبر کی ملاقات میں بتایا کہ وہ سبتہ میں پیدا ہوئے۔ وہ یہاں تجارت کرتے ہیں۔ انھوں نے عربی میں گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ ۱۹۹۲ میں اسپین کی مسلم تنظیموں اور حکومت اسپین کے درمیان معاہدہ ہوا۔ اس کے تحت اسپینی حکومت نے دینِ اسلام کو ملک کا ایک مذہب تسلیم کر لیا (تم الاعتراف بالدین الاسلامی من طرف الحکومۃ الاسبانیۃ بعد توقیع اتفاقیۃ بین اللجنۃ الاسلامیۃ الاسبانیۃ والحکومۃ)

انھوں نے بتایا کہ اس وقت اسپین میں پانچ لاکھ (500,000) مسلمان موجود ہیں۔ سبتہ میں مسلمانوں کی تعداد پچیس ہزار ہے اور ملیلہ میں ۳۵ ہزار۔ سبتہ میں سولہ مسجدیں ہیں۔ اسپینی زبان پر ابھی تک عربی کے اثرات ہیں۔ عربی کے بہت سے الفاظ اسپینی زبان میں پائے جاتے ہیں مثلاً القنطرہ (Alcantara) القلعہ (Alcala) وغیرہ۔

سبتہ اور جبل الطارق کے درمیان صرف ۲۲ کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ پرتگالیوں نے سبتہ پر ۱۴۱۵ء میں قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے کئی بار سبتہ کو حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ یہاں تک کہ ۱۴۸۰ء میں اسپین نے پرتگالیوں کو شکست دے کر سبتہ اور بعض دوسرے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے سبتہ اور ملیلہ اسپین کے قبضہ میں ہے۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے سبتہ اور ملیلہ کا ذکر کیا۔ دوسرے نے کہا کہ ہمارا ان سے کیا تعلق، وہ دونوں تو اسپین کے شہر ہیں (ماشاننا بھما، انھما مدینتان اسبانیتان) پہلے نے کہا کہ یہ کیسی عجیب بے خبری ہے کہ عرب یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ دونوں مراکو کے ساحلی شہر ہیں۔ انھوں نے مزید تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ یہ صرف مراکو کی نہیں بلکہ تمام دول عربیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ انھیں واپس لے۔ مگر یہ نہایت عجیب بات ہے کہ عربوں کی تمام چوٹی کانفرنسوں نے سبتہ اور ملیلہ پر کبھی سرے سے بحث ہی نہ کی (من الغریب ان کافۃ مؤتمرات القمۃ العربیۃ لم تتحدث مطلقا عن سبتۃ وملیلۃ)

میں نے کہا کہ اگر عرب سلطنتوں نے اس مسئلہ پر کوئی اقدام نہیں کیا تو آپ نے خود ہی ان کی آزادی کے لیے اقدام کر دیا ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ ایک شخص ایک ملک سے کیوں کر لڑ سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہی سوال عرب سلطنتوں کی راہ میں بھی حائل ہے۔ کیوں کہ اگر انھوں نے اس موضوع پر کوئی اقدام کیا تو پورا

یورپ اور اقوام متحدہ ان کے مقابل میں آجائیں گے ،اس معاملہ میں جو عذر آپ کے لیے ہے وہی عذر ان کے لیے بھی ہے۔

جس طرح اسپین کے مقابلہ میں مراکو کے لیے سبتہ کا مسئلہ ہے ،اسی طرح خود اسپین کے لیے برطانیہ کے مقابلہ میں جبرالٹر کا مسئلہ ہے۔ جبرالٹر جغرافی طور پر اسپین کا حصہ ہے ،مگر ابھی تک اس کے اوپر برطانیہ کا قبضہ باقی ہے۔

المجلۃ (جدہ) کے شمارہ ۱۳-۱۹ نومبر ۱۹۹۴ (۱۰-۱۶ جمادی الآخرۃ ۱۴۱۵ھ) میں مراکو کے الملک الحسن الثانی کا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ اس سلسلہ میں مجلہ کے رئیس التحریر عبد الرحمن حمد الراشد نے ان سے ملاقات کی تھی۔ شاہ حسن نے عرب لیگ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا :

کیا ہم عرب لیگ کو قبر میں دفن کر دیں۔ اور اس کا جنازہ کس طرح نکلے گا۔ شاہ نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔ میں کہتا ہوں کہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم صرف میثاق کی تبدیلی پر اکتفا نہ کریں۔ بلکہ ہمیں چاہیے کہ ہم نئی عرب لیگ کے بارہ میں سوچیں۔ کیوں۔ اس لیے کہ عرب لیگ اب تک عرب۔ اسرائیل اختلاف کی بنا پر قائم تھی۔ یہی اختلاف اس کو غذا پہنچاتا تھا اور اس کو آکسیجن دیتا تھا۔ اور جب بھی وہ کمزور ہوتا تھا تو وہ اس کو طاقت کا انجکشن دیتا تھا۔ آج یہ عرب۔ اسرائیلی اختلاف کمزور ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ خدا نے چاہا تو وہ ختم ہونے والا ہے۔ اب ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم اس گھر سے وابستہ رہیں جس کو ہم عرب لیگ کہتے ہیں۔ تاکہ ہماری اجتماعیت قائم ہو سکے۔ شاہ نے اختصار کے ساتھ اس کو اس طرح کہا : ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم عرب لیگ کے لیے ایک نئے فکر کو ظہور میں لائیں :

هل سنقبر الجامعة العربية و كيف ستكون جنازتها؟ سأل الملك نفسه وأجاب بنفسه قائلاً: "اقول يجب ان لا نكتفي بتغيير الميثاق، يجب ان نفكر في جامعة عربية جديدة، لماذا؟ لان الجامعة العربية الى حد الآن كانت موجودة بسبب الخلاف العربي – الاسرائيلي، وكان ذلك الخلاف يغذيها ويعطيها الاوكسجين ويعطيها حقناً كلما ضعفت. اليوم هذا الخلاف اصبح يضعف ريثما ينتهي ان شاء الله... علينا اذن ان نبقى متشبثين بهذا البيت الذي نسميه الجامعة العربية ليجمع شملنا". قالها باختصار، "علينا ان نبلور فكرة جديدة للجامعة"

ایک صاحب سے اس کا ذکر ہوا۔ میں نے کہا کہ عرب لیگ کی حیثیت صرف ایک رسمی مجلس کی تھی نہ کہ حقیقی معنوں میں کسی موثر اتحاد کی۔ پھر جن عرب ملکوں کا حال یہ ہو کہ عرب لیگ جیسا رسمی اتحاد قائم کرنے کے لیے بھی انھیں ایک بیرونی قومی خطرہ کی ضرورت ہو، ان سے کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اسپین کے مقابلہ میں کوئی بڑا اور فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے ہیں۔

میرے کمرہ میں ایک اچھا ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا۔ مگر اپنے مزاج کے مطابق، میں نے کبھی اس کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ۲۹ نومبر کی صبح کو وقت جاننے کے لیے اس کو کھولا تو اسپینی زبان میں خبریں آرہی تھیں۔ خبریں تو سمجھ میں نہ آئیں۔ البتہ یہ سنا کہ اناؤنسر بار بار "مسلمان" کا لفظ بول رہا ہے۔ اناؤنسر نے بوسنیا کے بارہ میں کوئی خبر بتائی۔ اسی کے دوران اس نے غالباً بوسنیا کے کسی مسلم لیڈر کا ایک قول انگریزی میں نقل کیا۔ کہنے والے نے کہا تھا کہ بوسنیا کی صورت حال کے لیے میں اقوام متحدہ کو ذمہ دار ٹھہراتا ہوں۔ وہ ضروری کارروائی کرنے میں ناکام رہی :

I blame the U.N. for the Bosnian situation. It failed to act.

یہ یقینی طور پر نادانی کا ایک جملہ تھا۔ اقوام متحدہ نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ قومی نزاعات پر ہتھیار نہ اٹھایا جائے، بلکہ صرف پرامن دائرہ میں رہتے ہوئے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کا حال یہ ہے کہ پہلے وہ اقوام متحدہ کے اصول کی خلاف ورزی کر کے گن اٹھائیں گے اور جب اس کا الٹا انجام سامنے آئے گا تو اقوام متحدہ سے امید کریں گے کہ وہ آئے اور ان کی مرضی کے مطابق ان کے مسئلہ کو حل کر دے۔

۲۹ نومبر کو صبح ۷ بجے میرے کمرہ کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو تکرار کے ساتھ یہ آواز آنے لگی کہ صباح الخیر، یہ بیدار کرنے کی کال ہے :

Good morning. This is a wake-up call.

اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے حشر کا لمحہ آگیا ہے اور موت کی نیند سونے والی روحوں کو پکارا جا رہا ہے کہ اٹھ جاؤ۔ اب آخری فیصلہ کا وقت آگیا۔ یہ وقت آج علامتی صورت میں آیا ہے، مگر کل وہ حقیقی صورت میں آئے گا۔ عقل مند وہ ہے جو کل ہونے والے اعلان کو آج کی آواز میں سن لے۔

کھانے کی میز پر دو مصری نوجوان آگئے۔ ایک کا نام عبدالمقصود تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ڈیوزبری

(انگلینڈ) میں تبلیغی جماعت کا اجتماع تھا۔ اس میں وہ بھی جزئی طور پر شریک ہوئے۔ اس اجتماع میں ہر ملک کے مسلمان آئے ہوئے تھے۔ ہر طرف السلام علیکم، السلام علیکم کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہی منظر تھا جس کو قرآن میں اِلَّا قِیلاً سلاماً سلاماً (الواقعہ ۲۶) کہا گیا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ میں نے آخری تقریر سنی، بہترین تقریر تھی۔ ایسی تقریر میں نے مصر میں کبھی نہیں سنی (کلام جمیل، لم اسمع مثلہ فی مصر)

کھانے کی میز پر قاہرہ کے دکتور جمعہ بھی موجود تھے۔ وہ فقہ کے استاد ہیں۔ ایک مقامی مسلمان نے ان سے سوال کیا کہ اس ملک میں حلال گوشت کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ پھر ہم لوگ کیا کریں۔ دکتور جمعہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کو دیکھو۔ یہ گوشت نہیں کھاتے۔ وہ غیر لحمی غذا پر گزارہ کرتے ہیں۔ لیکن ان کی صحت بہترین ہے۔ گوشت کے بغیر آدمی مر نہیں جاتا۔

گوشت کے بارہ میں میرا یہ ذوق اختیاری نہیں ہے۔ میری والدہ کہتی تھیں کہ جب میں چھوٹا بچہ تھا اس وقت بھی میرا یہ حال تھا کہ اگر وہ انڈا یا مچھلی یا گوشت میرے منہ میں ڈالتی تھیں تو میں نکال دیتا تھا، اور اس کو کھاتا نہیں تھا۔ گویا میں پیدائشی طور پر "سبزی خور" ہوں۔ میں نے دکتور جمعہ کی بات کی تکمیل کرتے ہوئے کہا: میں بائی برتھ ویجیٹیرین ہوں، آپ حالات کے تقاضے کے تحت بائی چوائس ویجیٹیرین بن جائیے۔

ایک تعلیم یافتہ عرب سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ جو عرب خود اپنے وطن میں کوئی بڑا علمی کارنامہ نہیں کر سکے تھے انھوں نے اسپین میں کیسے اتنا بڑا علمی کارنامہ انجام دیا کہ وہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کی بنیاد بن گیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کا جواب ایک مستشرق نے یہ دیا ہے کہ عرب ایک ایسے ملک میں تھے جہاں دریاؤں کی روانی نہ تھی۔ وہاں سرسبز مناظر موجود نہ تھے۔ اس کے بجائے وہاں خشک پہاڑ اور تپتے ہوئے ریگستانوں کا ماحول تھا۔ اس کے بعد یہ عرب اپنے وطن سے نکل کر جب اسپین میں پہنچے تو یہاں قدرتی مناظر تھے۔ فطرت کا حسن تھا، نشاط انگیز آب و ہوا تھی۔ اس نے عربوں کے اندر ولولۂ کار اور جوش عمل ابھار دیا۔ ماحول کے اثر سے ان کی فطری صلاحیتیں جاگ اٹھیں۔

میں نے کہا کہ یہاں دوبارہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان نشاط انگیز مناظر نے خود اسپینیوں کے اندر یہی ولولہ کیوں نہیں ابھارا۔ اس فرق پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ولولۂ کار کو ابھارنے والی اصل چیز تبدیلی (change) ہے۔ عربوں کے لیے صحرا سے نکل کر چمنستان میں جانا تبدیلی کا ایک

ہیجان خیز معاملہ تھا۔ اس تجربہ نے ان کی شخصیت کو جگا دیا۔ مگر یہی عرب جب اسپین کے محل اور باغات کے عادی ہو گئے تو دوبارہ ان کی صلاحیتیں سو گئیں۔ علم کے قافلہ کو مزید آگے لے جانے کا کام مغربی یورپ نے کیا جس کو دو سو سالہ کروسیڈ کی ہار نے تبدیلی کے زلزلہ خیز تجربہ سے دوچار کر دیا تھا۔

ایک اسپینی اسکالر نے کہا کہ مسلمانوں نے جب ہمارے ملک پر حملہ کیا تو انھوں نے ہماری دولت کو لوٹا، یہاں کے باشندوں کو لونڈی اور غلام بنایا۔ کیا آپ کا اسلام اسی کی تعلیم دیتا ہے۔ اسپین میں تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک طبقہ اسی انداز میں سوچتا ہے۔

جہاں تک اسپین میں مسلمانوں کی فوجی کارروائی کا تعلق ہے، اس کا معقول جواز موجود ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس زمانہ میں وِسی گوتھ کا آخری بادشاہ وٹیزا (Witiza) اسپین کا حکمراں تھا۔ اس کا زمانۂ حکومت ۷۰۰ سے ۷۱۰ تک ہے۔ پادریوں نے وٹیزا کے خلاف سازش کر کے اس کو تخت سے ہٹادیا اور اس کی جگہ ایک فوجی سردار لذریق (Roderick) کو اسپین کے تخت پر بٹھادیا۔ وٹیزا چونکہ لذریق کو غاصب سمجھتا تھا۔ اس نے اس سے انتقام لینے کے لیے مسلمانوں کو اسپین پر حملہ کی دعوت دی۔ اس حملہ میں سبتہ (Ceuta) کے ناراض اسپینی حاکم (Count of Ceuta) نے بھی مدد کی جس کا نام جولین (Julian) تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی جولین نے طارق کو چار بڑی کشتیاں دی تھیں جن کے ذریعہ طارق نے اپنے لشکر کو اسپین کے ساحل پر اتارا تھا۔

مورخین نے اعتراف کیا ہے کہ اسپین پر مسلمانوں کا حملہ اپنی طرف سے شروع نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ خود اسپین کے وِسی گوتھ کی دعوت پر تھا:

> The Muslim invasion of Spain was the result of Visigoth invitation rather than Muslim initiative. (17/414)

مگر اسی کے ساتھ خود مسلم مؤرخین یہ بتاتے ہیں کہ طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نُصیر نے جب اسپین میں فتوحات کیں تو وہاں انھوں نے بے شمار مقدار میں سونا اور چاندی اور ہیرے اور جواہر اور دوسرے اموال کو لوٹا اور کثیر تعداد میں عورتوں اور لڑکوں کو لونڈی اور غلام بنایا (۸۳)۔ وہ ایک ایک شہر کو فتح کرتے رہے اور لونڈی اور غلام اور مالِ غنیمت اتنی زیادہ مقدار میں لے کر لوٹے جس کا شمار نہیں کیا جاسکتا (لا تُحصی ولا تُعدّ کثرۃ) البدایہ والنہایہ لابن کثیر ۹/۸۷

میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے اس طرح اسپین میں مال غنیمت لوٹنا اور لونڈی اور غلام بنانا صحیح نہ تھا۔ کیوں کہ مال غنیمت کا اسلامی قانون اس جنگ کے لیے ہے جو کسی قوم نے یک طرفہ جارحیت کر کے مسلمانوں کے خلاف چھیڑی ہو۔ مگر اسپین کے لوگ اس معنی میں جارح نہ تھے۔ اس لیے فتح کے بعد ان کے اموال کو لوٹنا اور ان کو لونڈی اور غلام بنانا صحیح نہیں ہو سکتا۔ مزید یہ کہ مال غنیمت کا قانون بھی صرف میدان جنگ کے لیے ہے نہ کہ عام آبادی کے لیے۔

ایک اور صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ طارق بن زیاد یا بابر کے معاملہ کو عام طور پر اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ "طارق کا حملہ اسپین پر" یا "بابر کا حملہ ہندستان پر"۔ مگر یہ درست نہیں۔ یہ شاہی دور کے واقعہ کو جمہوری دور کی اصطلاح میں بیان کرنا ہے۔ آج قومی جمہوریت کا زمانہ ہے۔ آج ایک قوم یا ملک کا حملہ دوسری قوم یا ملک پر ہوتا ہے۔ مگر شاہی دور میں ایسا نہ تھا۔ اس زمانہ میں جو سیاسی ٹکراؤ پیش آتا تھا وہ ایک بادشاہ کا دوسرے بادشاہ سے ہوتا تھا نہ کہ ایک قوم کا دوسری قوم سے۔

اسپین میں طارق بن زیاد کے داخلہ کو اسی زمانی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ مزید یہ کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ معروف معنوں میں کوئی جارحانہ داخلہ نہ تھا بلکہ اس کی نوعیت یہ تھی کہ سابق حکمراں کے ظلم سے لوگ تنگ آ گئے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے سابق حکمراں کے خلاف نئے حکمراں کو دعوت دی اور اس کا استقبال کیا۔

۲۹ نومبر کو میڈرڈ کے اخبار (Puerta de Madrid) کی خاتون نمائندہ لوئیلا (Leoilla) نے انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ اسلام کی تعلیمات فطرت پر مبنی ہیں۔ اور فطرت ہمیشہ امن کو پسند کرتی ہے۔ اس لیے اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ اسلام میں صرف دفاعی جنگ ہے، اسلام میں جارحانہ جنگ نہیں۔

اسی طرح ایک اور اسپینی اخبار (La Libre Belgique) کی خاتون نمائندہ پاسکل بورگا (Pascale Bourgaux) نے اپنے اخبار کے لیے انٹرویو لیا۔ ان کو میں نے اپنے پیپر "پیس ان اسلام" کی ایک کاپی دی۔ ان کے ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ موجودہ قسم کی کانفرنس کو صرف اس کے تین روزہ اجلاس کی روشنی میں نہیں جانچنا چاہیے بلکہ اس کو ایک عمل (Process) کے روپ

میں دیکھنا چاہیے۔ اسی وقت اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان سے ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری آئے تھے۔ وہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (اسلام آباد) کے ڈائرکٹر ہیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ پاکستان میں ایک بڑی تباہ کن سیاسی روایت جاری ہوگئی ہے۔ اور وہ یہ کہ جو پارٹی الکشن میں ہارتی ہے وہ اپنی ہار کو تسلیم نہیں کرتی۔ پولنگ بوتھ پر ناکامی کے بعد وہ دوبارہ سڑک کی سیاست پر آجاتی ہے۔ وہ جلسہ جلوس، حتی کہ توڑ پھوڑ کے ہنگامے جاری کرکے چاہتی ہے کہ جیتی ہوئی پارٹی کو میعاد سے پہلے اقتدار سے بے دخل کردے۔ یہ سیاست نہیں ہے بلکہ سیاست کے نام پر دادا گیری ہے۔

میں نے کہا کہ میرے مطالعہ کے مطابق، اس غلط سیاسی روایت کو پاکستان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے شروع کیا۔ ان کو محمد ایوب خاں کے مقابلہ میں واضح انتخابی شکست ہوئی۔ مگر انھوں نے اپنی شکست کو تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ ایوب خاں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لیے دوبارہ نئے عنوان سے احتجاج اور ہنگامہ آرائی کی مہم شروع کردی۔ اس کے بعد پاکستان میں یہی سیاسی روایت عام طور پر چل پڑی۔

ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے بطور واقعہ اس کو مانتے ہوئے کہا کہ اس کی جڑ یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن میں سیاست ہی سب کچھ بن گئی ہے۔ سیاست کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کی وجہ سے موجودہ زمانہ میں ہر جگہ اس قسم کی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری الہ آباد میں ۱۹۳۲ میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ پھر باہر جاکر انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ان سے میں نے پوچھا کہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے ایک جملہ میں آپ کا مشورہ کیا ہے۔ انھوں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر جواب دیا: انھیں چاہیے کہ عقل سے کام لیں۔

پاکستان کے جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے نومبر ۱۹۸۹ میں اسپین کا سفر کیا تھا۔ ان کے ساتھ ایک اور پاکستانی مسلمان جناب سعید احمد صاحب بھی تھے۔ انھوں نے اپنا سفرنامہ "اندلس میں چند روز" کے نام سے شائع کیا ہے۔ سفر کے آخری مرحلہ کا ایک واقعہ وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"میرے دوست اور رفیق سفر سعید صاحب اندلس کے ماضی وحال کے تصورات سے اس درجہ متاثر تھے کہ ایک مرحلہ پر بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا: کیا کبھی مسلمان اس خطہ کو دوبارہ ایمان سے منور کرسکیں گے۔ میں نے عرض کیا: اس وقت تو مسلمان اپنے موجودہ خطوں کو ٹھیک سے سنبھال لیں اور

اس بات کا انتظام کرلیں تو بہت ہے کہ وہاں اندلس کی تاریخ نہ دہرائی جائے۔"

میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ ہندستان میں کچھ مسلم رہ نما یہ انکشاف کر رہے ہیں کہ یہاں اندلس کی تاریخ کو دہرانے کا منصوبہ بنایا جارہا ہے۔ مگر عین اس وقت پاکستان کے رہ نما بھی یہی اندیشہ محسوس کر رہے ہیں کہ پاکستان کہیں دوسرا اندلس نہ بن جائے۔ کیسا عجیب ہے یہ انجام جو سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت کی ہنگامہ خیز سیاست کے بعد برصغیر ہند کے مسلمانوں کے حصہ میں آیا ہے۔

مسلم اسپین کے اثرات مختلف اعتبار سے ہندستان تک بھی پہنچے تھے۔ کینن ای سیل (Canon E. Sell) نے اپنی کتاب اسلام کے مذہبی سلسلے (The Religious Orders of Islam) میں لکھا ہے کہ قلندریہ سلسلہ کے بانی بو علی قلندر (علی ابو یوسف قلندر) اسپین سے ہندستان آئے تھے۔ وہ مسلم اسپین میں پیدا ہوئے۔ وہاں سے وہ دمشق گئے۔ پھر وہ ایران پہنچے۔ آخر میں وہ ہندستان آئے اور آخر عمر تک یہیں رہے۔ ۱۳۲۳ء میں پانی پت میں ان کا انتقال ہوا۔

یہ ایک خانہ بدوش صوفی سلسلہ تھا۔ وہ کماتے نہیں تھے بلکہ لوگوں کے عطیات پر زندگی گزارتے تھے۔ ان کی زندگی انتہائی حد تک سادہ ہوتی تھی۔ اقبال نے اس شعر میں غالباً انھیں کی طرف اشارہ ہے:

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

میں ۲۷ نومبر ۱۹۹۴ کو اسپین پہنچا تھا۔ ۲۸ - ۲۹ نومبر کو وہاں تین مذاہب کی انٹرنیشنل کانفرنس تھی۔ اس کے بعد ۳۰ نومبر کا دن خالی تھا۔ یہ دن صرف ملاقاتوں اور معلومات اور مشاہدات کے لیے مخصوص تھا۔ میں نے اس موقع کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا۔ اس طرح جو باتیں دیکھیں یا جانیں ان کا مختصر تذکرہ اگلے صفحات میں کیا جاتا ہے۔

۱۹۴۰ کے لگ بھگ زمانہ میں میں نے الطاف حسین حالی کی منظوم کتاب مسدس پڑھی تھی جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں حالی نے اسپین کی عظمتِ رفتہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان کے یہ اشعار سادگی بیان اور تاثیر کی عجیب مثال ہیں۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے

مجھے یقین نہیں تھا کہ اس کے ۵۵ سال بعد مجھے اسپین جانے کا موقع ملے گا اور وہاں میں براہِ راست طور پر قرطبہ کی سرزمین کو دیکھوں گا۔

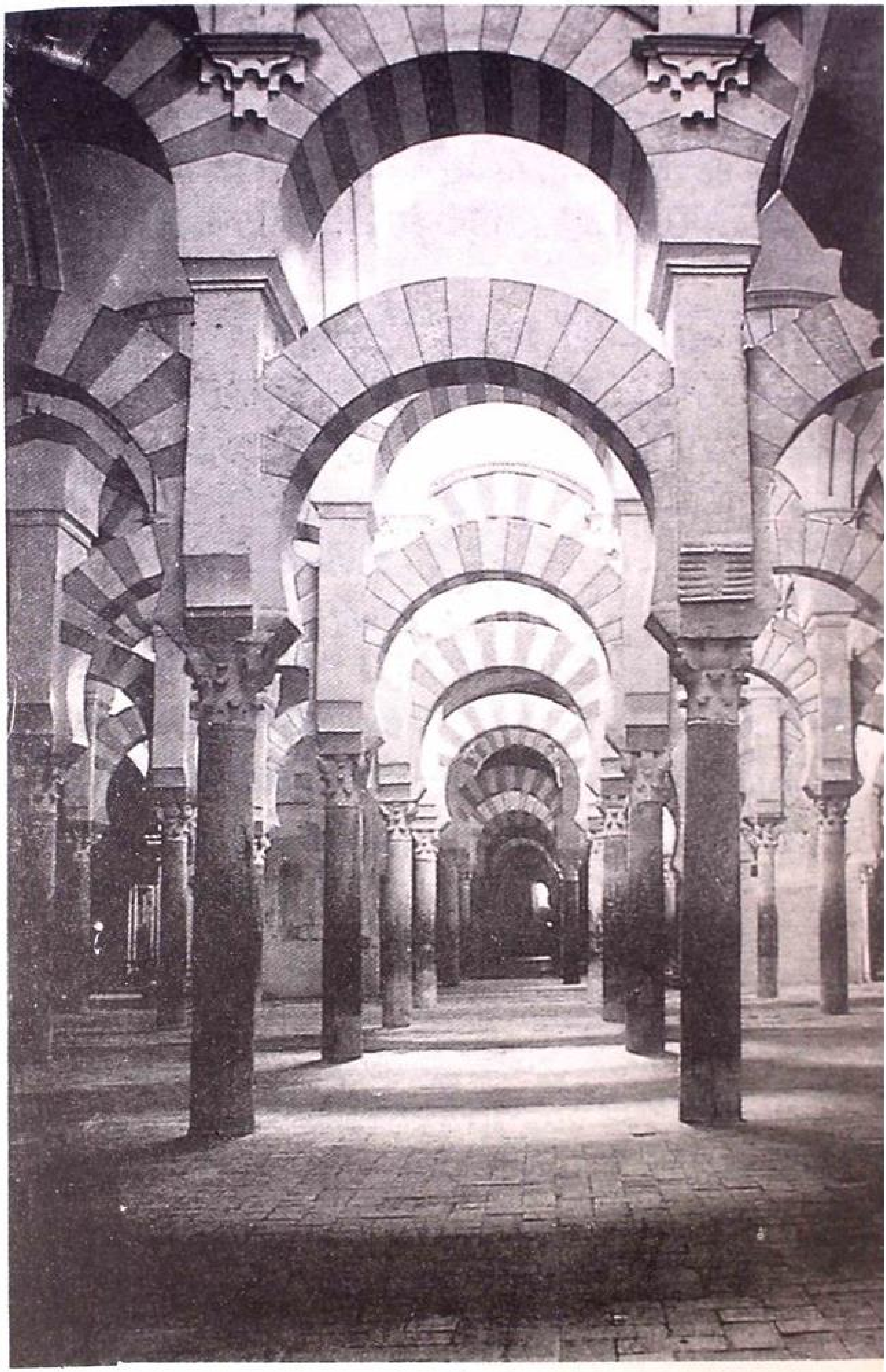

قرطبہ (Cordoba) اسپین کا ایک قدیم شہر ہے۔ مسلمانوں نے ۷۱۱ء میں اس کو فتح کیا اور ۷۵۶ء میں اس کو اپنی راجدھانی بنایا۔ اس کے بعد سے گیارھویں صدی عیسوی تک وہ مسلم اسپین کی راجدھانی بنا رہا۔ دسویں صدی میں وہ یورپ کا سب سے بڑا شہر تھا اور اس کی حیثیت عالمی کلچرل سنٹر کی ہوگئی۔ ۱۲۳۶ء میں وہ مسیحی اسپین کا حصہ بن گیا۔

قرطبہ میں بہت سی مسلم یادگاریں ہیں۔ "مسجد قرطبہ" کو اس کی پرعظمت تعمیر کی وجہ سے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ابتداءً اس کو خلیفہ عبد الرحمن نے بنوایا۔ بعد کے سلاطین مزید اس کی تکمیل کرتے رہے۔ یہ مسجد بارہ ہزار مربع میٹر کے رقبہ میں ہے۔ یعنی اس کی لمبائی ۴۰۰ قدم ہے اور اس کی چوڑائی ۴۴۰ قدم۔ اس میں ۸۰۰ ستون ہیں اس کا ایک حصہ چرچ بنادیا گیا ہے جس کو ملاکر بارہ سو ستون ہوجاتے ہیں۔ ستونوں کی کثرت کی بنا پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بے شمار کھجوروں کے درخت کے اوپر ایک وسیع اور منقش چھت کھڑی ہوئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسجد قرطبہ کو دیکھ کر اقبال کی زبان پر یہ شعر آگیا تھا :

تیری بنا پائدار تیرے ستوں بے شمار شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل

مسجد قرطبہ پر اقبال کی نظم صاحب "نقوش اقبال" کے الفاظ میں " ان کے واحد شاہکار کا حکم رکھتی ہے (۱۸۱) اقبال نے اس تاریخی اور تاریخ ساز مسجد کی ساخت میں بکھرے جذبات اور حسن کی یکتائی کا معائنہ کیا۔ اس منظر نے مومن شاعر کے نازک جذبات کے تار چھیڑ دیے جس کے نتیجہ میں وہ لافانی نغمہ دنیا نے سنا جسے ہم مسجد قرطبہ والی نظم میں گونجتا ہوا پاتے ہیں" (۱۶۸)

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کائنات کی عظیم تر نشانیاں جن کو قرآن میں "آیات اللہ" کہا گیا ہے۔ وہ اقبال کے نازک جذبات کے تار کو چھیڑنے میں ناکام رہیں۔ البتہ مسجد قرطبہ کے در و دیوار کو دیکھنا ان کے جذبات کے تاروں کو چھیڑنے کا سبب بن گیا۔ حالاں کہ حدیث میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ما اُمِرتُ بتشييد المساجد (مجھ کو بلند و بالا مسجدیں بنانے کا حکم نہیں دیا گیا) اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد عبد اللہ بن عباس نے کہا : لَتُزَخرِفُنَّها كما زخرفت اليهود والنصارى (تم بھی مسجدوں کو اسی طرح مزین کروگے جس طرح یہود و نصاری نے مزین کیا)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ لوگ (مسجدوں کی تعمیر پر) ایک دوسرے سے فخر کریں (لا تقوم الساعة حتى

يتباهى الناس في المساجد) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب فی بناء المساجد

حقیقت یہ ہے کہ اگر آدمی کے اندر بصیرت و معرفت موجود ہو تو زمین پر کھڑا ہوا ایک خدائی درخت اس سے زیادہ وجد کی کیفیت پیدا کر دینے والا ہے جتنا کہ کوئی انسانی عمارت۔

آبنائے جبرالٹر شرق اور غرب کا سب سے قریبی نقطۂ اتصال ہے۔ چنانچہ اسلام اولاً یہیں سے مغربی دنیا میں داخل ہوا۔ اس راستہ سے مسلمانوں کا پہلا قافلہ ۲۷ھ میں اندلس (اسپین) پہنچا۔ یہ حضرت عثمان کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اس پہلے مسلم دستہ کے سربراہ عبداللہ بن نافع الفہری تھے۔

اس کے بعد دوسرا قابل ذکر مسلم دستہ ۹۱ھ میں اسپین میں داخل ہوا۔ یہ موسیٰ بن نُصیر کے ماتحت سردار طریف تھے جو پانچ سو آدمیوں کے ساتھ اسپین کے ساحل پر اترے۔ یہ کوئی فوجی مہم نہیں تھی بلکہ وہ صرف دریافت حال کے لیے اسپین کے علاقہ میں بھیجی گئی تھی۔

اس کے اگلے سال ۹۲ھ میں طارق بن زیاد کی مہم روانہ ہوئی۔ ابتداءً اس کے ساتھ سات ہزار آدمیوں کا لشکر تھا۔ انھوں نے اس وقت کے اسپینی حکمراں لذریق (Roderick) کی فوجوں کو ۱۹ جولائی ۷۱۱ء کو شکست دے کر اسپین میں پہلی مسلم سلطنت قائم کی۔ یہ اسپین کی مسلم سلطنت کا ابتدائی دور تھا جس کو عرب امرا کا عہد (۷۱۱ تا ۷۵۶ء) کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد عباسیوں کی داروگیر سے بھاگ کر ایک اموی شہزادہ عبدالرحمٰن الداخل اسپین پہنچا۔ اس نے مقامی امرا کو شکست دے کر ۷۵۶ء میں امیر اندلس ہونے کا اعلان کیا اور اسپین (اندلس) میں باقاعدہ اموی خلافت قائم کی۔

مسلسل باہمی اختلاف اور ٹکراؤ کے باوجود اس زمانہ میں مسلمانوں نے اسپین کو بہت ترقی دی۔ یہاں تک کہ ترقیاتی قوتوں پر اختلافی قوتیں غالب آگئیں۔ ۱۰۲۳ء کے بعد وہ دور شروع ہوا جس کو ملوک الطوائف کا دور کہا جاتا ہے۔ اب ہر علاقہ کے سرداروں نے خود مختاری کا اعلان کر کے اندلس میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر لیں۔ یہاں تک کہ ان کی ۲۰ مختلف حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے عیسائیوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔

طارق بن زیاد کے اسپین میں داخلہ کے بعد مسیحی فوج سے اس کا فیصلہ کن مقابلہ وادی لکّہ میں ہوا تھا۔ اس وقت طارق کے ساتھ (مزید کمک کو شامل کرتے ہوئے) بارہ ہزار آدمیوں کا لشکر تھا اور مسیحی

فوج کی تعداد ستر ہزار سے زیادہ تھی۔ اس موقع پر طارق نے پرجوش تقریر کی جو تاریخ کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔ اس کی تقریر کا ایک جملہ یہ تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا تمہارے لیے ممکن ہے اگر تم اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دو (انّ انتهاز الفرصة فيه لممكن إن سمحتم لانفسكم بالموت)

ایک عرب اسکالر نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج مسلمانوں میں یہ اسپرٹ موجود نہیں، اسی لیے وہ ہر جگہ ذلیل ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر آپ موت کے منہ میں کود پڑیں تو آپ غالب آجائیں گے۔ موجودہ زمانہ میں بار بار مسلمان موت کے منہ میں کودے ہیں —— ۱۸۵۷ میں ہندستانی علماء شاملی کے میدان میں موت کے منہ میں کود پڑے۔ سید احمد شہید بریلوی کا قافلہ بالاکوٹ میں موت کے منہ میں کود پڑا۔ اسی طرح فلسطین، کشمیر، چیچنیا، بوسنیا وغیرہ میں مسلمان موت کے منہ میں کودے ہوئے ہیں۔ مگر ان تمام اقدامات میں تباہی کے سوا کچھ اور مسلمانوں کے حصہ میں نہیں آیا۔ اس طرح کے مقابلوں میں کامیابی کے لیے موت کے منہ میں کودنا صرف ایک جزئی عامل ہوتا ہے نہ کہ کلی عامل۔

اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں نے پورے ملک اسپین پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ مثلاً ریاض کے مجلہ الفیصل شعبان ۱۴۱۵ (جنوری ۱۹۹۵) میں شائع شدہ ایک مضمون میں کہا گیا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں طارق بن زیاد المغرب کے راستے سے اسپین میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ عربوں اور بربروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی فوج تھی۔ چار سال کی جنگی سرگرمیوں کے بعد اسلامی لشکر نے پورے اسپین پر غلبہ حاصل کر لیا (... الی ان سيطرت الجيوش الاسلامية على كل اسبانيا) صفحہ ۵،

مگر یہ بات صحیح نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسپین کے بڑے حصہ پر مسلمان غالب آگئے تھے۔ تاہم ملک کا ایک حصہ پھر بھی عیسائیوں کے قبضہ میں رہا۔ ۹۱۰ء میں مسلمان اپنی آخری حد پر پہنچ چکے تھے۔ مگر اس وقت بھی اسپین کے مغربی حصہ میں مسیحی ریاستیں قائم تھیں۔ مسیحیوں کا زیر قبضہ علاقہ پورے ملک کے رقبہ کا تقریباً چوتھائی حصہ تھا۔ مسلمانوں کے زیر قبضہ علاقہ کو اندلس کہا جاتا ہے (17/415)

اسپین (اندلس) کے مسلم عہد کی آبادی کے بارہ میں حتمی اعداد و شمار حاصل نہیں ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے داخلہ کے وقت اسپین کے باشندوں کی تعداد تقریباً چالیس لاکھ (4,000,000) تھی۔ اس کے بعد جو عرب ہجرت کر کے وہاں گئے ان کی مجموعی تعداد پچاس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ بارسلونہ

یونی ورسٹی میں عربی کے پروفیسر جان جینز (Juan Vernet Gines) نے لکھا ہے کہ قبضہ کی ابتدائی صدیوں میں قبول اسلام کی لہر کی وجہ سے مسلم آبادی برابر بڑھتی رہی۔ اس نے اسپین کے عیسائیوں کی تعداد میں نمایاں کمی کر دی :

The Muslim masses continued to increase during the early centuries of the occupation, because of the wave of conversions that markedly reduced the number of Christians. (17/419)

توالد وتناسل یا قبول اسلام کے ذریعہ اسپین کی آبادی میں جو اضافہ ہوا، اس کی مجموعی تعداد قطعی طور پر معلوم نہیں۔ تاہم دسویں صدی کے آخر میں مسلم اسپین کے سات بڑے شہروں (قرطبہ، طلیطلہ، المیریا، غرناطہ، سرقسطہ، بلنسیہ، مالقہ) میں آبادی کا جو اندازہ کیا گیا ہے، وہ مجموعی طور پر تین لاکھ ستاسی ہزار (387,000) ہوتا ہے۔

مسلم اسپین سیاسی اعتبار سے کسی ایک وحدت کا نام نہیں تھا۔ اس کے تین بڑے دور رہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، طارق بن زیاد نے ۷۱۱ء میں جبرالٹر کے راستہ سے داخل ہو کر اسپین (اندلس) میں مسلم سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ پہلی اسپینی حکومت بغداد کی خلافت عباسی کے تحت تھی۔ اس حکومت کا پہلا امیر عبدالعزیز بن موسیٰ تھا۔ اس نے اشبیلیہ کو اپنی راجدھانی بنایا تھا۔ دوسرے امیر ایوب بن حبیب نے قرطبہ کو راجدھانی بنایا۔

اس کے بعد اموی شہزادہ عبدالرحمٰن الداخل عباسیوں کی داروگیر سے بھاگ کر اسپین پہنچا۔ اس نے یہاں اپنی ایک فوج بنائی۔ اس نے عباسیوں کی ماتحت حکومت کو ختم کر کے باقاعدہ طور پر آزاد اموی حکومت قائم کی جس کی راجدھانی قرطبہ تھی۔ یہ حکومت ۷۵۶ء سے لے کر ۱۰۳۱ء تک باقی رہی۔

اس کے بعد تیسرا دور آیا جب کہ اندلس میں طوائف الملوکی آگئی۔ ہر علاقہ کے امیر نے مرکز سے بغاوت کر کے اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اس طرح اندلس میں تقریباً بیس حکومتیں بن گئیں۔ ان چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو عیسائی ایک ایک کر کے ختم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر میں غرناطہ کی محدود حکومت اسی طرح باقی رہ گئی جس طرح انیسویں کے وسط میں دہلی میں مغل بادشاہ کی حکومت باقی رہی تھی۔ یہ آخری حکومت بھی ۱۴۹۲ء میں عیسائیوں کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔

مسلم اسپین میں جب سیاسی انتشار کی حالت پیدا ہوئی تو اس کو وقتی طور پر افریقہ کے حکمراں

یوسف بن تاشفین نے ختم کیا تھا۔ وہ ۱۰۸۶ء میں اسپین میں داخل ہوا۔ اس نے عیسائی حکمراں الفانسو ششم (Alfanso VI) کو شکست دی۔ باغی مسلم امراء کو زیر کیا۔ اس طرح اسپین میں ایک نیا مسلم دور شروع ہوا جو ۱۲۶۹ء تک چلا۔

تاہم یہاں کے مسلمان باہمی اختلافات کے نتیجہ میں مسلسل اندرونی اور بیرونی زیادتیوں کا شکار رہے۔ آخری دور میں مسلم اسپین کی علامت سلطنت غرناطہ (۱۴۹۲-۱۲۳۲ء) تھی۔ اس کے حکمرانوں نے ولا غالب الا اللہ کو اپنا شعار بنایا۔ وہ اپنی عمارتوں وغیرہ پر کثرت سے اس لفظ کو تحریر کرتے تھے۔ یہ گویا اسلامی مزاج کا ایک اظہار ہے۔ مسلمان خواہ کسی بھی حالت میں ہوں، وہ ہمیشہ خدا ہی کو اپنا بڑا بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف غیر حاکمانہ حیثیت میں بلکہ حاکمانہ حیثیت میں بھی خدا ہی کو غالب و قاہر سمجھتے ہیں۔ کبھی اور کسی حال میں یہ حقیقت ان کے ذہن سے محو نہیں ہوتی۔

میڈرڈ میں ایک عرب مسلمان سے اس موضوع گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ لوگوں نے اسپین سے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے خاتمہ کو اسپین سے اسلام کے خاتمہ کے ہم معنی سمجھ لیا۔ حالاں کہ بطور واقعہ یہ درست نہ تھا۔ اگر لوگ تلک الایام نداولھا بین الناس کے ذہن سے سوچتے تو وہ اسپین میں سیاسی اقتدار کے خاتمہ کے باوجود اسلام کے دینی وجود کو زندہ رکھ سکتے تھے۔ مگر کئی صدیاں صرف فریاد و ماتم میں گزر گئیں۔ یہاں تک کہ خود تاریخ کی طاقتوں نے ظاہر ہو کر اسپین میں اسلام کے احیاء نو کا کام شروع کر دیا۔

نئے تقاضوں کے تحت اسپین میں مستقل طور پر ایک عمل جاری ہو گیا ہے جس کو عرب دانش ور اَسبنة التاریخ الاسلامی فی الاندلس کہتے ہیں۔ یعنی اندلس کی اسلامی تاریخ کو اسپینی بنانا۔

اس نئے رجحان کے تحت اسپین میں بہت سے کام کیے جا رہے ہیں۔ مثلاً قرطبہ میں آپ دیکھیں گے کہ وہاں کی سڑکوں پر مسلم شخصیتوں کے بورڈ لگے ہوئے ہیں۔ مثلاً شارع ابن رشد، شارع ابن الولید، شارع المنصور، شارع الزہراوی، وغیرہ۔ اسی طرح آپ قرطبہ جائیں تو وہاں کی سڑکوں کے کنارے آپ دیکھیں گے کہ عرب دور کے اہل علم کے مجسمے جگہ جگہ نصب کیے گئے ہیں۔ مثلاً ابن رشد جس کا مجسمہ ۱۹۶۷ء میں لگایا گیا۔ علی بن حزم کا مجسمہ ۱۹۶۳ء میں، حکیم العیون محمد بن قسوم کا مجسمہ ۱۹۶۵ء میں، اور اسی طرح دوسرے بہت سے مجسمے۔ حتی کہ غرناطہ کے قریب ایک ساحلی مقام المونیکر (Almunecar) پر عبد الرحمٰن الداخل کا بہت بڑا مجسمہ لگایا گیا

ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سمندری سفر طے کر کے اموی شہزادہ عبدالرحمٰن اسپین کی سرزمین پر اترا تھا۔ یہ مجسمہ پانچ میٹر بلند ایک چوٹی کے اوپر ہے۔ وہ اپنی تلوار پر ٹیک لگائے ہوئے فاتحانہ انداز میں کھڑا ہوا ہے۔

اس طرح کے بہت سے واقعات جدید اسپین میں ہو رہے ہیں جس کا ذکر اس مختصر سفرنامہ میں ممکن نہیں۔ ۱۹۸۶ میں قرطبہ میں ایک بہت بڑی کانفرنس ہوئی۔ اس میں اسپین کے علاوہ بیرونی ملکوں کے ۱۵۰ علماء شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کا موضوع "اندلس میں اسلام" تھا۔ اس میں نہایت کھل کر اس موضوع پر تقریریں اور مباحثے ہوئے۔ عام طور پر اسپینی پریس نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ ایک انتہا پسند اسپینی مجلہ کا مبیو نے اپنے شمارہ ۹ فروری ۱۹۸۷ میں ایک رپورٹ شائع کی۔ اس کا عنوان تھا ــــــ اسلام ہمارے ملک میں داخل ہوتا ہے :

El Islam Nos Penetra (Cambio)

ایک عرب عالم نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مسیحیوں کی دشمنی اور ظلم و زیادتی کے باوجود خدا کے فضل سے اسلام سرزمین اسپین میں بخیر و عافیت موجود ہے (رغم کل هذا الحقد الصليبي و رغم التنكيل فلا يزال الاسلام بخير في ارض الاندلس)

ایک اسپینی مسلمان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ تاریخ کے بارہ میں کسی ایک کتاب کو پڑھ کر رائے قائم کرنا صحیح نہیں۔ تاریخ بظاہر واقعات کا ریکارڈ ہے۔ مگر تقریباً تمام تاریخی کتابیں اپنے اپنے ذوق کے مطابق منتخب واقعات کا ریکارڈ کرتی ہیں۔

مثلاً اسپین کے بارہ میں مسلمانوں نے جو تاریخیں لکھی ہیں ان کا انداز یہ ہے کہ ان میں مسلمانوں کی صرف اچھی باتوں کو لیا گیا ہے، اور مسیحیوں کی زیادہ تر بری باتوں کو۔ اسی طرح مسیحی حضرات نے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں مسیحیوں کی اچھی باتوں کو نمایاں کیا گیا ہے اور مسلمانوں کی صرف بری باتوں کو۔ یہی وجہ ہے کہ اسپین کی قدیم تاریخ کے بارہ میں مروجہ کتابوں کو پڑھ کر صحیح ذہن نہیں بنتا۔ مسلمان اور مسیحی دونوں زیادہ تر اپنے اپنے لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھتے ہیں اس لیے قدیم اسپینی تاریخ کی صحیح تصویر نہ مسلمانوں کے ذہن میں ہے اور نہ مسیحیوں کے ذہن میں۔ الا ماشاء اللہ

عرب جنرل طارق بن زیاد سات ہزار کی فوج کے ساتھ ۷۱۱ء میں اسپین میں داخل ہوا تھا۔ وہ خشکی کے راستہ سے مراکو کے ساحل پر پہنچا۔ پھر سمندری پٹی کو پار کر کے اس مقام پر اترا جس کو

جبرالٹر کہا جاتا ہے۔ اس نے شاہ لذریق (شاہ اسپین) کو شکست دے کر قرطبہ اور دوسرے شہروں کو فتح کیا۔

طارق نے اپنا یہ سفر گھوڑوں اور کشتیوں کے ذریعہ طے کیا تھا اور اس کو اس سفر میں مہینوں لگ گئے۔ میں ۲۰ نومبر کی صبح کو دہلی سے روانہ ہوا اور اسی دن اسپین کی سرزمین پر پہنچ گیا۔ یہ فرق ٹکنکل ترقی کا کرشمہ ہے۔ قدیم زمانہ کا انسان حیوانی حرکت کی رفتار سے سفر کرتا تھا۔ آج کا سفر اس رفتار کے ذریعہ طے ہوتا ہے جس کو مشینی حرکت (Powered motion) کہا جاتا ہے۔

مشینی حرکت پہلے دخانی انجن کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ پھر پٹرول سے چلنے والی کاریں بنائی گئیں۔ اب انسان ہوائی جہاز کی تیز رفتاری کے ساتھ اپنا سفر طے کرتا ہے۔ ہوائی جہاز بھی اچانک نہیں بن گیا۔ بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد وہ موجودہ ترقی یافتہ صورت تک پہنچا ہے۔

اسپین میں مسلمان صرف سیاسی فاتح کی حیثیت سے نہیں آئے بلکہ وہاں وہ تعمیر نو کے نقیب بن کر داخل ہوئے۔ اسپین کے شہروں (بلنسیہ، قرطبہ، طلیطلہ، غرناطہ) میں انھوں نے بڑے بڑے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ جہاں

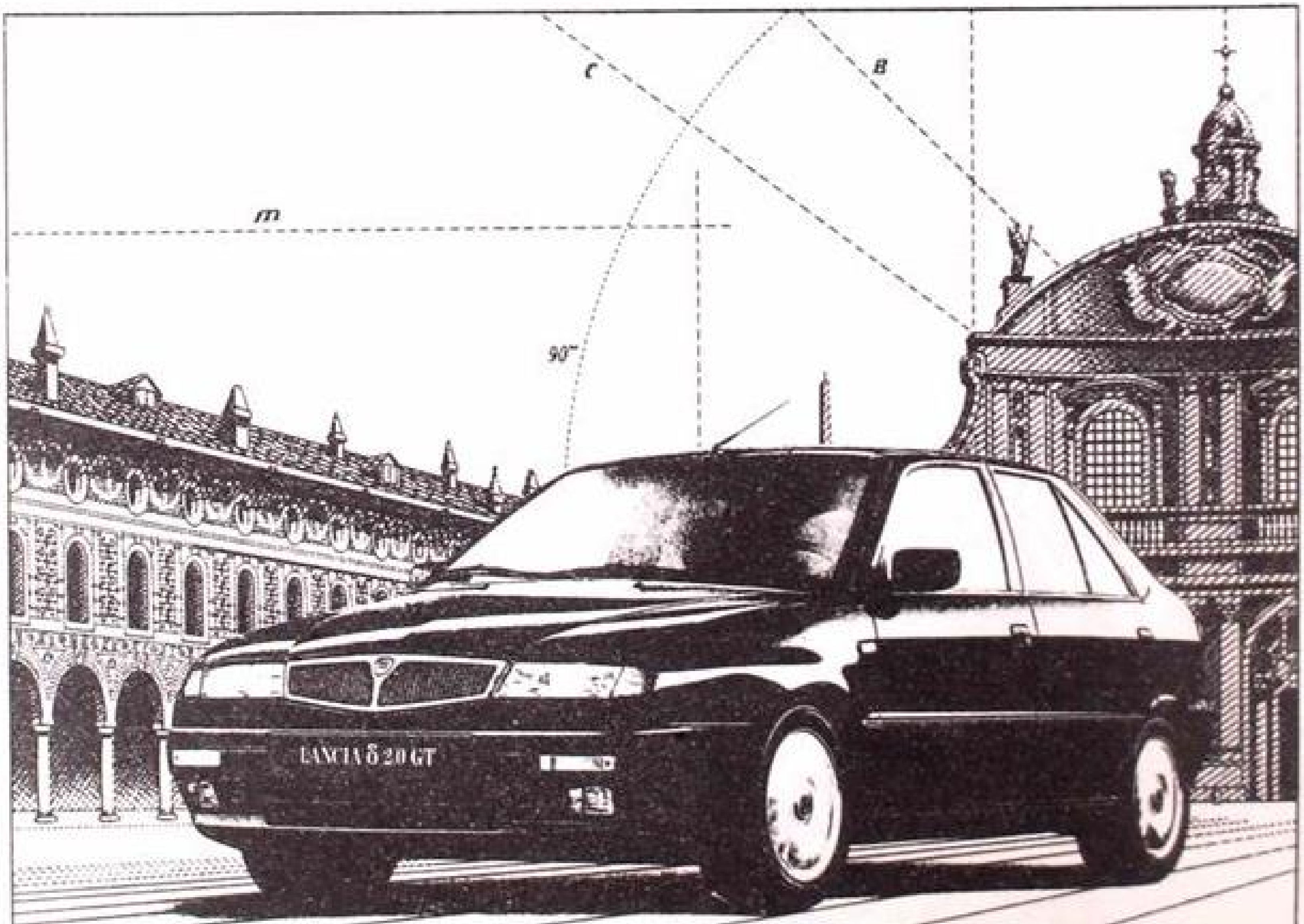

اسپین کے علاوہ دوسرے یورپی ملکوں کے طلبہ آکر علم حاصل کرتے تھے۔ انھوں نے اسپین کی زرخیز زمین میں ہر قسم کی زراعت اور صنعت قائم کر کے اس کو قابل استعمال بنایا۔ انھوں نے اسپین کی آبادیوں کو زیادہ بہتر شہری انتظام دیا۔

مسلمانوں نے اپنے دور حکومت (۷۱۱ء تا ۱۴۹۲ء) میں یہاں کی زندگی پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ آج تک اس کے اثرات ختم نہ ہو سکے۔ مثلاً اسپینی اور پرتگالی زبان میں چار ہزار ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کی اصل عربی ہے۔ اسپینی ڈکشنری اور پرتگالی ڈکشنری میں یہ الفاظ باقاعدہ طور پر داخل کر لیے گئے ہیں۔ یہاں کی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی جدید کاروں کے پیچھے جگہ جگہ مسلم طرز تعمیر کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ وغیرہ

طارق بن زیاد (فاتح اسپین) موسیٰ بن نُصیر کا ماتحت اور ان کا آزاد کردہ غلام تھا۔ ابن کثیر نے الذہبی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ طارق بن زیاد طنجہ (افریقہ) کا امیر تھا۔ وہ وہاں موسیٰ بن نُصیر کے نائب کے طور پر تھا۔ پھر جزیرۂ خضراء کے مسیحی حاکم نے اس سے اپنے دشمن کے خلاف مدد مانگی۔ اس کے بعد طارق سبتہ کے راستہ سے اندلس میں داخل ہوا۔ اس نے فرنگیوں کی باہمی لڑائی سے فائدہ اٹھایا۔ اور اندلس میں داخل ہو کر قرطبہ کو فتح کیا اور اس کے بادشاہ کو قتل کر دیا۔ پھر اس نے موسیٰ بن نُصیر کو فتح کی خبر بھیجی :

فحسده موسى على الانفراد بهذا الفتح. وكتب الى الوليد يبشره بالفتح وينسبه الى نفسه. (البدایہ والنھایہ ۹/۸۳)

طارق بن زیاد کے تنہا فاتح بننے پر موسیٰ بن نُصیر نے اس سے حسد کیا اور خلیفہ ولید کو فتح کی خوش خبری بھیجتے ہوئے اس فتح کو اپنی طرف منسوب کیا۔

مگر اس طرح کے فیصلے تاریخ کرتی ہے نہ کہ کسی کے لکھے ہوئے یا بولے ہوئے الفاظ۔ چنانچہ موسیٰ بن نُصیر کی اس تحریر کے باوجود تاریخ میں طارق بن زیاد ہی کو فاتح اسپین لکھا گیا اور اسپین کے ساحل پر وہ جس پہاڑی کے پاس اترا تھا وہ پہاڑی اسی کی طرف منسوب ہو کر جبل الطارق (جبرالٹر) کے نام سے مشہور ہوئی :

Its name is derived from the Arabic jabal Tariq (Mt. Tarik), honouring Tariq ibn Ziyad, who captured the peninsula in AD 711. (8/156)

۷۱۱ء میں اسپینی پہاڑی کا نام ایک مسلمان طارق بن زیاد کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اس کے ۱۱۴۰ سال بعد ہندستان کے پہاڑ کا نام ایورسٹ انگریز کے نام پر رکھا گیا جس کا نام سرجان ایورسٹ تھا۔ وہ انڈیا

میں تیرہ سال تک سرویر جنرل رہا۔ اسی نے پہلی بار ۱۸۵۲ میں یہ دریافت کیا کہ ایورسٹ سطح زمین پر سب سے اونچی چوٹی ہے۔

اس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ یہ دونوں واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ انیسویں صدی کے مسلمانوں کے مقابلہ میں آٹھویں صدی کے مسلمانوں میں کیا فرق تھا۔ پہلے زمانہ کے مسلمان اعلیٰ عزم و حوصلہ کے مالک تھے۔ اس لیے ان کا نام پہاڑوں کی چوٹیوں پر لکھا گیا۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں دوسری قومیں عزم و حوصلہ میں آگے بڑھ گئیں، اس لیے اب ان کا نام پہاڑوں کی چوٹیوں پر لکھا جانے لگا۔ یہ انسانی اوصاف میں فرق کا معاملہ ہے نہ کہ کسی تعصب اور سازش کا معاملہ۔

کہا جاتا ہے کہ دوسری عالمی جنگ (۴۵-۱۹۳۹) تک یورپ کے چھوٹے بڑے آٹھ سامراجی ممالک دنیا پر اپنا تسلط قائم کیے ہوئے تھے۔ مگر دوسری عالمی جنگ کے بھونچال نے ان سب کا خاتمہ کر دیا۔ یہ تھے —— برطانیہ، فرانس، جرمنی، ہالینڈ، بیلجیم، اٹلی، پرتگال اور اسپین۔

امریکہ کو دریافت کرنے والا کرسٹوفر کولمبس اٹلی میں پیدا ہوا۔ مگر اس کی وفات اسپین میں ہوئی۔ کولمبس کو اپنی سمندری مہم میں اسپین کی کوئن ازابیلا (Isabella I) سے خصوصی مدد ملی جس نے اس مہم کی سرپرستی قبول کر لی تھی۔ (9/907, 10/691)

واشنگٹن کی نیشنل گیلری آف آرٹ میں لکڑی کے تختہ پر پینٹنگ کے ذریعہ کولمبس کی مہم کا نقشہ آرٹسٹ کے تخیل کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اس کی تصویر ذیل میں درج ہے۔

امریکہ کے جنوب مشرقی علاقہ میں ایک ریاست ٹینیسی (Tennessee) ہے، ۱۹۶۵ء میں سولہویں

نیشنل گیلری آف آرٹ واشنگٹن میں لکڑی کے تختے پر پینٹنگ کے ذریعے کولمبس کی مہم جوئی کا اظہار

اسٹیٹ کی حیثیت سے یو ایس اے میں شامل کی گئی۔ اس ریاست کے پہاڑی علاقہ میں ایک قوم بستی ہے جس کو میلنجین (Melungeon) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ سیاہ فام ہوتے ہیں۔ ان کی موجودہ تعداد ایک ملین سے زیادہ ہے۔ ان کا بھی ایک آدمی کانفرنس میں شریک تھا۔

شکاگو میں ۲-۵ ستمبر ۱۹۹۴ کو چار مسلم تنظیموں کا ایک مشترک اجتماع ہوا۔ اس میں تقریباً سولہ ہزار ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ اس میں ایک ڈاکٹر کینیڈی (Dr. N. Brent Kennedy) تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ میں نے اپنے آبا و اجداد اور میلنجین لوگوں کے بارہ میں ریسرچ کی ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہمارے آبا و اجداد اسپینی مسلمان (Spanish Muslims) تھے۔ جو داروگیر (Persecution) کے زمانہ میں وہاں سے بھاگ کر امریکہ آ گئے۔ انھوں نے بتایا کہ میں اپنی قوم کی اس تاریخ پر ایک فلم بنا رہا ہوں۔

اسپین میں جو مسلمان داخل ہوئے وہ محض لینے والے بن کر وہاں نہیں گئے بلکہ دینے والے بن کر گئے۔ یہ عرب اس وقت ایک تازہ دم قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے صحرائی دنیا سے نکل کر ایک سرسبز و شاداب دنیا کو دریافت کیا تھا۔ اس دریافت نے ان کے اندر نیا ولولہ پیدا کیا۔ اسپین جیسے زرخیز ملک میں ان کو ہر قسم کے مواقع ملے۔ چنانچہ انھوں نے اس ملک کی امکانیات کو استعمال کرکے اس کو وقت کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بنا دیا۔ اس کی تفصیل بہت سی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جو لوگ صرف ایک کتاب پڑھنا چاہیں وہ درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کریں:

Philip K. Hitti, *History of the Arabs*

برٹرینڈ رسل نے اپنی کتاب (*A History of Western Philosophy*) میں لکھا ہے کہ اسپین میں عرب اقتصادیات کی ایک بہترین خصوصیت ان کی زراعت تھی۔ خاص طور پر آبپاشی کا ماہرانہ استعمال جس کو انھوں نے کم پانی کے علاقہ میں رہ کر سیکھا تھا۔ آج بھی اسپینی زراعت عربوں کے آبپاشی نظام سے فائدہ اٹھا رہی ہے:

One of the best features of the Arab economy was agriculture, particularly the skilful use of irrigation, which they learnt from living where water is scarce. To this day Spanish agriculture profits by Arab irrigation works. (p. 416)

یہ کہنا بہت عجیب ہے کہ ان مسلمانوں نے عرب کے ریگستانوں میں آبپاشی کا نیا نظام سیکھا تھا۔

اصل یہ ہے کہ وہ زندگی کے عزائم سے بھرے ہوئے تھے۔ اور جو قوم زندگی کے عزائم سے بھری ہوئی ہو وہ اسی طرح بڑے بڑے کارنامے انجام دیتی ہے۔

جے ایم رابرٹس ایک منصف مزاج مورخ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے تاریخ کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ انھیں میں سے ایک ۱۰۵۰ صفحہ کی کتاب دنیا کی تاریخ ہے :

J.M. Roberts, *The Pelican History of the World*

اس کتاب میں مصنف نے کھلے طور پر اس کا اعتراف کیا ہے کہ عربی اسپین (Arab Spain) ہی یورپ کی نشأۃ ثانیہ کا سبب تھا۔ حتی کہ انڈیا، چین اور یونان کی علمی وراثت بھی اسپینی مسلمانوں ہی کے ذریعہ یورپ تک پہنچی۔ اسطرلاب ابتدائی طور پر اگرچہ ایک یونانی ایجاد تھی۔ لیکن یہ عرب ہی تھے جو اس کو مغرب تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ جب چاسر (Chaucer) نے اسطرلاب کے استعمال پر اپنا رسالہ لکھا تو اس نے ایک عرب رسالہ کو بطور ماڈل اپنے سامنے رکھا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرون وسطی میں یورپ کسی بھی دوسری تہذیب کا اتنا احسان مند نہیں جتنا کہ اسلام کا :

To no other civilization did Europe owe so much in the Middle Ages as to Islam. (p. 511)

ایک صاحب کو عالمی نقشہ دکھاتے ہوئے میں نے کہا کہ اس کو دیکھئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یورپ اسپین کے مقام پر آگے بڑھ کر افریقہ کی مسلم دنیا سے مل رہا ہے۔ یہ ملاقات عملاً پیش آئی۔ مگر وہ زیادہ تر سیاسی اور علمی سطح پر باقی رہی۔ دعوت کی سطح پر دونوں کے درمیان زیادہ تعلق قائم نہ ہو سکا۔

چودھویں اور پندرھویں صدی کے درمیان یورپ میں ترقی کا وہ واقعہ ہوا جس کو نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کہا جاتا ہے۔ مغربی مورخین عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ یہ یونانی اور رومی تہذیب کا احیاء تھا۔ جو پہلے اٹلی میں ہوا، اور پھر دوسرے یورپی ملکوں تک پہنچا۔ مگر یہاں ایک درمیانی کڑی کو حذف کر دیا گیا ہے، اور وہ اسپین ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسپین میں قدیم تہذیبی سرمایہ کو لے کر اس میں اضافے کیے۔ اس طرح اسپین میں ایک اعلیٰ تہذیب وجود میں آئی۔ پھر یہ تہذیب اٹلی میں داخل ہو کر بقیہ یورپی ملکوں تک پہنچی۔

ترقی کے اس عمل میں اسپین کی کڑی حذف ہونے کی ذمہ داری خود اسپین پر ہے۔ پندرھویں صدی میں اسپینیوں نے مسیحی چرچ کے زیر اثر یہ مجنونانہ کام کیا کہ علم وفن کے مسلم ماہرین کو ملک سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ چونکہ مسلمان ہی اس تہذیبی عمل کو اسپین میں جاری کیے ہوئے تھے۔ اس لیے اس جبری انخلا کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین کی کڑی ٹوٹ گئی، اور اٹلی ہی کی کڑی عملاً اہل یورپ کے لیے باقی رہی۔

اس مسئلہ پر ایک اسپینی اسکالر سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ واقعات کی فطری رفتار میں جب بھی تشدد کے ذریعہ تبدیلی لانے کی کوشش کی جائے گی، ہمیشہ اسی قسم کا منفی نتیجہ نکلے گا۔ اس دنیا میں تدریجی تبدیلی ہی قابل عمل ہے۔ ریڈیکل تبدیلی صرف ایک لفظ ہے۔ اس کے نتیجہ میں عملاً جو چیز ظہور میں آتی ہے وہ صرف تخریب ہے نہ کہ تبدیلی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی اور نویں صدی عیسوی کے درمیان یورپ میں بت اور مذہبی تصویروں کے خلاف جو مہم اٹھی اس کو بھی مسلم اسپین ہی سے تحریک ملی تھی (ان الدعوۃ الی نبذ الصور والتماثیل کانت متأثرۃ بالاسلام)

کلودیس (Claudius) کو ۸۲۸ء میں تورین کا اسقف مقرر کیا گیا۔ وہ مذہبی تصویروں کو غیر مقدس قرار دینے میں اتنا شدید تھا کہ وہ اس قسم کی تصویروں اور صلیبوں کو جلا دیا کرتا تھا اور اپنے چرچ میں اس کی عبادت کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ یہ کلودیس اندلس میں پیدا ہوا اور وہیں اس کی پرورش ہوئی (ولد وربی فی الاندلس الاسلامیۃ) ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ۳۹-۱۳۸

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کی مسلم سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد عیسائی حکمرانوں نے یک طرفہ طور پر مسلمانوں کو مارنا اور بھگانا شروع کر دیا۔ مگر بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ اس وقت مسلمان اسپینیوں کے لیے بہترین مزدور اور بہترین کاریگر کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے ان کے صنعت و حرفت اور زراعت و باغبانی کے نظام کو ترقی دی تھی اور اس کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اس لیے اسپینیوں کو عام مسلمانوں سے وہ نفرت نہیں ہو سکتی تھی جو ان کو سیاسی حکمرانوں سے تھی۔

مگر مسلم حکومت کے خاتمہ کے بعد ان مسلمانوں نے عیسائی حکومت کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ بار بار ان کے خلاف بغاوت کرتے رہے۔ اگرچہ ناکافی تیاری کی بنا پر وہ ہر بار کچلے جاتے تھے۔ مزید یہ کہ اسپین کی مذہبی مخالفت کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں تھا بلکہ وہ تمام غیر عیسائی مذاہب سے تھا۔

چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ اسپینی یہودی بھی یکساں عتاب کا نشانہ بنے۔

غرناطہ کی موجودہ آبادی ڈھائی لاکھ ہے۔ اس میں تقریباً ایک ہزار اسپینی مسلمان ہیں۔ ان مسلمانوں کو حکومت وقت کی طرف سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں۔ وہ اپنی شخصیت کو چھپائے بغیر آزادی کے ساتھ شہر میں رہتے ہیں۔ ۱۹۹۳ میں غرناطہ کے مسلمانوں نے عید الفطر کی نماز الحمراء میں ادا کی۔

ایک صاحب نے بتایا کہ اسپین کے ٹی وی سسٹم نے اس نماز کی مکمل فلم بندی کی تھی۔ اس کو ٹی وی کے نیشنل پروگرام کے تحت براڈ کاسٹ کیا گیا جس کو پورے ملک میں نہایت شوق کے ساتھ دیکھا گیا۔

کچھ لوگ اسپین کی تصویر اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے کہ سارا اسپین مسلمانوں کا دشمن بن گیا تھا۔ مگر یہ واقعہ کے خلاف ہے اور فطرت کے خلاف بھی۔ اصل یہ ہے کہ وہاں تین طبقے تھے۔ ایک، مذہبی طبقہ، دوسرے، حکمراں طبقہ، تیسرے، عوام۔

یہ صحیح ہے کہ مذہبی طبقہ (مسیحی چرچ) مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کا دشمن بن گیا تھا۔ اور چونکہ اس زمانہ میں وہاں مذہبی طبقہ کا بہت اثر تھا اس لیے انھوں نے دونوں فرقوں پر کافی ظلم بھی کیا۔ مگر حکمراں طبقہ کے دل میں مسلمانوں کے لیے وہ نفرت نہ تھی۔ کیوں کہ مسلمان ان کے ملک کی ترقی کا سبب بنے ہوئے تھے۔

مثال کے طور پر تاریخ بتاتی ہے کہ چرچ کے لوگوں نے جامع قرطبہ کے کچھ ستونوں کو گرایا اور اس کے ایک حصہ میں چرچ بنا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے چارلس پنجم (۱۵۰۰ — ۱۵۵۸ء) کو اس چرچ کے افتتاح کے لیے بلایا۔ مگر شاہ اسپین جب وہاں آیا اور مسجد کے بقیہ حصہ کو دیکھا تو وہ بہت غضب ناک ہوا۔ اس نے کہا میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ مسجد اتنی خوب صورت اور اتنی عالی شان ہے۔ اگر میں جانتا تو تم کو ہرگز اسے توڑنے کی اجازت نہ دیتا۔ کیوں کہ اس کے ایک حصہ کو توڑ کر تم نے جو چرچ بنایا ہے وہ تم دوسری جگہ بھی بنا سکتے تھے۔ مگر یہ مسجد تو ایک ایسی نادر عمارت ہے جس کی دوسری مثال سارے عالم میں موجود نہیں۔

چارلس پنجم نے اہل کلیسا کے زیر اثر ۱۵۲۵ء میں بلنسیہ اور اراغون کے مسلمانوں کے نام یہ حکم جاری کیا کہ وہ اپنی زبان، مذہب، لباس، عادات کو ترک کر کے مکمل طور پر عیسائی ہو جائیں، ورنہ ان کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اس کے بعد ۱۵۲۸ میں بلنسیہ کے بارہ افراد کا ایک وفد بادشاہ سے ملا اور اس سے درخواست کی کہ اس حکم کو واپس لے لیا جائے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس حکم کا نفاذ روک دیا۔ اس

کی وجہ یہ تھی کہ یہ مسلمان اپنی محنت اور اپنی مہارت کی بنا پر وہاں کے زمینداروں اور جاگیرداروں کے لیے قیمتی سرمایہ تھے۔ وہ ڈرتے تھے کہ اگر مسلمانوں کو نکال دیا گیا تو ان کے کھیت اور باغ ویران ہو جائیں گے اور ان کی اقتصادیات پر اس کا نہایت مضر اثر پڑے گا۔

مسلم اقتدار کے خاتمہ کے بعد مسجد قرطبہ کے ایک حصہ کو عیسائیوں نے چرچ میں تبدیل کر دیا۔ مگر اس کا سبب عیسائیوں کے ظلم کے ساتھ خود مسلمانوں کی نادانی بھی تھی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اسپین میں ایک مسیحی پیشوا سینٹ ونسنٹ (Saint Vincent Ferrer) گزرا ہے۔ مسیحیوں نے اس کے نام پر قرطبہ میں دریا کے کنارے ایک چرچ تعمیر کیا تھا۔ اس علاقہ پر سیاسی قبضہ کے بعد مسلمانوں نے عین اسی چرچ کی جگہ اپنی مسجد بنادی۔ اس طرح اس مسجد کے ساتھ غیر ضروری طور پر نزاع کی حالت قائم ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ بعد کو ۷۸۶ء میں سلطان عبدالرحمٰن الداخل نے عیسائیوں کو راضی کر کے اس جگہ کو خرید لیا اور وہاں مزید توسیع کے ساتھ عظیم مسجد قرطبہ کی تعمیر کی۔ اس تعمیر پر دو سال میں ۸۰ ہزار دینار خرچ ہوئے۔ عیسائیوں کو جب دوبارہ سیاسی غلبہ ملا تو انھوں نے مسجد کے توسیعی حصہ کو تو چھوڑ دیا۔ مگر سینٹ ونسنٹ چرچ کی ابتدائی جگہ کو دوبارہ انھوں نے گرجا میں تبدیل کر دیا۔

اسپین میں مسلم سلطنت کے خاتمہ کے بعد مسیحیوں نے بہت سی مسجدوں کو چرچ بنا دیا تھا۔ اس کا دفاع کرتے ہوئے بعض مغربی مصنفین نے لکھا ہے کہ یہ مسیحیوں کی طرف سے جوابی کارروائی تھی۔ مسلمانوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں کثیر تعداد میں چرچ کو مسجد میں تبدیل کر دیا تھا۔ چنانچہ مسیحیوں کو جب غلبہ حاصل ہوا تو انھوں نے دوبارہ ان مسجدوں کی جگہ پر اپنے چرچ بنا دیے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا مفتی محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں :

"اسلام میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر کوئی علاقہ مسلمانوں نے صلح سے نہیں بلکہ بزور شمشیر جنگ کے ذریعہ فتح کیا ہو تو وہاں کی زمینوں اور عمارتوں پر انھیں شرعاً مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اس اختیار میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ غیر مسلموں کی کسی عبادت گاہ کو ضرورۃً ختم کر دیں، یا مسجد میں تبدیل کر لیں۔ اس کے باوجود مسلمان فاتحین نے اس شرعی اختیار کو بہت کم استعمال کیا۔ بعض مقامات پر کسی ضرورت یا مصلحت کے تحت کلیسا کو مسجد بنایا گیا۔" اندلس میں چند روز، صفحہ ۲۱

یہ بات صحیح نہیں۔ "بزور شمشیر فتح" کا مذکورہ حکم صرف اس وقت ہے جب کہ فریق ثانی خود جارحیت

کرے اور اس کے نتیجہ میں جنگ پیش آئے۔ جب کہ معلوم ہے کہ اسپین نے اس قسم کا کوئی جارحانہ اقدام نہیں کیا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جارحیت کی صورت میں بھی مذکورہ شرعی مسئلہ کا تعلق صرف زمینوں اور عمارتوں سے ہے۔ اس میں عبادت خانہ شامل نہیں ہے۔ کسی قوم کے عبادت خانہ کو توڑنا صرف اس وقت جائز ہے جب کہ اس کو بنانے والے سب کے سب اسلام قبول کرکے نمازی بن گئے ہوں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جس طرح ایک انسان کو ناحق مارنا گویا تمام انسانوں کو مارنا ہے۔ اسی طرح کسی ایک عبادت گاہ کو ڈھانا گویا تمام عبادت گاہوں کو ڈھانا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں کمیت قابل لحاظ نہیں ہوتی۔

اسپین سے مسلمانوں کا کلی انخلاء نہ کبھی ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ مسلم حکمرانوں نے اپنے زیر قبضہ اسپین میں غیر مسلموں سے انتہائی رواداری اور انصاف کا معاملہ کیا تھا۔ مسلمانوں کی علمی ترقیوں سے مقامی آبادی اتنا زیادہ متاثر تھی کہ لوگ اسی طرح عربی لکھنے اور بولنے کو فخر سمجھتے تھے جس طرح برٹش حکومت کے دور میں ہندستان کے لوگ انگریزی لکھنے اور بولنے کو فخر سمجھنے لگے تھے۔ اسپینیوں کی ایک بڑی تعداد مستعرب (Mozarab) بن گئی تھی۔ یہ تقریباً اسی قسم کے لوگ تھے جیسے مغل دور میں ہندستان کے کائستھ۔ مسلمان اسپین کی زراعت اور صناعت کے لیے بہترین کاریگر اور ماہرین فراہم کر رہے تھے۔ اسپینیوں کی ایک قابل لحاظ تعداد نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ حتی کہ خود اسپین کے مسیحی حکمرانوں میں کئی حکمراں ایسے تھے جو مسلمانوں کے حق میں اپنے دل کے اندر نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اس طرح کے مختلف طاقت ور اسباب اس میں مانع تھے کہ مسلمانوں کو مکمل طور پر اسپین سے باہر نکال دیا جائے۔

تقریباً تین لاکھ (300,000) مورسکو (Moriscos) جو اسپین سے نکالے گئے وہ بھی قانون فطرت کے مطابق، عسر میں یسر کی مثال بن گئے۔ یہ لوگ اسپین سے نکل کر زیادہ تر الجیریا، تیونس اور مراکو میں بسے تھے۔ ان کا یہ آنا ان ملکوں میں اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن گیا۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ ان افریقی ملکوں میں تبلیغ اسلام کے لیے یہاں قادریہ سلسلۂ تصوف کی ایک خانقاہ ساقیۃ الحمراء کے نام سے قائم تھی۔ مگر وہ زیادہ کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ مسلم مذہب کو ان افریقیوں کے اندر داخل کرنے کا کارنامہ ان اسپینی مسلمانوں نے انجام دیا جو ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کی حکومت کے خاتمہ کے بعد اسپین سے نکال دیے گئے تھے :

But the honour of winning an entrance among them for the Muslim faith was reserved for a number of Andalusian Moors who were driven out of Spain after the taking of Granada in 1492. (p. 129)

اقبال کو دو بار اسپین کے علاقہ میں جانے کا موقع ملا۔ پہلی بار ۱۹۰۸ میں جب یورپ کے ایک سفر کے دوران وہ اسپین کے ساحل (سسلی) سے گزرے۔ اس پر انھوں نے ایک تاثراتی نظم بھی لکھی تھی جو ان کے مجموعہ کلام میں شامل ہے۔

اسپین کے لیے اقبال کا دوسرا سفر جنوری ۱۹۳۲ میں ہوا۔ اس وقت تیسری گول کانفرنس لندن میں ہوئی تھی۔ اس میں شرکت کے لیے جو لوگ ہندستان سے گئے ان میں سے ایک اقبال بھی تھے۔ کانفرنس سے فراغت کے بعد وہ پیرس ہوتے ہوئے غالباً ۵ جنوری کو اسپین میں داخل ہوئے اور اپنے تین ہفتہ کے قیام میں میڈرڈ اور غرناطہ اور قرطبہ کو دیکھا۔

اقبال کو اسپین کے علاوہ دوسرے کئی ملکوں کے سفر کا موقع ملا۔ چنانچہ وہ فخر کے ساتھ کہتے ہیں: بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے (بال جبریل)۔ مگر صرف کسی ملک کا سفر کرنا یا اس کو دیکھنا اس ملک کو جاننے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ایک سفر میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ وہ انجینیر تھے اور یورپ کی ایک شپنگ کمپنی میں ۲۰ سال سے ملازم تھے۔ انھوں نے دنیا کے اکثر ملکوں کا سفر کیا تھا۔ مگر جب میں نے گفتگو کی تو اندازہ ہوا کہ عالمی زندگی کے کسی بھی پہلو پر وہ کوئی گہری واقفیت نہیں رکھتے

اصل یہ ہے کہ ایک سائنس داں کے الفاظ میں، آدمی کو پیشگی طور پر ایک تیار ذہن (Prepared mind) ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ہی وہ کسی چیز کو حقیقی طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ تاریخ اور دوسرے علوم کے گہرے مطالعہ سے آدمی ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہو چکا ہو۔ اس کے بعد ہی وہ کسی ملک کو گہرائی کے ساتھ جان سکتا ہے یا وہاں کے سفر سے کوئی حقیقی بات دریافت کر سکتا ہے۔

۱۹۰۸ میں اقبال نے اسپین کے ساحل کو دیکھ کر کہا تھا:

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار   وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

یہ محض ایک شاعرانہ تخیل ہے نہ کہ واقعی معنوں میں کوئی تاریخی واقعہ۔ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ اسپین کبھی بھی "تہذیب حجازی" کا مزار نہیں بنا۔ وہاں سے بعض مسلم خاندانوں کا سیاسی اقتدار ضرور ختم ہوا۔ مگر جہاں

تک حجازی تہذیب یا اسلام کا معاملہ ہے اس کا وجود خاندانی اقتدار کے خاتمہ کے بعد بھی اسپین میں باقی تھا اور آج بھی وہ وہاں موجود ہے۔

اقبال نے فاتح اسپین طارق بن زیاد کے بارہ میں لکھا ہے کہ طارق نے جب اندلس کے ساحل پر اپنی کشتی کو جلا دیا تو لوگوں نے کہا کہ عقل کی نظر میں یہ تم نے غلط کام کیا:

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت گفتند کارِ تو بہ نگاہ خرد خطاست

حالانکہ کشتیوں کو جلانے کا یہ افسانہ بالکل بے بنیاد ہے۔ اور وہ کسی بھی قابل اعتماد تاریخی کتاب میں موجود نہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الرسالہ مئی ۱۹۸۹)

اسی طرح اقبال اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں:

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

یہ بھی اقبال کی ایک تاریخی بھول ہے۔ کسی ابن بدرون نے کبھی غرناطہ کا مرثیہ نہیں لکھا۔ اصل یہ ہے کہ ابن عبدون الفہری (م ۵۲۹ ھ) ایک اسپینی شاعر تھا۔ اس کا تعلق بطلیوس (Badajoz) کے مسلم حکمراں متوکل بن المظفر سے تھا جو ملوک الطوائف میں سے ایک تھا۔ ابن عبدون اسی متوکل کا وزیر تھا اور شاعر بھی تھا۔ متوکل بن المظفر کو یوسف بن تاشفین نے اس کے دو بیٹوں سمیت مروا دیا تھا۔ اس المیہ پر ابن عبدون نے عربی میں ایک مرثیہ لکھا۔ اس مرثیہ کا تعلق سقوط بطلیوس سے تھا نہ کہ سقوط غرناطہ سے۔

ابن عبدون کے اس مرثیہ کی شرح ایک صاحب نے کی جو شاعر نہیں تھے بلکہ صرف عالم تھے۔ ان کا نام ابن بدرون (عبد الملک بن عبد اللہ بن بدرون) تھا۔ انھوں نے ۶۰۸ھ میں وفات پائی۔

مسجد قرطبہ پر اقبال کی طویل نظم کا ایک مصرعہ یہ ہے: کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق۔ اس طرح کے بہت سے اشعار اقبال کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے اپنے بارہ میں کہا:

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی برہمن زادۂ دانائے رمز روم و تبریز است

اسی طرح وہ اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"۔ حتی کہ ان کی ایک تعریفی نظم رام کے بارہ میں بھی ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز اہلِ وطن سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اقبال کے اس قسم کے اشعار کو اُس زمانہ میں برا نہیں مانا گیا۔ لیکن اس طرح کی بات اگر آج کوئی لکھے

تو خود اقبال کے پرستار یہ کہیں گے کہ دیکھو اس شخص کو، یہ ہندو کا آلۂ کار بن گیا ہے۔ یہ مسلمانوں کا تشخص مٹانا چاہتا ہے۔

عبد المجید بن عبد اللہ بن عبدون الفہری (م ۵۲۹ھ) اندلس کے ایک ممتاز عالم اور ادیب ہیں۔ ان کے بارے میں بہت سے قصے مشہور ہیں۔ ابو مروان عبد الملک ایک وزیر تھے۔ ان کے لڑکے ابوبکر ایک کاتب سے "کتاب الاغانی" کی کتابت کروا رہے تھے۔ درمیان میں ایک روز انھیں کتابت شدہ حصہ کو اصل نسخہ سے ملاکر اس کی تصحیح کرنا تھا۔ اس وقت کتابت کا اصل نسخہ موجود نہ تھا۔ انھوں نے کسی آدمی کو اصل نسخہ لانے کے لیے باہر بھیجا تھا۔

اس درمیان میں ایک بوڑھا آدمی وہاں آگیا جو بظاہر غیر اہم تھا۔ بات چیت کے دوران اس کو معلوم ہوا کہ ابوبکر کے ہاتھ میں کتاب الاغانی ہے اور وہ مقابلہ کرکے اس کی تصحیح کرنے کے لیے اصل نسخہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ بوڑھے آدمی نے کہا کہ میں بولتا ہوں، تم اپنی کتاب کھول کر ملالو۔ ابوبکر نے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کتاب ہے۔ بوڑھے آدمی نے کہا کہ کتاب تو نہیں ہے، البتہ یہ کتاب مجھ کو یاد ہے۔ اس کے بعد بوڑھے آدمی نے اپنے حافظہ سے کتاب پڑھنا شروع کیا اور ابوبکر اپنے کتابت شدہ نسخہ کو کھول کر اس سے ملانے لگے۔ ابوبکر کو سخت حیرت ہوئی جب انھوں نے دیکھا کہ ایک لفظ کے فرق کے بغیر بوڑھا آدمی کتاب کو دہرائے چلا جارہا ہے۔

ابوبکر حیرانی کے عالم میں گھر کے اندر گئے اور اپنے باپ کو پورا قصہ سنایا۔ ان کے باپ ابومروان عبد الملک ننگے پاؤں بھاگ کر باہر آئے۔ انھوں نے اس بوڑھے آدمی کو گلے سے لگایا۔ ان کی ضیافت کی اور پھر اعزاز کے ساتھ سواری دے کر انھیں رخصت کیا۔ ان کے جانے کے بعد بیٹے نے پوچھا کہ یہ بوڑھا آدمی کون تھا۔ باپ نے جواب دیا کہ تمہارا برا ہو، یہ اندلس کے ادیب اور علم ادب میں اس کے سردار ابن عبدون ہیں (ویحك هذا اديب الاندلس وسيدها فى علم الادب، هذا ابومحمد عبد المجيد بن عبدون) الاعلام ۴/۱۴۹

اسپین کے مسلم عہد میں جو بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں ان میں سے ایک ابن حزم ہیں۔ وہ قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا زمانہ ۳۸۴ھ اور ۴۵۶ھ کے درمیان ہے۔ یہ زمانہ مسلم اسپین کا انتہائی اختلاف کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ کے اندلس میں مالکی فقہا کا غلبہ تھا جو قیاس سے کام لینے میں حد سے تجاوز کر گئے تھے۔

ابن حزم نے سمجھا کہ فقہ میں قیاس کو داخل کرنا بس یہی اختلاف اور بگاڑ کا اصل سبب ہے۔ چنانچہ وہ قیاس کے منکر ہو گئے اور صرف ظاہر پر زور دینا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب کا نام ہے : ابطال القیاس والرائے والاستحسان والتعلیل۔

ابن حزم نے لکھا کہ إن اللّٰہ تعالیٰ یقول : وما اختلفتم فیہ من شیئ فحکمہ الی اللّٰہ۔ ولم یقل سبحانہ وتعالیٰ فحکمہ الی الرائ والقیاس (الاحکام فی اصول الاحکام ۸/۵۳)

اس ظاہری مسلک کی بنا پر ابن حزم بہت زیادہ نزاعی شخصیت بن گئے۔ وہ کئی بار قید کیے گئے۔ ان کی تکفیر وتضلیل کی گئی۔ ان کی کتابیں جلا دی گئیں۔ حتی کہ ان کی لکھی چار سو کتابوں میں سے اب بمشکل چالیس کتابیں دنیا میں باقی ہیں۔

اس موضوع پر ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ابن حزم کا کیس دراصل انتہاپسندی کا کیس ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُس زمانہ کے فقہا کثرت سے قیاس کا غلط استعمال (سوء استخدام) کر رہے تھے۔ لیکن اگر تمام فقہی کتابیں جلا دی جائیں اور صرف قرآن وحدیث دنیا میں رہ جائے تب بھی غلط استعمال کی برائی باقی رہے گی۔ کیونکہ غلط استعمال کا سبب متن میں نہیں ہوتا بلکہ آدمی کے اپنے ذہن میں ہوتا ہے۔

میں نے مزید کہا کہ فقہا اسلام نے چار چیزوں کو مصادر شریعت قرار دیا ہے —— قرآن، سنت، اجماع، قیاس۔ میں سمجھتا ہوں کہ حدیث کے الفاظ کی اتباع کی جائے تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مصادر شریعت تین ہیں : قرآن، سنت اور اجتہاد۔ اجتہاد سے مراد آزادانہ رائے نہیں ہے، بلکہ وہ رائے ہے جو قرآن وسنت کی بنیاد پر مخلصانہ طور پر قائم کی گئی ہو۔ اجتہاد کے مختلف درجے ہیں۔ انھیں درجات کا نام قیاس اور اجماع ہے۔

قاضی مُنذِر بن سعید قرطبہ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ۳۶۶ھ میں قُرطبہ میں ان کی وفات ہوئی۔ وہ علم اور زہد دونوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ اپنے زمانہ کے اندلس میں وہ قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مقرر ہوئے۔ اور آخر تک اس عہدہ پر قائم رہے۔

ابن الاثیر نے اپنی کتاب الکامل فی التاریخ میں ۳۶۶ھ کے حالات کے تحت لکھا ہے کہ سلطان عبد الرحمٰن الناصر نے جب الزہراء کا محل تعمیر کر لیا تو ایک دن وہ اپنے سونے کے تخت پر

بیٹھا۔ دربار میں بڑے بڑے لوگ جمع تھے۔ سلطان نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا تم نے سنا ہے کہ کبھی کسی نے ایسا عالی شان محل بنایا ہو۔ حاضرین نے کہا کہ ہم نے نہ ایسا دیکھا اور نہ ایسا سنا (لم نر ولم نسمع بمثلہ) لوگوں نے خوب تعریف کی مگر قاضی منذر سر جھکائے بیٹھے رہے۔

آخر میں سلطان نے قاضی منذر سے بولنے کے لیے کہا۔ قاضی منذر رو پڑے اور ان کے آنسو ان کی داڑھی تک آ گئے۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم، میرا یہ گمان نہیں تھا کہ شیطان تمہارے اوپر اتنا زیادہ قابو پا جائے گا کہ وہ تم کو کافروں کے درجہ تک پہنچا دے۔ سلطان نے کہا کہ دیکھئے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور کیسے آپ مجھے کافروں کے درجہ تک پہنچا رہے ہیں۔ اس کے بعد قاضی منذر نے قرآن سے سورہ الزخرف کی آیات ۳۳- ۳۵ پڑھیں۔ ان آیتوں کو سن کر سلطان عبد الرحمٰن سخت غمگین ہوا اور رونے لگا۔ اس نے کہا کہ اللہ آپ کو بہتر جزا عطا فرمائے۔ اور مسلمانوں میں آپ جیسے بہت لوگ پیدا کرے۔

اسی طرح ایک بار اندلس میں قحط پڑا۔ سلطان عبد الرحمٰن نے ایک آدمی کو قاضی منذر کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ قاضی صاحب بارش کے لیے دعا کریں۔ قاضی منذر نے قاصد سے پوچھا کہ سلطان خود کیا کر رہے ہیں۔ قاصد نے کہا کہ میں ان کو اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ انھوں نے شاہی لباس اتار کر معمولی کپڑے پہن لیے تھے اور زمین پر سر رکھ کر یہ کہہ رہے تھے کہ خدایا، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے، کیا تو میری وجہ سے لوگوں کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔

قاضی منذر نے شاہی قاصد سے کہا کہ تم بارش لے کر جاؤ۔ کیوں کہ جب زمین کا بادشاہ عاجزی اختیار کرتا ہے تو آسمان کا بادشاہ رحم فرماتا ہے۔ اس کے بعد قاضی منذر باہر نکلے اور استسقاء کی نماز پڑھی۔ پھر منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی۔ لوگ تقریر سن کر رونے لگے۔ جب وہ گھر لوٹے تو بارش شروع ہو چکی تھی (المجلد الثامن، صفحہ ۵، ۶، ۷)

اس موضوع پر ایک صاحب سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ بعد کے دور میں علماء کے درمیان یہ غلط روایت چل پڑی کہ لوگوں نے حکومت میں عہدہ لینے کو کمتر سمجھ کر اسے چھوڑ دیا۔ یہ عالم کے مفاخر میں شمار ہونے لگا کہ اس کو حکومت نے عہدہ کی پیش کش کی اور اس نے اسے ٹھکرا دیا۔ حالاں کہ یہ پیغمبرانہ سنت کے خلاف ہے۔ کیوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے مشرک بادشاہ کے یہاں عہدہ قبول کیا۔

میں نے کہا کہ یہ روش اسلامی مزاج کے مطابق نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علما، صالحین اور حکمرانوں کے بیچ میں دوری قائم ہوگئی۔ اس دوری کے نتیجہ میں بہت سے اعلیٰ مواقع استعمال ہونے سے رہ گئے۔ اسلام کی بعد کی تاریخ کا یہ ایک افسوس ناک باب ہے کہ رجاء بن حیوہ اور قاضی ابو یوسف اور قاضی منذر اور شیخ احمد سرہندی جیسی مثالیں اس میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

اسپین کے مسلم عہد میں جو بڑے بڑے دماغ اٹھے ان میں سے ایک ممتاز نام ابن الطفیل کا ہے۔ وہ ۱۱۰۰ء میں اندلس میں وادی آش (Guadix) میں پیدا ہوا۔ ۱۱۸۵ء میں مراکش میں اس کی وفات ہوئی۔ الموحدین کا سلطان، ابو یوسف المنصور اس کے جنازہ میں شریک ہوا۔ ابن الطفیل ایک فلسفی اور طبیب تھا۔ اس کی تعلیم غرناطہ میں ہوئی۔ وہ ایک اوریجنل فکر رکھنے والا فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے حالات پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سے فرانسیسی مصنف لیون غوتیہ (Leon Gauthier) کی کتاب بہت اہم سمجھی جاتی ہے۔

اس کی ایک نسبتاً مختصر کتاب حیّ بن یقظان کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اس کا مطلب ہے زندہ ابن بیدار (The living one, son of the vigilant) یہ ایک فلسفیانہ کہانی ہے۔ ایک انسان بچپن سے لے کر بڑی عمر تک خالص فطرت کے ماحول میں رہتا ہے۔ اس کا کسی انسان سے سابقہ پیش نہیں آتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی فطرت اور کائنات کے بے آمیز مطالعہ کے ذریعہ خدا کو پالیتا ہے۔ ابن طفیل اس دل چسپ کہانی کے ذریعہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ خدا ایک حقیقت ہے اور عین عقل انسانی کا تقاضا ہے۔

حیّ بن یقظان ہی کے نمونہ پر بعد کو رابن سن کروسو (Robinson Crusoe) لکھی گئی۔ ابن طفیل کی اس کتاب کا ترجمہ تقریباً ستر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ڈچ زبان میں اس کا ترجمہ ۱۶۷۲ء میں ہوا۔ روسی زبان میں ۱۹۲۰ میں، اسپینی زبان میں ۱۹۳۴ میں۔ اس عربی کتاب کا پہلا ترجمہ لاطینی زبان میں ۱۶۷۱ء میں ہوا۔ یہ ترجمہ ایڈورڈ پوکوک (Edward Pococke) نے کیا تھا۔

مسلم اسپین میں ادب و شاعری کو بہت فروغ ہوا۔ چنانچہ کثیر تعداد میں شعرا پیدا ہوئے۔ خود اسپین کا پہلا اموی حکمراں عبد الرحمٰن الداخل بھی شاعر تھا۔ خلیفہ عبد الرحمٰن الناصر (الثالث) کے دربار کا ایک شاعر اس کے دور کی تعریف میں کہتا ہے کہ اللہ نے اسلام کا راستہ واضح کر دیا۔ اور لوگ دین میں جوق درجوق داخل ہو گئے :

قد اَوضح اللّٰہُ للاسلام مِنهاجا   والناسُ قد دخلوا فی الدین افواجا

دوسرا شاعر مسلم سلطنت کے خاتمہ کے بعد کہتا ہے کہ کیا یہ شہر دینِ اسلام کا محفوظ قلعہ نہ تھا۔ مگر خدا نے اس کو ذلیل کر دیا :

الم تک معقلا للدین صعبا   فذلّلہُ کما شاء القدیر

ایک اور شاعر کے مرثیہ کا ایک شعر یہ ہے کہ ہر چیز جب مکمل ہو جاتی ہے تو اس میں نقص کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس لیے کسی آدمی کو خوش گوار زندگی سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے :

لکل شیئٍ اذا ما تمّ نقصانُ   فلا یغُرّ بطیبِ العیش انسانُ

یہ تین اشعار نہ صرف اسپین کے مسلم دور کی تصویریں ہیں۔ بلکہ اس میں پوری دنیا میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا نقشہ دیکھا جا سکتا ہے۔

اندلس میں دوسری ترقیوں کے ساتھ فن موسیقی اور آلات موسیقی کی بھی کافی ترقی ہوئی۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میں نے عبد العزیز بن عبد الجلیل کی کتاب الموسیقا الاندلسیۃ المغربیۃ دیکھی۔ یہ کتاب ۱۹۸۸ میں کویت سے چھپی ہے۔ وہ ۲۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ تاہم اس موضوع سے ناآشنا ہونے کی بنا پر وہ میری سمجھ میں زیادہ نہ آسکی۔

اسپین کی مسلم سلطنت کے زوال کے بعد جب ان حکمرانوں کی بنائی ہوئی عمارتیں کھنڈر یا غیر آباد ہو چکی تھیں۔ ان کے محلوں اور باغوں میں انسانوں کے بجائے جانور رہنے لگے تھے۔ اس زمانہ میں ۴۳۵ھ میں ابو الحزم بن محمد بن جھور کا گزر مدینۃ الزہراء سے ہوا۔ اس نے جب شاہی دور کی ان برباد عمارتوں کو دیکھا تو اس پر ایک عجیب حیرت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنے تاثر کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے :

قلتُ یوماً لدارِ قومٍ تفانوا   این سُکّانکِ العزاز علینا

فاجابت ھنا اقاموا قلیلا   ثم ساروا ولستُ اعلم اینا

یعنی وہ قوم جو فنا ہو گئی، میں نے ایک دن اس کے مسکن سے پوچھا۔ تمہارے وہ مکین کہاں گئے جو ہم کو بہت عزیز تھے۔ اس نے جواب دیا کہ تھوڑے دن وہ یہاں ٹھہرے تھے۔ پھر وہ چلے گئے اور مجھ کو نہیں معلوم کہ وہ کدھر گئے (نفح الطیب)

یہ صرف مدینۃ الزہراء کے مکینوں کی کہانی نہیں، یہی تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ اس

دنیا میں جو بھی آتا ہے، تھوڑی مدت کے بعد وہ اس طرح یہاں سے چلا جاتا ہے کہ اس کے چھوڑے ہوئے کھنڈروں کے سوا کوئی اور نشان اس کا یہاں باقی نہیں رہتا۔

اسپینی زبان میں ابھی تک ایک مثل ہے جس کا ترجمہ عربی میں ایک شخص نے اس طرح کیا : کل من احبّه اللّٰہ رزقه منزلاً فی اشبیلیه (جس آدمی سے خدا محبت کرتا ہے، اس کو اشبیلیہ میں ایک مکان دے دیتا ہے)

یہ مثل اس وقت بنی جب اشبیلیہ (اور دوسرے اندلسی شہروں میں) مسلم تمدن کا غلبہ تھا۔ اس وقت یہ شہر عمدہ مکانات، سڑکیں، باغات اور صاف ستھری زندگی کے لیے ایک عالمی نمونہ بنے ہوئے تھے۔

المعتمد بن عباد اسی اشبیلیہ کا حکمراں تھا۔ یہاں ابھی تک ایک قدیم عمارت الکازار کے نام سے ہے۔ جو القصر کی اسپینی صورت ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عرب نے فخر کے ساتھ اس واقعہ کو دہرایا کہ ملوک الطوائف کے زمانہ میں جب عیسائیوں کے حوصلے بڑھ گئے اور المعتمد بن عباد نے افریقہ کے حکمراں یوسف بن تاشفین کو مدد کے لیے بلایا۔ اس وقت ایک مسلمان نے اس کو یہ کہہ کر ڈرایا کہ جب یوسف بن تاشفین یہاں اپنی فوجوں کو لے کر آئے گا تو وہ تم کو بے دخل کر کے خود تمہاری سلطنت پر قبضہ کر لے گا۔ المعتمد نے جواب دیا: رعی الجمال ولا رعی الخنازیر۔ یعنی اگر میں ایک عرب بادشاہ کا قیدی بن کر اس کا اونٹ چراؤں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ میں ایک فرنگی بادشاہ کا قیدی بن کر اس کی خنزیروں کو چراؤں۔

ایک صاحب نے فخر کے ساتھ اس قول کو دہرایا۔ میں نے کہا کہ انسانوں کو "اونٹ" اور "خنزیر" میں بانٹنا یہ خالص قومی مزاج ہے۔ مومن کا مزاج داعیانہ مزاج ہوتا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو اللہ کے بندوں کے روپ میں دیکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی غیر داعیانہ مزاج اندلسی مسلمانوں کی تباہی کا سبب بنا۔ عیسائیوں کو "خنزیر" سمجھنے کے بجائے اگر وہ ان کو "مدعو" سمجھتے تو شاید اسپین کی تاریخ دوسری ہوتی۔

ایک عرب سیاح نے اپنے اسپینی سفر کے تاثرات بتاتے ہوئے کہا کہ جب میں نے قرطبہ کی تاریخی یادگاریں دیکھیں جو ابھی تک اپنی عظمت کی داستان سنا رہی ہیں تو بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت حالت یہ تھی کہ سیاحوں کے قافلے میرے پاس سے گزر رہے تھے اور وہ میری حالت کو دیکھ کر سمجھ جاتے تھے کہ یہ ایک عربی ہے جو اپنے اسلاف کی عظمت پر رو رہا ہے (تمرّ بی قوافل السیّاح فیعرفون انی عربی ابکی مجد اجدادی)

میں نے کہا کہ اس قسم کی عمارتوں کو دیکھ کر مجھے بھی رونا آتا ہے۔ مگر میرا رونا اسلاف کی عظمت کے لیے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس پر ہوتا ہے کہ انسان کتنا زیادہ نادان ہے کہ ایسی چیزوں کے اوپر اپنی عظمت کا محل کھڑا کرتا ہے جو آخر کار کھنڈر ہو جانے والی ہیں۔

غرناطہ کے قصر الحمراء میں ایک جگہ ایک بورڈ لگا ہوا ہے جس میں بڑی عبرت ہے۔ اس دیواری کتبہ میں اسپینی زبان میں لکھا ہوا ہے کہ میکسیکو کا ایک سیاح آری ایکا سا الحمراء کو دیکھنے کے لیے آیا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ جب وہ دونوں محو حیرت ہو کر اس تاریخی محل کو دیکھ رہے تھے تو عین اسی وقت ایک سائل وہاں آگیا جو کہ اندھا تھا۔ سیاح نے سائل کو دیکھ کر اپنی بیوی سے کہا : اے خاتون، اس کو زیادہ صدقہ دے دو کیوں کہ کسی آدمی کی اس سے بڑی کوئی بدبختی نہیں ہو سکتی کہ وہ غرناطہ کے قصر کے سامنے کھڑا ہو مگر وہ اس کو دیکھنے کے لیے اندھا ہو۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اس سے بھی زیادہ بدقسمت وہ آنکھوں والا انسان ہے جو فطرت کی حسین تر دنیا کے سامنے ہو مگر وہ اس میں خدا کا جلوہ دیکھنے سے محروم رہے۔

قصر الحمراء کے ایک کمرہ کے سامنے ایک تختی لگی ہوئی ہے۔ اس پر لکھا ہوا ہے کہ یہاں واشنگٹن اروِنگ نے قیام کیا تھا۔

اروِنگ (Washington Irving) ایک امریکی ادیب تھا۔ ایک امریکی ادارہ نے ۱۸۲۶ء میں اس کو اسپین بھیجا۔ یہاں آکر جب اس نے غرناطہ کو دیکھا تو اس کی خوب صورتی پر وہ اتنا گرویدہ ہوا کہ وہ یہیں مقیم ہو گیا اور غرناطہ اور الحمراء کے بارہ میں اپنی دو کتابیں لکھیں :

Irving had become absorbed in the legends of the Moorish past, and wrote his Conquest of Granada and Tales of the Alhambra. (V/435)

واشنگٹن اروِنگ ۱۷۸۳ء میں نیویارک میں پیدا ہوا اور وہیں ۱۸۵۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔

الحمراء قلعہ اور محل دونوں تھا جس طرح دہلی کا لال قلعہ دونوں ہے۔ یہ اندلس کے مسلم حکمرانوں نے غرناطہ میں بنایا تھا۔ یہ قصر بنیادی طور پر ۱۲۳۸ اور ۱۳۵۸ کے درمیان بنایا گیا۔ ۱۴۹۲ء میں جب اندلس میں مسلمانوں کی حکومت آخری طور پر ختم ہوئی تو یہ قصر بھی زد میں آیا۔ اس کے بعد کئی بار اس عمارت کو نقصان پہنچا۔ تاہم ۱۸۲۸ میں اس کی مرمت کر کے اس کو دوبارہ دل کش بنانے کی کوشش کی گئی۔

موجودہ الحمرا میں کچھ حصہ مسلمانوں کا بنایا ہوا ہے اور کچھ حصہ بعد کے عیسائی حکمرانوں کا۔

الحمراء کے ایک خاص حصہ میں سفید سنگ مرمر سے بنے ہوئے بارہ شیر ہیں۔ یہ گویا طاقت اور ہمت کی علامت ہیں۔ قصر کے اس حصہ کے مختلف نام ہیں ——— فناء السباع، دیوان الاسد، مأسدة، بیت الاسود۔

الحمرا صرف ایک محل نہیں، وہ نہایت وسیع باغات کے درمیان بیرون شہر گویا ایک شاہی اقامت گاہ تھی۔ اس کی تعمیر پر بہت زیادہ دولت خرچ کی گئی۔ تاہم اس کا تعمیری سامان زیادہ مضبوط نہ تھا۔ اپنے عظیم حسن کے باوجود وہ غیر مستحکم تعمیراتی سامان کے ذریعہ بنی ہوئی ایک عمارت کہی جائے گی۔

الحمراء کے محلات اس وقت بنائے گئے جب کہ یہاں کی مسلم حکومت سمٹ کر صرف غرناطہ تک محدود ہوگئی تھی۔ اس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ لال قلعہ کے حکمراں کی طرح وہ باہر سے مضبوط پتھر بڑی مقدار میں منگا سکے۔ وہ زیادہ مستحکم عمارت کھڑی نہیں کر سکتے تھے، اس لیے شاید اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے انھوں نے زیادہ خوب صورت عمارتیں کھڑی کر دیں۔

قصر الحمراء ۲۲۰۰ مربع میٹر کے رقبہ میں واقع ہے۔ اس کے ہر حصہ میں آیتیں، حدیثیں، دعائیں، اشعار اور دوسری عربی عبارتیں لکھی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ خاص طور پر بنو الاحمر کا خاندانی شعار وَلاغالِبَ اِلّااللّٰہ اس کے ہر حصہ میں نقش کیا ہوا نظر آتا ہے۔

آخری دور کی سلطنت غرناطہ (۱۴۹۲ - ۱۲۳۲ء) کا بانی محمد بن یوسف الاحمر تھا۔ وہ ارجونہ کا قلعدار تھا۔ اس نے بغاوت کر کے غرناطہ پر قبضہ کر لیا، اور اپنا لقب الغالب باللّٰہ اختیار کیا۔ اسی سلطنت کے زمانہ میں غرناطہ کا مشہور قصر الحمراء تعمیر ہوا۔ اس خاندان (بنو احمر) کے حکمرانوں نے اسی لفظ کو اپنا شعار بنایا۔ وہ عمارتوں وغیرہ پر کثرت سے وَلاغالِبَ اِلّااللّٰہ لکھا کرتے تھے۔

اقبال ۱۹۳۲ میں اندلس گئے تھے۔ واپسی کے بعد انھوں نے مختلف مواقع پر اپنے سفر کے تاثرات بتائے۔ ایک موقع پر انھوں نے کہا: میں الحمراء کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا۔ مگر (انسانوں سے خالی اس قصر میں) جدھر نظر اٹھتی، دیوار پر ھو الغالب لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہاں تو ہر طرف خدا غالب ہے۔ کہیں انسان نظر آئے تو بات بھی ہو۔ (اقبال یورپ میں، از سعید اختر درانی)

یہ احساس بڑا عجیب ہے۔ میرا اپنا حال تو یہ ہے کہ مجھے انسانوں کی بھیڑ میں بھی خدا ہی دکھائی دیتا ہے اور وہاں بھی میرے اندر ربانی جذبہ کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ مگر اقبال خدا کے ذکر کے ہجوم میں کسی انسان کو تلاش کر رہے ہیں تاکہ اس سے وہ ہم کلام ہو سکیں۔

پچھلے چودہ سو سال میں مسلم دنیا میں جو اہل دماغ پیدا ہوئے اس کی فہرست میں ابن خلدون کا نام ممتاز طور پر شامل ہے۔ اس کا اسلوب تحریر اور اس کا طرزِ فکر دونوں انتہائی حد تک اوریجنل تھا۔ وہ ان چند مسلم اہل علم میں سے ہے جنھوں نے اپنے افکار کی آفاقیت کی بنا پر عالمی سطح پر اپنا اعتراف حاصل کیا، اگرچہ یہ عالمی اعتراف اس کو پانچ سو سال بعد مل سکا۔

ابن خلدون تیونس میں ۱۳۳۲ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۴۰۶ء میں قاہرہ میں اس کی وفات ہوئی۔ تاہم اس کی زندگی کا ایک قابل لحاظ حصہ اندلس میں گزرا۔ اور اگر اس کے حاسدین اور مخالفین نے اس کو اندلس چھوڑنے پر مجبور نہ کیا ہوتا تو اس کی قبر شاید قاہرہ کے بجائے قرطبہ یا غرناطہ میں ہوتی۔

پروفیسر چارلس اساوی (Charles Issawi) نے لکھا ہے کہ ——— ۱۸۶۰ء میں مقدمہ کا مکمل ترجمہ فرانسیسی زبان میں شائع ہوا، اس کے بعد ہی ایسا ہوا کہ ابن خلدون کو اپنی عظیم حیثیت کے مطابق عالمی مقام ملے:

> But it was only after the 1860s, when a complete French translation of *The Muqaddima* appeared, that Ibn Khaldun found the worldwide audience his incomparable genius deserved. (9/149)

ایک مستشرق نے اپنا ایک مقالہ دکھایا۔ اس کا ایک حصہ ابن خلدون کے بارہ میں تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ عباسی خلافت کے بعد اسلامی حکومت کا آرتھوڈاکس پولیٹکل نظریہ ایک بحران کا شکار ہوگیا۔ ابن خلدون نے سیاسی ڈھانچہ کے مقابلہ میں سماجی اور طبیعیاتی طاقتوں کی اہمیت پر زور دیا۔ اس نے عباسی خلافت کے تحت کلاسیکل سیاسی اتحاد کے تصور کو رد کر دیا۔ البتہ اس نے تمام مسلمانوں کے روحانی اتحاد کا اقرار کیا:

> He rejected the classical political unity under the Abbasid Caliph but admitted the spiritual unity of all Muslims.

مذکورہ فرانسیسی مستشرق نے پوچھا کہ ابن خلدون کے اس نظریہ کے بارہ میں آپ کی رائے کیا

ہے۔ میں نے کہا کہ میں مزید اضافہ کے ساتھ اس کو صحیح مانتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح یورپی نوآبادیات کے زمانہ میں سفید فام کی ذمہ داری (White man's burden) کا نظریہ اس کی تبریر کے لیے گھڑا گیا، اسی طرح عباسی دور میں عالمی خلافت کا نظریہ اس کی مذہبی حمایت کے لیے وضع کیا گیا۔ قرآن وسنت میں وہ سراسر اجنبی ہے۔ قرآن و حدیث کے مطابق، روحانی ترقی اور روحانی اتحاد مسلمانوں کی مستقل ذمہ داری ہے اور سیاسی اقتدار صرف ایک عارضی خدائی انعام۔

میں نے کہا کہ اسی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آج مسلم دنیا قتل وخوں ریزی کا کارخانہ بنی ہوئی ہے۔ مصر اور الجزائر سے لے کر بوسنیا اور کشمیر تک اسی بے بنیاد سیاسی نظریہ کے تحت بے فائدہ جنگ جوئی کا عمل جاری ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو ہر جگہ مذہبی، روحانی اور دعوتی مواقع حاصل ہیں مگر وہ ان کو استعمال نہیں کر رہے ہیں۔ وہ بس سیاست کی چٹان پر اپنا سر پٹک رہے ہیں، کیونکہ اپنی غلط سوچ کی بنا پر انھیں اس کے سوا کوئی اور کام دکھائی نہیں دیتا۔

میری پسندیدہ تفسیروں میں سے ایک خاص تفسیر الجامع لاحکام القرآن ہے۔ یہ تفسیر اسپین (قرطبہ) میں لکھی گئی۔ اس کے مولف ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح الانصاری ہیں۔ وہ قرطبہ کے ایک بڑے عالم تھے۔ اسی لیے وہ القرطبی کے نام سے مشہور ہیں۔ انھوں نے ۶۷۱ھ میں وفات پائی۔

القرطبی کا فقہی مسلک مالکی تھا۔ مگر اپنی بے تعصبی کی بنا پر انھوں نے کئی جگہ امام مالک کے مسلک سے اختلاف کیا ہے۔ مثال کے طور پر امام مالک نماز میں بچہ کی امامت کو ناجائز بتاتے ہیں۔ مگر القرطبی اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بچہ کا نماز میں امام بننا جائز ہے جب کہ وہ قرآن کی قرأت کرنا جانتا ہو (امامة الصغیر جائزة اذا کان قارئا) تفسیر القرطبی ۱/۳۵۳

اسی طرح امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ رمضان میں روزہ رکھنے والا ایک شخص اگر بھول کر کھالے تو اس کو قضا کا روزہ رکھنا ہوگا۔ مگر القرطبی اس رائے کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام مالک کے سوا دوسرے فقہاء کے نزدیک بھول کر کھانے والے کے اوپر روزہ کی قضا نہیں ہے، اور میں کہتا ہوں کہ یہی مسلک صحیح ہے (قلت وھو الصحیح) تفسیر القرطبی ۲/۳۲۲

موجودہ زمانہ میں علمی ذوق اتنا زیادہ بگڑ چکا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ آدمی یا تو کلی موافق ہو سکتا ہے یا کلی مخالف۔ اگر کوئی شخص، مثال کے طور پر، ایک جماعت کو مفید جماعت بتائے مگر اس کے

بعض طریقوں سے وہ اختلاف کرے تو کہا جائے گا کہ یہ شخص مصلحت پرست ہے۔ اصل میں تو وہ اس جماعت کا مخالف ہے، مگر مفاد کی بنا پر وہ اس کی تعریف کر رہا ہے۔

مسلم اسپین میں پیدا ہونے والی علمی شخصیتوں میں سے ایک ممتاز شخصیت ابوالقاسم الزہراوی (Abulcasis) کی ہے۔ اس کی کتاب التصریف لاطینی زبان میں ۱۴۹۷ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد یورپ کی تمام اہم زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ یہ کتاب تقریباً ۵۰۰ سال تک اہل یورپ کے لیے طب اور سرجری میں مرجع بنی رہی۔ ہٹی کے الفاظ میں، اس نے یورپ میں جراحی کی بنیاد قائم کرنے میں مدد دی:

It helped lay the foundations of surgery in Europe. (p. 577)

زہراوی سے پہلے سرجری (جراحی) کا کام پچھنہ لگانے والے کیا کرتے تھے وہ اصول طب اور علم تشریح الاعضاء کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض اپنے خاندانی رواج کے تحت جراحی کا کام کرتے تھے اور اکثر مریضوں کو سخت نقصان پہنچاتے تھے۔ زہراوی نے جراحی (آپریشن) کو علم تشریح الاعضاء کی بنیاد پر قائم کیا، اس نے انسانی جسم کا گہرا مطالعہ کر کے اس کے اصول مقرر کیے۔ وہ اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا کہ پہلے تم انسانی جسم کا تشریحی مطالعہ کرو اور یہ جانو کہ وریدیں اور شریانیں اور اعصاب کہاں واقع ہیں، اس کے بعد جراحی کا کام کرو۔ اس نے مشاہدہ اور تجربہ کو جراحی کا لازمی حصہ قرار دیا۔ زہراوی نے فن جراحت میں بہت سی نئی نئی باتیں دریافت کیں۔

مسلم اسپین کی تاریخ میں ہر قسم کی سبق آموز مثالیں موجود ہیں۔ یہاں کے مسلم حکمرانوں میں سے ایک نامور حکمراں سلطان عبدالرحمٰن الثالث ہے۔ وہ ۳۰۰ھ میں قرطبہ کے تخت پر بیٹھا۔ اور پچاس سال تک حکومت کی۔ اس کا زمانہ سلطنت ہر اعتبار سے نہایت ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ یہی سلطان ہے جس نے مشہور قصر الزہراء تعمیر کرایا تھا جو اپنے زمانہ میں دنیا کا سب سے زیادہ عالی شان محل سمجھا جاتا تھا۔ مگر زمانہ نے اس محل کو اس طرح مٹایا کہ آج آپ قرطبہ جائیں تو وہاں آپ کو اس کے صرف کھنڈر دکھائی دیں گے۔

قصر الزہراء میں آرام و عیش اور شان و شوکت کی تمام ممکن چیزیں اکٹھا کی گئی تھیں۔ ۳۵۰ھ میں اسی قصر شاہی میں عبدالرحمٰن الثالث کا انتقال ہوا۔ اس کی وفات کے بعد اس کی چھوڑی ہوئی چیزوں میں

ایک کاغذ ملا۔ اس میں سلطان نے اپنے ان دنوں کا حال خود اپنے قلم سے لکھا تھا جو غم سے خالی تھے۔ مگر پچاس سالہ دورِ حکومت میں ایسے بے فکری کے ایام کی تعداد صرف چودہ دن تھی۔

سلطان کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا الحکمؔ بن عبد الرحمٰن قرطبہ کے تخت پر بیٹھا۔ قصر الزہرا، جو اس کے باپ نے بے پناہ محنت اور لاتعداد دولت کے ذریعہ بنایا تھا اس کو وراثت میں مل گیا۔ اس نے اپنا شاہی لقب المستنصر باللہ اختیار کیا۔

الحکمؔ نے پندرہ سال تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ مگر اس کے بھی آخری ایام مایوسی کے ایام تھے۔ کیوں کہ آخری زمانہ میں وہ مفلوج ہوگیا اور فالج کی حالت ہی میں ۳۶۶ھ میں قرطبہ میں اس کا انتقال ہوگیا (توفی بقرطبۃ مفلوجاً)

قصر الزہرا، نہایت خوب صورت ہونے کے ساتھ بہت بڑا تھا۔ اسی لیے اس کو مدینۃ الزہراء کہا جاتا تھا۔ اس میں تفریح اور عیش کے تمام اسباب اکٹھا کیے گئے تھے۔ وہ چالیس سال میں بن کر تیار ہوا تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس کے جلد ہی بعد زوال شروع ہوا، اور تعمیر کے بعد چالیس سال سے بھی کم مدت میں وہ کھنڈر ہوکر رہ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی منذر نے اس کی بابت یہ شعر کہے تھے کہ اے زہرا، کو بنانے والے جو اپنے وقت کو اس میں غرق کیے ہوئے ہے، کیا تم ٹھہر کر غور نہیں کرتے۔ وہ کتنا زیادہ خوب صورت ہے، بشرطیکہ اس کی رونق پژمردہ نہ ہوتی :

یا بانی الزهراء مستغرقا   اوقاته فیها اماتمهل

لله ما احسنها رونقا   لو لم تکن زهرتها تذبل

اندلس میں عربوں نے جو سیاسی نظام قائم کیا وہ اس طرح تھا کہ ایک ان کا مرکزی سلطان یا خلیفہ ہوتا تھا اور مختلف علاقائی حصوں میں ماتحت امیر ہوا کرتے تھے جن کو آج کل کی زبان میں گورنر کہا جاسکتا ہے۔ ابتداءً کئی سو سال تک عربوں میں سے امرا مقرر کیے جاتے تھے۔ کیوں کہ یہ خیال تھا کہ وہ ہم نسل ہونے کی بنا پر زیادہ قابل اعتماد ثابت ہوں گے۔

مگر اس دنیا میں ہمیشہ ہر دوسری چیز پر انٹرسٹ فائق ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ سیاسی انٹرسٹ نے ان امرا کے اندر بغاوت کا رجحان پیدا کیا۔ ہر عرب اپنے علاقہ کو مرکز سے الگ کرکے خود مختاری کا خواب دیکھنے لگا۔ اس کے نتیجہ میں مرکزی سلطان اور امرا کے درمیان لڑائیاں جاری ہوگئیں۔

عبد الرحمٰن الثالث نے اس پالیسی کو بدلا۔ اس نے عرب امرا کا زور توڑنے کے لیے بربر قبائل میں سے امیر اور وزیر مقرر کرنا شروع کیا۔ ابتدا میں یہ لوگ بہت وفادار رہے۔ کیوں کہ امیر اور وزیر کے عہدے ان کی توقعات سے بہت زیادہ تھے۔ مگر دھیرے دھیرے جب وہ دولت اور اقتدار سے آشنا ہوگئے، تو ان کے ذہن میں بھی بغاوت کے خیالات پرورش پانے لگے۔ عبد الرحمٰن الثالث کی زندگی تک تو یہ لوگ دبے رہے۔ مگر اس کی موت کے بعد وہ سب کے سب سرکش بن کر کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے راجدھانی قرطبہ پر حملے کیے۔ قصر الزہراء کو تباہ کر ڈالا۔

ہر شہر اور ہر علاقہ کا امیر مرکز کا باغی ہوگیا۔ حتیٰ کہ اندلس میں تقریباً دو درجن چھوٹی سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ جن کو الگ الگ فتح کرنا عیسائیوں کے لیے آسان ہوگیا۔

سرکشی اور بغاوت کا تعلق عرب اور غیر عرب سے نہیں ہے، اس کا تمام تر تعلق انٹرسٹ سے ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی اپنے انٹرسٹ کی طرف دوڑتا ہے۔ اسی سے انتشار اور بغاوت کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے روکنے والی چیز صرف تقویٰ ہے، اور ایسا تقویٰ کسی بہت خوش نصیب آدمی ہی کو ملتا ہے جو انٹرسٹ کے خلاف اس کے لیے چیک بن جائے۔

روایت کو توڑنے سے کتنی بڑی خرابی آتی ہے، اس کی بہت سی مثالیں اسپین کی مسلم تاریخ میں موجود ہیں۔ مثلاً سلطنت غرناطہ کا تیسرا حکمراں محمد مخلوع تھا۔ اس کو اس کے بھائی نصر بن محمد نے ۷۰۸ھ میں قتل کرا دیا تاکہ اس کا کوئی سیاسی رقیب باقی نہ رہے۔ مگر یہ جان کے احترام کی روایت کو توڑنا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد حکمرانوں کے قتل کا لمبا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اس کے بعد سلطان ابو الولید کو اس کے بھتیجے نے ۷۲۵ھ میں قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد سلطان محمد غرناطہ کے تخت پر بیٹھا۔ اس کو بھی اس کے رشتہ داروں نے ۷۳۳ھ میں قتل کر دیا۔ اس کے بعد سلطان یوسف کو حاکم بنایا گیا۔ مگر وہ بھی ۷۵۵ھ میں نیزہ مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ پھر سلطان اسماعیل تخت نشین ہوا۔ مگر ۷۶۱ھ میں خود اس کے بھائی نے اس کو قتل کر ڈالا۔ وغیرہ

کسی سماج میں یہ روایت قائم کرنا ہو کہ انسانی جان کا احترام کیا جانا چاہیے۔ اور اس کو کسی حال میں قتل نہیں کرنا چاہیے، تو یہ روایت ایک لمبی تاریخ کے بعد بنے گی۔ مگر اس روایت کو توڑنے کے لیے کسی مدت کی ضرورت نہیں۔ اور جب کوئی روایت ایک بار توڑ دی جائے تو پھر اس کو از سر نو

قائم کرنا انتہائی دشوار ہوجاتا ہے۔ روایت شکنی کے اسی خطرہ سے حدیث میں اس طرح آگاہ کیا گیا تھا کہ :

اذا وُضع السیفُ فی امتی لم یُرفع عنها الی یوم القیامۃ (ابوداؤد، کتاب الفتن)

سقوط اندلس پر بہت سے شاعروں نے مرثیے لکھے ہیں۔ ان میں زیادہ تر فریاد و ماتم کا انداز ہے۔ تاہم مجھے ابو علی الحسن بن رشیق کے دو شعر بہت پسند ہیں۔ اس نے کہا کہ اندلس کی سرزمین میں جو چیز مجھے بے لطف کرتی ہے ان میں سے معتمد (جس پر اعتماد کیا جائے) اور معتضد (نہایت مضبوط) جیسے القاب ہیں۔ یہ شاہانہ القاب اسی طرح غیر واقعی ہیں جیسے کوئی بلی نتھنے پھلا کر شیر کی صورت کی نقل کرنے لگے :

مِمّا یُزَھِّدُنی فی ارضِ اَندَلُسٍ   اسماءُ مُعْتَمِدٍ فیہا وَمُعتَضِدِ

القابُ مملکۃٍ فی غیرِ موضِعِہا   کَالھِرِّ یَحکِی انتفاخاً صورَۃَ الاسَدِ

یہ دونوں شعر ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں خلافت کی بحث کے تحت نقل کیے ہیں (صفحہ ۲۲۹)

ایک حاکم کو جب سادہ طور پر امیر المومنین کہا جائے تو اس کے نہ رہنے سے لوگوں میں صرف یہ احساس پیدا ہوگا کہ ہمارا سیاسی حاکم نہ رہا۔ لیکن اگر اس کو جہاں پناہ اور محافظ اسلام جیسے القاب سے یاد کیا جانے لگے تو اس کے ہٹنے کے بعد لوگوں کو ایسا محسوس ہوگا کہ وہ آخری طور پر لٹ گئے۔ اب ان کے پاس قیام حیات کے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔

مسلم اسپین صرف تمدنی ترقی ہی کی مثال نہیں تھا۔ اسی کے ساتھ وہ رواداری کی بھی نہایت اعلیٰ مثال تھا۔ عرب اپنے مزاج کے اعتبار سے نہایت فیاض اور روادار واقع ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ وہاں کے کام کی نوعیت یہ تھی کہ مسلم اہل علم کے ساتھ یہودی اور عیسائی اہل علم اور فن کار بھی مساوی طور پر شریک رہتے تھے۔ اس طرح اشتراک عمل کے ماحول نے باہمی رواداری کا ماحول بھی اپنے آپ پیدا کر دیا تھا۔

فرانسیسی مستشرق رینان (Renan) نے ابن رشد پر اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ سائنس اور لٹریچر کے ذوق نے دسویں صدی میں دنیا کے اس خصوصی گوشہ میں رواداری کا ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا جس کا نمونہ موجودہ زمانہ میں مشکل سے کہیں مل سکتا ہے۔ مسیحی، یہودی اور مسلمان ایک ہی زبان (عربی) بولتے تھے۔ ایک ہی گیت گاتے تھے۔ ایک ہی طرح ادبی اور علمی مطالعہ میں حصہ لیتے تھے۔ وہ تمام

رکاوٹیں جو لوگوں کو الگ الگ کرنے والی ہیں، وہ سب وہاں ختم کر دی گئی تھیں۔ تمام کے تمام لوگ ایک مشترک تہذیب کے لیے مل کر کام کرتے تھے:

> The taste for science and literature had, by the tenth century, established, in this privileged corner of the world, a toleration of which modern times hardly offer us an example.

اب سوال یہ ہے کہ جب مسلم اسپین میں اتنا زیادہ رواداری کا ماحول تھا، پھر کیوں ایسا ہوا کہ وہاں کے مسیحی باشندے مسلمانوں کے دشمن ہو گئے اور ان کو وحشیانہ طور پر اپنے ملک سے نکالنا شروع کر دیا۔ اس کا سبب جو اس سفر کے بعد میرے علم میں آیا وہ یہاں کے مذہبی طبقہ کا جنون تھا۔

اصل یہ ہے کہ مسلم اسپین کے روادارانہ ماحول کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسپین کے مسیحی باشندے خود بخود کثرت سے مسلمان ہونے لگے۔ بہت سے لوگ جنھوں نے اپنا مذہب نہیں بدلا، انھوں نے مسلمانوں کی تہذیب اختیار کر لی۔ چنانچہ ان کو مستعرب (Mozarab) کہا جانے لگا۔

مسیحی چرچ کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا۔ مسلمانوں کے ذریعہ اسپین میں علوم کے دروازے کھلنا، زراعت، صنعت، تعمیرات اور دوسرے شعبوں میں غیر معمولی ترقی، سماجی زندگی میں انصاف اور رواداری کا آنا، اس قسم کی تمام مثبت چیزیں ان کے لیے غیر اہم بن گئیں۔ ان کو صرف یہ یاد رہا کہ ان کے ہم مذہب تیزی سے غیر مسیحی تہذیب کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

چنانچہ انھوں نے اسپین کے مسیحیوں کو مسلمانوں سے روکنا شروع کیا۔ انھوں نے مختلف طریقوں سے مسلمانوں اور مسیحیوں میں دوری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ آخر میں انھوں نے وہ مجنونانہ تدبیر اختیار کی جس کو عام طور پر رضاکارانہ شہادت (voluntary martyrdom) کہا جاتا ہے (ہسٹری آف دی عربس، اڈیشن ۱۹۷۰، صفحہ ۵۱۶)

انھوں نے مسلمانوں کی نفسیات کا مطالعہ کر کے یہ نکالا کہ مسلمان اپنے پیغمبر کے خلاف باتوں کو سن کر بگڑ جاتے ہیں اور ایسے آدمی کو قتل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے سڑکوں پر نکل کر علی الاعلان پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بدزبانی اور بدگوئی شروع کر دی۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان مشتعل ہو کر انھیں قتل کر ڈالیں اور اس طرح مسلمانوں کو بدنام کر کے مسیحیوں کو اسلام اور مسلمانوں سے متنفر کر دیا جائے۔

اس انوکھی تدبیر کا چیمپین اسپین کا بشپ ایولوجیس (Eulogius) تھا۔ اس نے قرطبہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بار بار علی الاعلان سب وشتم کیا۔ اس کے بعد علماء کے فیصلہ کے مطابق، سلطان عبدالرحمٰن دوم نے ۱۱ مارچ ۸۵۹ء کو اسے برسرعام قتل کرا دیا۔

اس طرح ایک کے بعد ایک مسیحی چرچ کے افراد عوامی مواقع پر آکر شتم رسول کا فعل کرتے رہے، اور اس کے نتیجہ میں مسلم تلوار سے قتل کیے جاتے رہے۔ یہ واقعہ نویں صدی عیسوی میں قرطبہ میں پیش آیا جو اس وقت مسلم اسپین کا مرکز تھا۔ یہ عقوبت جس کے اسباب خود مسیحی لوگوں نے پیدا کیے تھے، آخر کار ۵۳ مسیحیوں کے قتل تک جا پہنچی :

this persecution, provoked by the Christians themselves, took a toll of 53 victims. (17/415)

اس قسم کے مجنونانہ واقعات نے اسپین کے مسیحیوں، خاص طور پر وہاں کے مذہبی طبقہ کے دل میں مسلمانوں کے خلاف سخت نفرت پیدا کر دی۔ یہاں تک کہ چرچ کے لیے آسان ہو گیا کہ وہ اسپین سے مسلمانوں کے اخراج عام کا فتویٰ جاری کر سکے۔

حکیم احمد شجاع صاحب کا خیال تھا کہ مدارس اسلامیہ کے نصاب میں علوم عصریہ کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے علامہ اقبال کو خط لکھا۔ اقبال نے انھیں جواب دیا کہ ان مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو۔ اگر یہ ملّا نہ رہے تو ہندستانی مسلمانوں کا وہی حال ہوگا جو اندلس میں آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود وہاں کے مسلمانوں کا ہوا (الفرقان، لکھنؤ، نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۴، صفحہ ۲۲)

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال نے یہ بالکل الٹی بات کہی۔ اندلس جیسا حال کسی مسلم قوم کا اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کے علماء اجتہاد کی صلاحیت سے محروم ہو جائیں۔ اور اجتہاد کی صلاحیت سے محرومی اس وقت آتی ہے جب کہ وہ وقت کے تقاضوں سے بے خبر ہو گئے ہوں۔

اندلس کے اصحاب چرچ نے جب "رضاکارانہ شہادت" کا فتنہ کھڑا کیا، اس وقت وہاں کے علماء اگر اجتہادی صلاحیت کے حامل ہوتے اور مسیحی دنیا کے حالات سے پوری طرح باخبر ہوتے تو وہ فتویٰ دیتے کہ یہ چرچ کی ایک نہایت گہری سازش ہے۔ اگر ہم ان کو قتل کریں تو ہم خود ان کے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ بن جائیں گے۔ اس لیے ہم کو انھیں قتل نہیں کرنا ہے بلکہ حکمت کے

ساتھ ان کو ناکام بنا دینا ہے۔ اور پھر وہ چرچ کی سازش کا توڑ اس طرح کرتے کر اس کے جواب میں وہ تعارف اسلام کی پر امن مہم زور و شور کے ساتھ چلا دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مسیحی عوام چرچ سے متنفر ہو کر تعلیمات محمدی کی طرف مائل ہو جاتے اور اتنی تیزی سے اسلام قبول کرتے کہ چرچ کی سازش برعکس طور پر اندلس میں مسلمانوں کی مزید تقویت اور استحکام کا سبب بن جاتی۔

علماء کی حکیمانہ تدبیر چرچ کے پادریوں کو عوام کی نظر میں دیوانہ کا درجہ دے دیتی۔ مگر ان کی ناقص رہ نمائی نے ان پادریوں کو اندلس کے مسیحیوں کی نظر میں شہید اور ہیرو کا مقام عطا کر دیا۔ اور پھر وہ کچھ پیش آیا جو اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

ایک یورپی اسکالر (مستشرق) نے اسپین میں مسلم سلطنت کے زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان میں داخل ہوئے تو ابتدائی مرحلہ میں طارق اور نُصیر نے بغداد کی مدد سے یہاں کی مسیحی فوجوں پر فتح حاصل کی تھی۔ مگر آخری مرحلہ میں مسیحی قوتوں کے مقابلہ میں وہ اپنے مرکز کی مدد سے محروم رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اندلس میں قائم ہونے والی مسلم خلافت بغداد کی خلافت کی حریف بن گئی تھی۔ اس نے کبھی بھی بغداد کی مرکزی خلافت سے مصالحت کی کوشش نہیں کی:

Rival caliphate of Cordova never reconciled itself to the central caliphate of Baghdad.

یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ عبدالرحمٰن بن معاویہ اموی جب عباسیوں کی دار و گیر سے بھاگ کر اندلس پہنچا تو اس وقت کے امیرانِ اندلس خطبۂ جمعہ میں بغداد کے خلیفہ کا نام لیتے تھے۔ عبدالرحمٰن نے ابتداءً ایسا ہی کیا۔ مگر بعد کو اس نے خطبہ میں بغداد کے عباسی خلیفہ کا نام لینا بند کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا اس نے خاندان بنو امیہ کے ایک شخص عبدالملک بن نے اندلس میں اپنی حکومت قائم کرنے کے سلسلہ میں عبدالرحمٰن کی مدد کی تھی:

و هذا عبد الملك هو الذي ألزم عبد الرحمٰن بقطع خطبة المنصور وقال له، تقطعها وإلا قتلتُ نفسي- وكان قد خطب له

عبدالملک ہی نے عبدالرحمٰن کو مجبور کیا کہ وہ خلیفہ منصور کا نام خطبہ میں لینا بند کر دے۔ عبدالملک نے کہا کہ تم اس کو بند کرو ورنہ میں اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گا۔ چنانچہ عبدالرحمٰن نے اس کا خطبہ

عشرہ اشہر، فقطعہا۔ پڑھنا بند کر دیا حالاں کہ دس مہینہ تک اس نے
(الکامل فی التاریخ لابن اثیر ۶/۱۰) خلیفہ بغداد ہی کا خطبہ پڑھا تھا۔

خلیفہ المنصور کو یہ خبر پہنچی تو وہ سخت غضب ناک ہوا۔ اس نے اندلس پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد سے آخر تک بغداد کی خلافت اور اندلس کی مسلم ریاست کے درمیان معاونت کے بجائے رقابت کارشتہ قائم ہو گیا۔ یہ رقابت صرف اس وقت ختم ہوئی جب کہ خود اندلس کی مسلم سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

دکتور حسین مونس کا سفرنامہ رحلۃ الاندلس، حدیث الفردوس الموعود کے نام سے ۱۹۶۳ میں جدہ سے چھپا تھا۔ وہ ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ادبی اور جذباتی انداز میں ہے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں: لأن موضوعہ یمس عاطفۃ المسلم و وجدان العربی (صفحہ ۹)

مصنف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اہل اسپین ہم سے ایک بالشت زمین بھی سخت معرکہ اور دو طرفہ اموات کے بغیر حاصل نہیں کر سکے۔ پھر کیسے یہ کہا جاتا ہے کہ عرب اس زمانہ میں کمزور ہو گئے تھے۔ ان پر عیش پسندی چھا گئی تھی۔ پھر جواب دیتے ہیں کہ جو ہوا وہ یہ تھا کہ قسمت نے اندلس میں ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ ڈھائی صدیوں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں اٹھا جو قیادت اور سیاست اور تدبیر کا جامع ہو (الذی حدث ھو ان الحظ خاننا فی الاندلس۔ خلال ھذین القرنین ونصف القرن لم یظھر رجل واحد جامع لصفات الزعامۃ والقیادۃ والسیاسۃ والتدبیر) صفحہ ۱۶۶

اس جواب کے بعد دوبارہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخری ڈھائی سو سال میں کیوں قائدانہ اوصاف کے لوگ پیدا نہیں ہوئے، جب کہ اس سے پہلے بار بار ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ کا تعلق دور زوال سے تھا نہ کہ افراد کی عدم پیدائش سے۔ یہ زوال ہر سلطنت اور ہر قوم پر آتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی اس قانون فطرت سے مستثنیٰ نہیں۔

لکھنؤ کے عربی جریدہ الرائد (۱۰-۲۶ رمضان ۱۴۱۲ھ) میں الاستاذ انور الجندی کا ایک مضمون نقل کیا گیا تھا جس کا عنوان تھا: ھذا واجبنا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہم مسلمانوں کی آج شدید ترین ضرورت ہے کہ ہم اندلس کے المیہ کا مطالعہ کریں، کیوں کہ ہم پچھلے چالیس سال سے پھر اندلس کے

متشابہ بحران میں مبتلا ہو گئے ہیں (ونحن المسلمين اليوم فی اشد الحاجة الى دراسة مأساة الاندلس لاننا منذ اربعين سنة قد وقعنا فی ازمة قريبة الشبه بها)

اس کے بعد مضمون میں کہا گیا تھا کہ آج دوبارہ ایسے حالات درپیش ہیں جو ہم کو اندلس جیسے المیہ میں مبتلا کر دیں۔ کیوں کہ عالمی صہیونیت ہم کو وہیں دھکیل دینے کے لیے سرگرم ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی نسلوں کو مقدس جہاد کے لیے تیار کریں (لابد ان يقف المسلمون موقف الاستعداد و ان يدربوا الاجيال على الجهاد المقدس)

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے معاملہ کو جہاد و قتال کا مسئلہ بتانا سراسر نادانی کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فقدانِ جہاد کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ فقدانِ تقوی کا مسئلہ ہے۔ قرآن میں بار بار بتایا گیا ہے کہ خدا متقیوں کے ساتھ ہے (التوبہ ۳۶) اگر تمہارے اندر تقویٰ ہو تو مخالفین کی سازشیں تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا ئیں گی (آل عمران ۱۲۰) گویا کہ تقویٰ دفاع کے لیے ایک موثر مددگار ہے۔

تقوی کا دفاعی قوت ہونا کوئی پراسرار بات نہیں، یہ ایک سادہ فطری حقیقت ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تقوی آدمی کے اندر یہ صفت پیدا کرتا ہے کہ کسی کے ساتھ دشمنی ہو تب بھی وہ اس کے بارہ میں منصفانہ انداز میں سوچے، تب بھی وہ انصاف ہی کی بات کہے (المائدہ ۸) حریف کے بارہ میں درست رائے قائم کرنا ہی اس کے مقابلہ میں درست اور کارگر منصوبہ بندی کی واحد ضمانت ہے۔ اس طرح تقوی کا تعلق براہ راست طور پر دفاعی تدابیر سے جڑ جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں انڈیا کے ہندوؤں کی مثال لیجئے۔ ذاتی طور پر میں ہندوؤں کو مسلمانوں کا حریف نہیں سمجھتا بلکہ ہندوؤں کو مسلمانوں کا ہم قوم سمجھتا ہوں۔ تاہم بہت سے مسلم رہنما اور مسلم دانش ور ہندوؤں کو اپنا حریف سمجھتے ہیں اور ان کے خلاف دفاعی کوشش میں مصروف ہیں۔ مگر ان کی کوششیں نہ صرف ناکام ہیں بلکہ الٹا نتیجہ پیدا کر رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقدانِ تقوی کی وجہ سے وہ ہندو مسئلہ کا صحیح اندازہ کرنے میں ناکام رہے۔

موجودہ زمانہ میں تمام مسلم پریس تقریباً بغیر استثناء ہندوؤں کو ظالم اور متعصب کے روپ میں دکھانے میں مصروف ہے۔ مثال کے طور پر مکہ کے ہفت روزہ اخبار العالم اسلامی کے شمارہ ۱۷ رجب ۱۴۱۵ھ (۱۹ دسمبر ۱۹۹۴) میں ہندستانی مسلمانوں کی فراہم کردہ ایک رپورٹ چھپی ہے۔

اس کا عنوان ہے کہ انڈیا کے ہندوؤں کا یہ منصوبہ ہے کہ وہ دہلی کی مسجدوں کو کھیل کود کے میدان میں تبدیل کردیں (مخطط هندوسی لتحویل مساجد دلهی الی ملاعب) اس رپورٹ میں دوسری مذموم کوششوں کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہندستان کی ہندو حکومت یہ ارادہ رکھتی ہے کہ وہ ہندستانی مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر روک لگانے کے لیے مردوں کو جبری طور پر بانجھ بنادے (ان حکومة الهند-الهندوكية- تعمد من اجل الحد من زيادة عدد المسلمين فی الهند الی التعقيم الاجباری للرجال)

یہ بات سراسر لغو اور بے بنیاد ہے، مگر آج تمام مسلم دانشور اور رہنما ہندوؤں کے بارہ میں اسی قسم کے غیر واقعی اندازہ کا شکار ہیں۔ اور جو لوگ اپنے "حریف" کے بارہ میں غیر واقعی اندازہ کا شکار ہو جائیں وہ ان کے مقابلہ میں کامیاب منصوبہ بھی کبھی نہیں کر سکتے۔

اس کانفرنس میں مسلمان بھی قابل لحاظ تعداد میں تھے۔ انڈیا اور پاکستان سے ایک ایک آدمی تھے۔ اس کے علاوہ مراکو، تیونس، مصر، سوڈان، سعودی عرب، فلسطین، ترکی، وغیرہ سے کافی لوگ آئے تھے۔ بہت سے پہلوؤں سے ان میں کافی فرق تھا۔ مگر ایک بات میں تقریباً سب کی سوچ ایک تھی۔ ہر ایک کے نزدیک موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس مظلومیت کا کیس تھا۔ ہر ایک کے نزدیک وہ غیر مسلم قوموں کی سازش اور زیادتی کا شکار ہو رہے تھے۔

ایک صاحب سے میں نے کہا کہ میں حیران ہوں کہ آپ لوگ کیوں کر اس انداز میں سوچتے ہیں۔ یہ تو خود دین اسلام کی تردید ہے۔ خدا کا یہ وعدہ ہے کہ وہ اس دین کی اور اس کے حاملوں کی حفاظت فرمائے گا۔ پھر یہ تو ہمارے عقیدہ کے خلاف ہوگا کہ ہم یہ خیال کریں کہ خدا نے کسی صلیبی یا صیہونی یا استعماری طاقت کو اس بات کا کھلا موقع دے دیا ہے کہ وہ ہم کو تباہ کر ڈالیں۔

آپ لوگوں کو اس کے بجائے یہ کہنا چاہیے کہ کچھ متعصبین نے اندلس میں مسلمانوں کا خاتمہ کرنا چاہا تھا مگر وہ ان کا خاتمہ نہ کر سکے۔ اسلام دوبارہ یہاں نئی طاقت کے ساتھ زندہ ہو گیا۔ اسی طرح ساری دنیا میں مخالفین کی سازشیں ناکام ہو کر رہ جائیں گی۔

میں نے کہا کہ اندلس کے تجربہ کے ذریعہ خدا ہمیں یہ پیغام دے رہا ہے کہ اے پیروان محمد، تم لوگ عزم اور ہمت کے ساتھ توحید کے مشن کو دنیا میں پھیلاؤ۔ میں لوگوں کے مقابلہ میں

تمہاری یقینی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں (واللہ یعصمک من الناس)

غرناطہ اسلام کی توسیع کی تاریخ میں ایک علامتی لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انگریز مورخ ٹامس کارلائل نے اپنے لکچر (۸ مئی ۱۸۴۰) میں پیغمبر اسلام کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ گویا ایک چنگاری اوپر سے گری، ایک ایسے ملک میں جو بظاہر تاریک اور ناقابل لحاظ تھا، مگر دیکھو، یہ ریت اس طرح جل اٹھی کہ دہلی سے غرناطہ تک سب روشن ہو گیا:

It is not as if a spark had fallen, one spark, on a world of what seemed black unnoticeable sand; but lo, the sand proves explosive powder, blazes heaven-high from Delhi to Grenada. (p. 71)

اس "روشنی" کو جو لوگ سیاسی اقتدار کے معنی میں لیتے ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ روشنی ایک مدت تک جلنے کے بعد بجھ گئی اور صدیوں سے وہ جزئی یا کلی طور پر بجھی ہوئی ہے، مگر یہ معیار درست نہیں۔ میں اس روشنی کو فکری اور روحانی معنی میں لیتا ہوں۔ اس لیے مجھ کو آج بھی یہ روشنی جلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، نہ صرف دہلی سے غرناطہ تک، بلکہ زمین کے اِس سرے سے اُس سرے تک۔

جو لوگ جدید حالات کے پس منظر میں اندلس کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس موضوع پر ۱۹۹۱ میں عربی میں ایک معلوماتی کتاب چھپی ہے۔ ۱۶۰ صفحہ کی اس کتاب کا نام و پتہ یہ ہے:

الصحوة الاسلامية في الاندلس اليوم ، تاليف د۔ علي المنتصر الكتاني

مركز البحوث والمعلومات ، ص ب ۸۹۳ ، الدوحة ، قطر

مصنف جو اسپین کے پڑوسی ملک المغرب سے تعلق رکھتے ہیں، انھوں نے کافی تلاش و تحقیق کے بعد بتایا ہے کہ ہر قسم کے ناموافق حالات کے باوجود اسپین سے مسلمان کبھی ختم نہیں ہوئے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے عجیب واقعات لکھے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ الغرناطی نام کے ایک شخص سے میری ملاقات کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں ۵ نومبر ۱۹۷۳ کو ہوئی۔ اس کی پیدائش برشلونہ میں ہوئی تھی۔ پھر اس نے پاکستان میں ۱۹۶۹ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ جب میں چھوٹا بچہ تھا تو میری دادی نے اپنی موت کے وقت مجھے اپنے قریب بلایا اور سرگوشی کے انداز میں میرے کان میں کہا کہ عیسائی دین ہمارا دین نہیں ہے۔ اور وہ سچا دین بھی نہیں۔ جب تم بڑے ہو جاؤ تو

اپنے دین کو جاننے کی کوشش کرنا (ان الـدین النصرانی لیس دیننا و لیس ھوالـدین الحق - عندما تکبر حاول ان تعرف دینک) صفحہ ۸۸

الغرناطی نے بڑے ہونے کے بعد اسپین کی تاریخ کا مطالعہ کیا - اور پھر وہ اپنی دادی کی بات کو سمجھ گیا اب اس نے دین اسلام کو جان لیا اور اس پر مطمئن ہوگیا اور پاکستان جاکر اپنے اسلام کا اعلان کردیا - دوسری عالمی جنگ کے بعد اسپین کے بہت سے لوگوں نے اس طرح دوبارہ اپنے اسلام کا اعلان کیا ہے -

مسلم دانشوروں کا عام مزاج یہ ہے کہ وہ بلا تحقیق بڑی بڑی باتیں لکھتے رہتے ہیں - ان کے اس مزاج کا اظہار اسپین کے معاملہ میں بھی بار بار ہوتا رہا ہے - مثلاً بمبئی کے ماہنامہ البلاغ (فروری ۱۹۹۵) میں ایک صاحب اسپین کے تذکرہ کے تحت لکھتے ہیں کہ "یہ بھی تاریخ کا ایک المیہ ہے کہ جس اسپین پر مسلمانوں نے باضابطہ طور پر ۱۴۹۲ء تک حکومت کی، وہاں آج ایک مسلمان نہیں" (صفحہ ۵۴) مگر جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، یہ سراسر بے بنیاد بات ہے -

اس قسم کی خلاف حقیقت باتیں مختلف عنوانات کے تحت اتنی زیادہ چھپی ہیں کہ اس نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو غیر ضروری طور پر بے ہمتی میں مبتلا کردیا ہے - اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان یہ ہے کہ اس قسم کی منفی باتوں کی مسلسل تکرار نے موجودہ مسلمانوں کے ذہن میں یہ بٹھا دیا ہے کہ ساری دنیا ان کی دشمن ہے - ہر طرف ان کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں - ہر قوم ان کو ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے -

قوموں کی اس وہمی تصویر نے مسلمانوں سے ان کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ان سے چھین لیا ہے - اور وہ دنیا کی قوموں کے حق میں خیر خواہی کا جذبہ ہے - دعوت مسلمان کی سب سے بڑی طاقت ہے - مگر دعوت کا عمل انجام دینے کے لیے مدعو کے حق میں خیر خواہی درکار ہے، مسلمانوں کے دل میں دوسری قوموں کے لیے خیر خواہی نہیں، اس لیے ان کے یہاں اسلام کی داعیانہ طاقت کا استعمال بھی نہیں -

عجیب بات ہے کہ اسپین کے سفر سے کچھ پہلے ہندستان کے ایک مشہور عالم اور بزرگ کا خط (۴ اکتوبر ۱۹۹۴) مجھ کو ملا - موصوف نے اس میں مجھ کو کچھ مشورے دیے تھے - اور آخر میں اپنے مشورہ کی اہمیت و ضرورت کو بتاتے ہوئے لکھا تھا کہ ——— "اس لیے کہ اس ملک کو اندلس ثانی

بنانے کی بڑی منظم کوشش کی جارہی ہے "۔

ہندستان اور اندلس دونوں سے تفصیلی واقفیت کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ بات دہرانا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جہاں تک اندلس کا تعلق ہے، وہاں ہر قسم کی جارحیت کے باوجود کبھی بھی اسلام یا مسلمانوں کا وجود ختم نہیں کیا جاسکا تھا۔ اور اب تو وہاں دوبارہ اسلام اس شان کے ساتھ آرہا ہے کہ الصحوۃ الاسلامیۃ فی الاندلس الیوم جیسے ٹائٹل کے ساتھ کتابیں چھپ رہی ہیں۔ پھر جب خود اندلس اول نہیں بن سکا تو اندلس ثانی آخر کیوں کر بن جائے گا۔

جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے تو یہاں مسلمانوں کو یقیناً کچھ مسائل کا سامنا ہے۔ مگر یہ مسائل کسی نہ کسی صورت میں ہر جگہ ہیں، حتی کہ مسلم ممالک میں بھی۔ اصل یہ ہے کہ مسائل زندگی کا جزء ہیں، جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم مسائل کو چیلنج کے روپ میں لیں۔ نہ یہ کہ "اندلس ثانی" کا فرضی خطرہ بتا کر مسلمانوں کو پست حوصلہ کریں۔

دور اول میں مسلمانوں کو پہلے غزوۂ بدر میں فتح حاصل ہوئی۔ اس کے بعد غزوۂ احد میں ان کو شکست ہوگئی۔ اس پر لوگوں کے ذہن میں سوالات پیدا ہوئے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن میں فطرت کے ایک قانون کو بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ عسکری یا سیاسی فتح کسی ایک قوم کی اجارہ داری نہیں ہے۔ وہ مختلف مصالح کے تحت مختلف قوموں کو باری باری دی جاتی ہے:

إن يمسسكم قرح فقد مس القوم قرح مثله وتلك الأيام نداولها بين الناس (آل عمران ۱۴۰)	اگر تم کو زخم پہنچا ہے تو ان لوگوں کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے۔ اور (فتح و شکست کے) یہ دن ہم لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں۔

اسپین کی سیاسی شکست کے معاملہ میں اور موجودہ زمانہ میں اس قسم کی دوسری شکستوں کے معاملہ میں ہمارے علماء اور دانشور جس طرح تبصرہ کرتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امت کے اہل علم کا پورا طبقہ اس آیت کو بھول گیا ہے۔ ہمارے تقریباً تمام لکھنے اور بولنے والے اس طرح کی سیاسی شکستوں کو اعداء اسلام کی سازش کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ قرآن کے مطابق، ایسے تمام واقعات خود خدا کے فیصلہ کے تحت پیش آتے ہیں۔ وہ ایام الاعداء نہیں ہیں بلکہ وہ ایام اللہ ہیں۔

طرز فکر کا یہ فرق بے حد فیصلہ کن ہے۔ سیاسی فتح و شکست کے واقعات کو اگر ایام الاعداء سمجھا جائے تو اس سے فریاد اور احتجاج کا ذہن بنتا ہے۔ جو صرف مزید نقصان کا باعث ہے۔ اس کے برعکس اگر ان واقعات کو ایام اللہ سمجھا جائے تو قوانین فطرت پر غور کرنے کا مزاج بنے گا پیش آنے والے مسئلہ کو ظلم کے بجائے چیلنج کے روپ میں لیا جائے گا۔ لوگوں کی ساری توجہ اپنی کمیوں کو دور کرنے اور از سر نو زیادہ موثر منصوبہ بندی میں لگ جائے گی۔ یہاں تک کہ ہاری ہوئی بازی دوبارہ نئی شان کے ساتھ جیت لی جائے گی۔ یہی مطلب ہے وانتم الاعلون ان کنتم مومنین کا۔

اُردن کے عربی میگزین (الاجنحۃ (مارچ ۱۹۹۰) میں ایک بار میں نے ایک مصری خاتون لیما نبیل کا مضمون پڑھا۔ انھوں نے اسپین کا سفر کیا تھا اور وہاں عرب دور کے پرعظمت آثار دیکھے تھے، انھوں نے لکھا تھا کہ یہاں میں نے تاریخ النصر العربی کو بھی دیکھا اور تاریخ الذل العربی کو بھی مضمون کے مطابق، انھوں نے رو کر اپنے آپ سے کہا کہ عرب کی یہ تاریک رات آخر کب تک باقی رہے گی (الیٰ متی سیستمر ھذا للیل العربی)

اس کے برعکس راقم الحروف نے جب اسپین کا سفر کیا تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اسپین میں مسلم رات ختم ہوگئی اور وہاں صبح کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہر واقعہ میں تاریک رخ بھی ہوتا ہے اور روشن رخ بھی۔ آپ کے اندر منفی طرز فکر ہو تو آپ تاریک رخ کو دیکھیں گے اور مثبت طرز فکر ہو تو روشن رخ کو۔

۱۹۷۶ کے موسم خریف میں حکومت اسپین کے زیر انتظام ایک پانچ روزہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کا عنوان تھا: المؤتمر الاول لتاریخ إسبانیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسپین کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی اس پہلی عالمی کانفرنس کے ایجنڈا میں جن شہروں کو خصوصی بحث و تحقیق کا موضوع بنایا گیا، ان میں نہ میڈرڈ کا نام تھا، جو موجودہ اسپین کا سیاسی مرکز ہے، نہ برشلونہ شامل تھا جو اسپین کے ثقافتی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ صرف ان شہروں کے تاریخی و تہذیبی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا جن کا تعلق مسلم اسپین سے ہے یعنی اشبیلیہ، قرطبہ، غرناطہ اور مالقہ وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود حکومت اسپین کی نظر میں اپنے ملک کی تاریخ بے معنی اور بے وقعت ہو جاتی ہے اگر اس سے اسلامی دور کو حذف کر دیا جائے۔

مذکورہ کانفرنس میں ایک بڑا عبرت انگیز واقعہ پیش آیا، اس کو ایک عرب دکتور مصطفیٰ الشکعہ نے بیان کیا ہے، جو اس میں شریک تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شکاگو یونی ورسٹی کے نمائندہ ڈاکٹر اسمتھ (Dr Smith) نے کانفرنس میں جو مقالہ پیش کیا وہ اول سے لے کر آخر تک اسلام اور مسلمانوں کے اوپر جارحانہ حملہ تھا۔ حتی کہ اپنی بات ختم کرتے ہوئے انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ اسپین کے باشندوں نے جو سب سے عظیم کارنامہ انجام دیا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے یہاں سے عربوں اور مسلمانوں کو باہر نکال دیا (اعظم عملٍ قام بہ الإسبان ھو طرد العرب والمسلمین من إسبانیا) مناھج المستشرقین، الریاض ۱۹۸۵، ۲/ ۲۷۶

اس کے بعد میڈرڈ یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر مونتابث کھڑے ہوئے اور نہایت پرزور الفاظ میں امریکی مستشرق کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے نہ تاریخ کو پڑھا ہے اور نہ اس کو سمجھا ہے۔ اگر وہ آٹھ سو سال نہ ہوتے جو اسپین نے اسلام اور اسلامی تہذیب کے سایہ میں گزارے ہیں، تو ہمارا ملک کبھی تہذیبی تاریخ کے دور میں نہ داخل ہوتا۔ انھیں آٹھ صدیوں کی بدولت اسپین اس قابل ہوا کہ اپنے پڑوس کے یورپی ملکوں میں علم وثقافت کی روشنی پھیلائے جو اُس وقت جہالت، ناخواندگی اور پس ماندگی کے اندھیرے میں بھٹک رہے تھے:

إنہ لم یقرأ التاریخ ولم یفھمہ..... إسبانیا ما کان لھا أن تدخل التاریخ الحضاري لولا القرون الثمانیۃ التي عاشتھا في ظلّ الاسلام وحضارتہ، وکانت بذلک باعثۃ النور والثقافۃ إلی الاقطار الأوروبیۃ المجاورۃ المتخبطۃ آنذاک في ظلمات الجھل والأمیۃ والتخلف (کتاب مذکور صفحہ ۲۷۷)

ڈاکٹر مونتابث مشہور اسپینی مستشرق فرانسیسکو کوڈیرا زیڈین (Francisco Codera Zaydin) کے شاگرد ہیں۔ کوڈیرا کا سال پیدائش ۱۸۳۶ اور سال وفات ۱۹۱۷ ہے۔ وہ قدیم اسلامی تہذیب و روایات اور عربوں کی محبت سے سرشار تھا (لقد اُشرب کودیرا حبَّ العرب) کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق ایسے خانوادہ سے تھا جو اصلاً عرب تھا۔ جیسا کہ اسپین کے اکثر گھرانوں کا حال ہے۔ عربی زبان سے اس کو اتنا شغف تھا کہ وہ اپنے نام کا تلفظ عربی لہجہ میں اس طرح کرتا تھا: الشیخ فرنسیشکو قدارۃ زَیدِین۔ امیر شکیب ارسلان اس کو کوڈیرا کے بجائے قدیرۃ کہتے تھے۔

کوڈیرا نے اپنی عمر کا بڑا حصہ میڈرڈ یونی ورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے گزارا۔ وہ نہایت ذی علم، اعلیٰ ادبی ذوق اور انصاف پسند طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے اپنے زیر تربیت نوجوانوں میں اسپین کی مسلم تاریخ کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا۔ خود اس نے اس موضوع پر درجنوں ضخیم کتابیں اسپینی اور انگریزی زبانوں میں لکھی۔ اور اپنے بعض طلبہ کے تعاون سے بہت سے قیمتی عربی مخطوطات کی تحقیق کر کے ان کو جدید معیار کے مطابق (Bibliofica Arabico Hispana) کے نام سے شائع کیا۔ اس کی ذہنی وسعت اور انصاف پسندی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ غلط ہوگا کہ اسپین کو یورپی بنانے کی کوشش کی جائے، ضرورت اس بات کی ہے کہ یوروپ کو عربی بنایا جائے (إن من الخطأ العمل على "أوربة" إسبانيا، بل الواجب هو "تعريب" أوروبا)

کوڈیرا کے زیر اثر اسپین میں اسکالروں کا ایک بڑا گروہ تیار ہوا، عربوں اور مسلمانوں کے بارہ میں ان کا نقطۂ نظر حد درجہ انصاف پسندی اور قدردانی پر مبنی ہے۔ یہ لوگ اپنے استاد کی طرف منسوب کرتے ہوئے اپنے آپ کو "بنی کوڈیرا" کہتے ہیں۔ جس سے عربی زبان کے ساتھ ان کے شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔

میڈرڈ کے شمال مغرب میں ایک شہر ال اِسکوریال (El Escorial) ہے۔ یہاں سولہویں صدی کا ایک پرانا چرچ اور ایک تاریخی محل ہے۔ تاہم اس کی عالمی شہرت کا زیادہ بڑا سبب اس کی وہ عظیم شاہی لائبریری (مكتبة الإسكوريال الملكية) ہے، جس کا شمار دنیا کے قدیم اور مالدار ترین کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ اس لائبریری میں نادر عربی مخطوطات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ حتیٰ کہ یہاں پر بعض ایسے عربی مخطوطات محفوظ ہیں جو دنیا کے کسی بھی اسلامی یا غیر اسلامی کتب خانے میں موجود نہیں۔ مثال کے طور پر اسپینی فقیہ اور شاعر ابو اسحاق الالبیری کا دیوان صرف اسکوریال میں ہے۔ جس کا کیٹلاگ نمبر ۴۰۴ ہے۔ یہاں کے عربی مخطوطات کی کئی ببلوگرافیاں تیار کی گئی ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل دو زیادہ معروف ہیں:

1. Bibliotheca Arabic-Hespana Escurialens by Miguel Casiri (Spanish)

2. Les manuscrits arabes de l'Escurial
by H. Derenbong (French)

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب عربوں اور مسلمانوں کو اسپین سے نکالا گیا تو ان کی تمام کتابوں کو یا تو جلا دیا گیا یا دریا میں بہا دیا گیا۔ مگر اسکوریال کے کتب خانہ میں قدیم عربی مخطوطات کی موجودگی اس کی کھلی ہوئی تردید ہے۔

اسکوریال سے اسپینی زبان میں ایک مجلہ نکلتا ہے۔ اس کا نام الاسکوریال میگزین ہے۔ اس میں اکثر کسی نادر عربی مخطوط کی تحقیق ہوتی ہے۔ یا اندلس کے عرب سلاطین، وزراء، اطباء، شعراء، ادباء، فلاسفہ اور سائنس دانوں کے بارہ میں اسپینی اہل علم اور ریسرچ اسکالرس کے تحقیقی مقالات شائع کیے جاتے ہیں۔

مسجد قرطبہ ایک دریا کے کنارے واقع ہے جس کو وادی الکبیر (Guadalquivir) کہا جاتا ہے۔ اقبال نے اپنی نظم "مسجد قرطبہ" میں اس کے حوالے سے دو شعر کہے تھے جو یہاں قابل نقل ہیں :

آب روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی　　دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا　　گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

اقبال کا یہ خواب موجودہ زمانہ میں واقعہ بن رہا ہے۔ اب اسپین میں نئی اسلامی تاریخ بننا شروع ہوگئی ہے۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں جس عمل کا آغاز ہو جائے وہ آخر کار اپنی انتہا تک پہنچ کر رہتا ہے۔

اسپین کے سفر پر روانگی سے چند دن پہلے ڈاک سے مجھے ایک کتاب ملی۔ ۴۸۵ صفحہ کی یہ انگریزی کتاب بمبئی (ہندو ویویک کیندر) سے چھپی ہے۔ اس کا نام ہے اسلام کا خطرہ :

B.N. Jog, Threat of Islam: Indian Dimensions,
I, Purvanchal, Navghar Marg, Bombay 400081

اس کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام ساری دنیا کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ کیونکہ وہ دوسرے مذہب اور کلچر کے ساتھ پر امن طور پر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اسلام کے مسئلہ کا حل صرف ایک ہے، یعنی اسلام کا مکمل خاتمہ۔ اس معاملہ میں ساری دنیا کو اسپین کے نمونہ کو اختیار کرنا ہے۔ اسپین نے اسلام اور

مسلمانوں کو مکمل طور پر اپنے یہاں سے خارج کر دیا۔ اسی طرح ہندستان اور دوسرے ملکوں کو چاہیے کہ وہ ان کو اپنے یہاں سے خارج کر دیں۔ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔

یہ بات اس مفروضہ پر کہی گئی ہے کہ اسپین سے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے خارج کر دیا گیا ہے۔ حالاں کہ یہ بات واقعہ کے مطابق نہیں۔ پھر جو اسپین خود اسپین میں نہیں بنا وہ دوسرے کسی مقام پر کیسے بن جائے گا۔

مصنف نے بالواسطہ انداز میں اعتراف کیا ہے کہ ۱۹۲۵ میں آر ایس ایس کی تنظیم اسی خاص مقصد کے لیے بنائی گئی۔ مگر سوال یہ ہے کہ ۷۰ سال کی لمبی مدت میں آر ایس ایس نے کیا کیا۔ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ ۱۹۲۵ میں سارے برصغیر ہند میں مسلمانوں کی جو مجموعی تعداد تھی اس سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی آج صرف منقسم انڈیا میں ہے۔ گویا آر ایس ایس کی ساری کوششوں کے باوجود اسلام کا قافلہ برعکس سمت میں سفر کر رہا ہے۔

اب بیسویں صدی کے آخر میں جو لوگ اس قسم کی کتابیں چھاپ رہے ہیں وہ صرف نادانی کر رہے ہیں۔ کیوں کہ اب زمانہ مزید سفر کر کے ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے کہ انسان کو صرف دو قسم کی کتابیں پڑھنے سے دل چسپی ہے ——— کیریر بنانے والی کتابیں یا تفریحی کتابیں۔ اور مذکورہ بالا کتاب یقینی طور پر ان دونوں میں سے کسی قسم میں نہیں آتی۔

یکم دسمبر کو یہاں سے واپسی کا دن تھا۔ صبح کو فجر کی نماز میڈرڈ کے ہوٹل میں پڑھی۔ مسلم عہد میں میڈرڈ کا علاقہ بھی مسلم سلطنت میں شامل تھا۔ میں نے سوچا کہ اگرچہ ہوٹل کے اس کمرہ میں نہیں، مگر جہاں یہ ہوٹل کھڑا ہے، عین ممکن ہے کہ اس زمین پر اللہ کے کسی بندہ نے سجدہ کیا ہو۔ عین ممکن ہے کہ یہاں کی فضائیں کسی مومن کی آہوں اور آنسوؤں کی امین ہوں۔

مسلم دور حکومت میں میڈرڈ کا نام مجریت (majrit) تھا۔ یہی لفظ بدل کر اب میڈرڈ بن گیا ہے۔ مسلم عہد کے ایک عالم فلکیات ابوالقاسم مسلمہ (وفات ۱۰۰۷ء) میڈرڈ میں پیدا ہوئے تھے۔ اسی لیے ان کو المجریتی کہا جاتا ہے۔

دور قدیم میں یہاں مسلمانوں کا ایک چھوٹا قلعہ تھا۔ یہ قلعہ اب میڈرڈ میں موجود نہیں۔ مگر آج وہاں اس سے زیادہ شاندار ایک اسلامک سنٹر کھڑا ہوا ہے جو سعودی عرب کے مالی تعاون سے

بنایا گیا ہے۔ یہ موجودہ یورپ کا سب سے بڑا اسلامک سنٹر ہے۔ اس کی تعمیر پر ۲۰ ملین ڈالر خرچ ہوئے۔ وہ ۲۰ ہزار اسکوائر میٹر رقبہ میں واقع ہے۔

قدرتی طور پر میری خواہش تھی کہ میں میڈرڈ کے اس اسلامی مرکز میں جاؤں اور اس کی مسجد میں دو رکعت نماز پڑھوں۔ مگر چاہنے کے باوجود میں وہاں جا نہ سکا۔ یکم دسمبر کو میڈرڈ سے روانگی کا دن تھا۔ مجھ کو اور کئی دوسرے لوگوں کو صبح کے وقت ایرپورٹ جانا تھا۔ منتظمین کانفرنس نے ہمارے لیے مشترک سواری کا انتظام کیا تھا۔ مگر میں مشترک سواری میں نہیں بیٹھا۔ اس کے بجائے میں نے یہ کیا کہ کچھ سویرے میں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور ایک ٹیکسی لے کر روانہ ہوا۔

ٹیکسی والے سے میں نے کہا کہ تم مجھ کو سیدھے ایرپورٹ نہ لے جاؤ۔ بلکہ اسلامک سنٹر کی طرف سے گزارتے ہوئے ایرپورٹ لے چلو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ میڈرڈ کے مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے آخر کار میں وہاں پہنچا جہاں خوب صورت اور عالی شان اسلامی مرکز اسپین کی سرزمین پر کھڑا ہوا ہے۔ اس کو دیکھ کر میرا عجیب احساس ہوا۔ میں نے سوچا کہ ہندستان میں کچھ مسلم دانشور مسلمانوں کو ڈرا رہے ہیں کہ تمہارے دشمن ہندستان کو تمہارے لیے دوسرا اسپین بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے بجائے ان مسلم دانشوروں کو یہ کہنا چاہیے کہ اے مسلمانو مطمئن رہو۔ جس دنیا میں پہلا اسپین بھی نہ بن سکا وہاں دوسرا اسپین آخر کیسے بنے گا۔

میڈرڈ کے اسلامی مرکز کے ڈائرکٹر اس وقت ڈاکٹر عبدالعزیز السرحان ہیں۔ انھوں نے رابطہ عالم اسلامی کے تعاون سے ۹۶ - ۱۹۹۵ کے لیے ایک دو سالہ منصوبہ بنایا ہے۔ اس دوران اساتذہ کی تربیت، عربی زبان کی تعلیم، اسلامی مسیحی ڈائیلاگ وغیرہ پر وگرام منعقد کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اکتوبر ۱۹۹۹ میں امام ابن حزم کی یاد میں ایک بڑی کانفرنس کی جائے گی۔

میڈرڈ کے اس اسلامک سنٹر کا افتتاح ۲۴ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ (ستمبر ۱۹۹۱) میں ہوا۔ اسپین کے بادشاہ جان کارلوز (King Juan Carlos) نے اس کا افتتاح کیا۔ اس افتتاحی تقریب کی باتصویر رپورٹ المجلۃ (۱۳ اکتوبر ۱۹۹۲) میں چھپی تھی۔ المجلہ نے اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا تھا کہ اسلام کا منارۂ اذان پانچ سو سال کے بعد پھر اسپین میں واپس آتا ہے (المئذنة الاسلامية تعود الى اسبانيا بعد ٥٠٠ عام)

ریاض کے اخبار العالم الاسلامی (۴ اکتوبر ۱۹۹۲) نے یہ خبر اس عنوان کے ساتھ شائع کی تھی کہ میڈرڈ میں اسلامی ثقافتی مرکز کا افتتاح اسپین اور مسلمانوں کے لیے فخر کی بات ہے (افتتاح المرکز الثقافی الاسلامی فی مدرید مفخرۃ لاسبانیا والمسلمین) اس سنٹر میں مسجد، ہال، کالج، لائبریری قائم کیے گئے ہیں۔ نیز یہاں سے اسپینی زبان میں لٹریچر اور میگزین شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے ہال میں بیک وقت عربی، اسپینی، انگریزی زبانوں میں فوری ترجمہ کا انتظام ہے۔

شاہ اسپین نے (المجلہ کی رپورٹ کے مطابق) اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ اسپین اپنے مسلم ماضی پر فخر محسوس کرتا ہے (اسبانیا تشعر بالفخر بماضیھا)

ہندستان میں کچھ لکھنے اور بولنے والے مسلمان یہ انکشاف کرنے میں مشغول ہیں کہ ۱۹۴۷ سے پہلے کچھ ہندو لیڈر اسپین گئے۔ اس سفر کا مقصد یہ جاننا تھا کہ اسپین سے کس طرح مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا گیا تاکہ آزادی ملنے کے بعد اسی عمل کو دہرا کر ہندستان کو دوسرا اسپین بنایا جا سکے۔

اسپین کی سڑکوں پر چلتے ہوئے مجھے یہ بات مضحکہ خیز حد تک بے معنی نظر آئی۔ ظاہر ہے کہ اسپین سے مسلمانوں کا استیصال کوئی جاری عمل نہیں ہے جس کو کوئی شخص وہاں جا کر دیکھے۔ مسلمانوں کے خلاف جو کچھ بھی ہوا، وہ ماضی کا واقعہ ہے نہ کہ حال کا واقعہ۔ آج کے اسپین میں کہیں بھی کوئی شخص یہ نہیں دیکھ سکتا کہ مسلمانوں کے مفروضہ خاتمہ کے لیے وہاں کیا کیا گیا تھا۔ یہ واقعہ آج صرف لائبریریوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کو اسپین کے محلوں اور شہروں میں ہوتا ہوا نہیں دیکھا جا سکتا۔

مزید یہ کہ آج کے اسپین میں جو شخص گھومے گا وہ بالکل برعکس تاثر لے کر واپس ہوگا۔ کیوں کہ آج وہ وہاں دیکھے گا کہ عبد الرحمٰن الداخل کو خود اہل اسپین نے دوبارہ تلوار بدست اپنی سرزمین پر کھڑا کر دیا ہے۔ وہ پائے گا کہ آج خود اسپین کی راجدھانی میں نہایت شاندار طور پر نئی مسجد اور نیا اسلامی مرکز بنایا گیا ہے۔ اس طرح آج وہاں جانے والا آدمی جگہ جگہ ایسے واقعات سے دوچار ہوگا جو اس کو بتائیں گے کہ اسپین کی پچھلی نسل نے اگر مسلمانوں کے خلاف زیادتی کی تھی تو اسپین کی موجودہ نسل اس قدیم پالیسی کو چھوڑ کر آج مسلمانوں کا استقبال کر رہی ہے۔ چنانچہ آج اسپین میں مسلمان قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں اور آزادانہ طور پر وہاں پر امن زندگی گزار رہے ہیں۔

صبح ۷ بجے ہوٹل سے نکلا۔ میڈرڈ کے مختلف حصوں سے گزرتی ہوئی آخر کار ہماری گاڑی

ایرپورٹ پہنچ گئی۔ میڈرڈ کا ایرپورٹ دوسرے ترقی یافتہ شہروں کے ایرپورٹ کے مقابلہ میں کم منظم دکھائی دیا۔ مثلاً یہاں مجھ کو جو بورڈنگ کارڈ دیا گیا اس پر گیٹ کا نمبر لکھا ہوا نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گیٹ نمبر عین بورڈنگ کے وقت مائک پر اناؤنس کیا جاتا ہے یا مخصوص بورڈ پر لکھ دیا جاتا ہے۔

میڈرڈ سے فرینکفرٹ کے لیے ایبیریا کی فلائٹ نمبر ۳۵۰۸ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز میں مطالعہ کے لیے صرف اسپینی زبان کے اخبارات تھے۔ اس لیے میں خلاف معمول دورانِ پرواز کسی اخبار کو نہ پڑھ سکا۔ جہاز مسافروں کو لیے ہوئے تیزی سے فضا میں اڑ رہا ہے اور مجھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ایک خواب دیکھا تھا جو اب اپنی تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔ اسپین جانے کا شوق تو یقیناً مجھے تھا مگر مجھ کو یقین نہیں تھا کہ میں کبھی اسپین کا سفر کر سکوں گا۔ بظاہر یہ ایک نہ ہونے والی بات نظر آتی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ میرے اسفار کا یہ خانہ بھی پورا ہو جائے۔ چنانچہ اچانک ایک روز ڈاک سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا۔ اس کے بعد لمبا وقفہ پڑا اور وہاں سے مزید کوئی اطلاع نہیں ملی۔ دوبارہ اچانک آغاز سفر کے صرف دو دن پہلے ٹیلی فون پر وہاں سے بتایا گیا کہ میرے سفری کاغذات بھیج دیے گئے ہیں۔ اس کو ایر فرانس سے حاصل کرلیں۔

جہاز فرینکفرٹ کے قریب پہنچا تو پائلٹ نے مائک پر اعلان کیا کہ فرینکفرٹ ایرپورٹ پر ٹرافک کی وجہ سے ہم تقریباً پندرہ منٹ تاخیر کے ساتھ لینڈ کر سکیں گے۔ ریلوے میں اگر اگلے اسٹیشن کی پٹری خالی نہ ہو تو ٹرین پچھلے اسٹیشن پر ٹھہرا دی جاتی ہے۔ ہوائی جہاز کے لیے فضا میں ٹھہرنا ممکن نہیں۔ اس لیے ہمارا جہاز فرینکفرٹ کے اوپر اس طرح منڈلانے لگا جس طرح چیل بعض اوقات فضا میں منڈلاتی ہے۔ کچھ دیر تک اس طرح منڈلانے کے بعد کسی قدر تاخیر کے ساتھ جہاز ہوائی اڈہ پر اُترا۔

یہ "فرق" زندگی کا ایک اصول ہے۔ ہوائی جہاز کا پائلٹ اگر اس فرق کو نہ جانے اور اگلے ایرپورٹ کی طرف سے میسج ملنے کے بعد وہ جہاز کو فضا میں ٹھہرا دے۔ یا ٹرین کے ڈرائیور کو جب اگلے اسٹیشن کی طرف سے سگنل نہ ملے تو وہ گول دائرہ میں ٹرین کو گھمانے کا فیصلہ کرے تو یہ دونوں کے لیے تباہ کن ہوگا۔ ایسے جہاز کا پائلٹ بھی اپنے جہاز کو تباہ کر دے گا اور ایسی ٹرین کا ڈرائیور بھی اپنی ٹرین کو۔

فرینکفرٹ دنیا کے چند اہم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ یہ شہر نہایت مہنگا ہے۔ مگر یہاں ہر قسم کی اعلیٰ سہولتیں موجود ہیں۔ فرینکفرٹ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عالمی نمائشوں کے لیے مشہور ہے۔ یہاں بہت بڑا نمائشی میدان ہے اور اس میں سال بھر مختلف قسم کی نمائش لگی رہتی ہے۔

۵ اکتوبر سے ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۴ تک یہاں عالمی بک فیر لگی تھی۔ اس میں عالمی اداروں نے اپنی مطبوعات برائے نمائش رکھی تھیں۔ یہ نمائش عام شہریوں کے لیے نہیں تھی۔ بلکہ ان لوگوں کے لیے تھی جو بک ٹریڈ میں ہیں۔ چنانچہ دنیا بھر سے پبلشر، ڈسٹری بیوٹر اور بک سیلر یہاں آئے تھے۔

ایک صاحب کے تعاون سے فرینکفرٹ کی اس نمائش میں الرسالہ بک سنٹر کا بھی ایک اسٹال رکھا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر ثانی اثنین نے دہلی سے فرینکفرٹ کا سفر کیا تھا۔ الرسالہ کے اسٹال پر مختلف ملکوں کے بہت سے لوگ آئے اور لٹریچر کو پسند کیا۔ خاص طور پر انھیں اس بات پر حیرت تھی کہ ہندستان میں ایسی معیاری کتابیں چھپ رہی ہیں۔ کافی لوگوں نے لٹریچر طلب کیا۔ انسائیکلوپیڈیا آف قرآن کے لیے خاص طور پر بڑی بڑی فرمائش نوٹ کرائیں۔

فرینکفرٹ جرمنی کا سب سے بڑا صنعتی شہر ہے۔ جرمنی کی ایک اہمیت یہ ہے کہ یہاں بہت سے بڑے بڑے مستشرق پیدا ہوئے۔ استشراق دراصل نوآبادیاتی دور کے ایک مظہر کے طور پر پیدا ہوا۔ چنانچہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپ میں بڑے بڑے مستشرق پیدا ہوئے۔ مگر بیسویں صدی میں اس قسم کے مستشرق نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب زیادہ اعلیٰ ذہن دوسرے علمی میدانوں میں چلے جاتے ہیں، جہاں انھیں اپنی صلاحیتوں کی زیادہ قیمت مل سکتی ہے، وہ استشراق کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جرمنی میں بھی بہت سے بڑے بڑے مستشرق پیدا ہوئے۔ تاریخ طبری کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ وہ ضائع ہو چکی ہے۔ لیکن جرمن مستشرق گڈ فریڈ بکارٹن نے اس کا مخطوطہ حاصل کیا اور برسوں کی محنت کے بعد اس کو درست کر کے شائع کیا۔ اسی طرح ایک اور جرمن مستشرق پروفیسر ساخو جس نے طبقات ابن سعد پر غیر معمولی محنت کر کے اس کو مکمل شائع کیا۔ وغیرہ

مستشرقین نے قدیم عربی کتابوں کو ایڈٹ کر کے شائع کرنے میں انتہائی دیانت داری سے کام لیا ہے۔ تاہم جہاں تک خود ان کی اپنی تحریروں کا تعلق ہے، اپنے علم کی وسعت کے باوجود انھوں

جنگ میں وہ برطانیہ کے مقابلہ میں جرمنی کا ساتھ دیں۔ اس کا عنوان تھا ترکوں کا انتخاب :

The Choice of the Turks

مولانا محمد علی کا یہ طویل مضمون الفاظ کا ایک جنگل تھا جو تدبیر اور دور اندیشی سے یکسر خالی تھا۔ تاہم اس مضمون کی بنا پر نہیں بلکہ ترکی کے جذباتی وزیر جنگ انور پاشا کے جلد بازانہ اندازہ (hasty calculation) کی وجہ سے ترکی جرمنوں کی حمایت میں جنگ میں کود پڑا۔ اگرچہ ترک کیبنٹ کی اکثریت کی رائے یہ تھی کہ ترکی کو اس معاملہ میں غیر جانب دار (neutral) رہنا چاہیے۔

حالات کے عین فطری تقاضے کے تحت اس جنگ میں برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کو فتح حاصل ہوئی اور جرمنی اور اس کے ساتھیوں کو بری طرح شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے قدرتی نتیجہ کے طور پر بعد از جنگ سودا بازی (Postwar bargaining) شروع ہوئی۔ فاتح طاقتوں نے ترکی کی عثمانی خلافت کو تقسیم کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

مثلاً روس نے درۂ دانیال پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے شام پر اپنی بالادستی قائم کر لی۔ برطانیہ نے مصر کو اپنے سیاسی دائرہ میں شامل کر لیا۔ فلسطین کو ایک انٹرنیشنل علاقہ قرار دے دیا گیا۔ ۲ نومبر ۱۹۱۷ کو بالفور ڈکلریشن (Balfour Declaration) جاری ہوا جس میں یہودیوں کے لیے فلسطین میں ایک نیشنل ہوم بنانے کا وعدہ کیا گیا۔ وغیرہ۔ (13/790)

عثمانی خلافت کا خاتمہ اور فلسطین کے محاذ پر پسپائی جیسے حادثات جن کو نادان لوگ کمال اتاترک اور یاسر عرفات کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں، وہ حقیقۃً انور پاشا اور محمد علی جیسے لیڈروں کے حصہ میں جاتا ہے جن کے پاس جذبات کا سرمایہ تو ضرورت سے زیادہ تھا مگر بصیرت کا سرمایہ ضرورت سے بہت کم۔

دوسری عالمی جنگ میں جرمنی کی جذباتی قیادت کے نتیجہ میں دوبارہ جرمنی کو شکست ہوئی۔ فاتح قوموں (برطانیہ، امریکہ، روس) نے جرمنی کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ ایک کو ایسٹ جرمنی کہا گیا اور دوسرے کو ویسٹ جرمنی۔ یہ تقسیم یہاں تک پہنچی کہ دونوں حصوں کے درمیان ۱۹۶۱ میں عظیم برلن وال کھڑی کر دی گئی۔ مگر جیسے ہی سوویت یونین کمزور پڑا خود جرمنوں نے نومبر ۱۹۸۹ میں اس دیوار کو توڑ کر گرا دیا اور دونوں حصے مل کر دوبارہ ایک ملک بن گئے۔

ایک بار میں نے پاکستان کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے کہا کہ اسی طرح انڈیا اور پاکستان کو بھی دوبارہ مل جانا چاہیے۔ موجودہ مصنوعی حدبندی کو اگر ختم کر دیا جائے تو اس میں دونوں کو فائدہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ جرمنی میں تو دونوں حصوں کے لوگ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں مذہبی اعتبار سے بھائی بھائی تھے۔ مگر یہاں کا معاملہ یہ ہے کہ دونوں کا مذہب الگ الگ ہے۔ مزید یہ کہ ہندو فرقہ اکثریت میں ہے۔ اگر ایسا غیر مساوی اتحاد کیا گیا تو ہندو اپنی اکثریت کے زور پر ہم کو نگل جائے گا۔

میں نے کہا کہ یہ ایک لغو بات ہے۔ یہ اسلام کی نظریاتی طاقت سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ خود پاکستان کی تاریخ اس اندیشہ کی تردید کے لیے کافی ہے۔ پاکستان کا علاقہ ہمیشہ سے مسلم علاقہ نہیں تھا۔ آج وہاں ایک سو ملین سے زیادہ مسلمان پائے جاتے ہیں۔ جب کہ ہندوؤں کی تعداد بمشکل صرف ۱۰ لاکھ ہے۔ مگر شروع میں جب مسلمان اس علاقہ میں آئے تو وہاں آبادی کا تناسب اس کے بالکل برعکس تھا۔ پھر ماضی کے اس تجربہ کے باوجود مستقبل کے لیے آپ لوگ اس قدر خوف اور مایوسی میں کیوں مبتلا ہیں۔ آپ لوگ کیسے مسلمان ہیں کہ آپ کی نگاہ ہندو کی عددی برتری پر تو ہے مگر آپ کی نگاہ اسلام کی نظریاتی برتری پر نہیں۔

جرمنی میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چار فی صد ہے۔ یہاں تقریباً چالیس اسلامی تنظیمیں ہیں۔ پہلی عالمی جنگ میں ترکی جرمنوں کے ساتھ تھا۔ اس طرح جنگ کے دوران فوجی خدمت کے تحت ترکی اور یوگوسلاویہ کے حامی مسلمان جرمنی پہنچے۔ انھوں نے یہاں پہلی مسجد بنائی۔ اب یہاں کے تقریباً ہر شہر میں بڑی تعداد میں مسجدیں اور اسلامی مراکز ہیں۔ ان کے ساتھ تعلیمی ادارے بھی قائم ہیں۔ ان اداروں میں دس ہزار سے زیادہ مسلم بچے قرآن اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

جرمنی کے ایک شہر ہائیڈلبرگ میں ۱۹۹۱ میں ایک بڑی اسلامی مؤتمر ہوئی۔ اس کا شعار تھا: الا ان نصر اللہ قریب۔ ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ حالات میں اس شعار میں قومیت کی بو محسوس ہوتی ہے۔ یہ گویا قومی مقصد کے لیے قرآن کا استعمال ہے۔ اس کے بجائے زیادہ بہتر یہ تھا کہ کسی دعوتی آیت کو شعار بنایا جائے۔ راقم الحروف نے تقریباً چالیس سال پہلے اعظم گڑھ کی نمائش میں ایک اسلامی اسٹال لگایا تھا۔ اس میں عمودی (vertical) انداز میں ایک بہت اونچا بورڈ نصب کیا تھا جس پر یہ آیت مع ترجمہ لکھی ہوئی تھی: واللہ یدعو الی دار السلام۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۹۴ کو بون (جرمنی) میں سبھاش چندر بوس پر ایک سیمنار ہوا۔ اس کو یہاں کے ہندستانی سفارت خانہ نے اسپانسر کیا تھا۔ سبھاش چندر بوس ۴۳-۱۹۴۱ میں جرمنی میں رہے تھے۔ ان کے جرمنی آنے کا مقصد یہ تھا کہ برٹش راج ختم کرنے کے لیے جرمنی سے مدد حاصل کی جائے۔ اس وقت جرمنی میں نازی پارٹی کی حکومت تھی۔

لوئی فشر نے اپنی کتاب لائف آف مہاتما گاندھی میں لکھا ہے کہ سبھاش چندر بوس ایک طوفانی آدمی تھے جن کا کہنا تھا کہ مجھ کو خون دو، اور میں تم سے آزادی کا وعدہ کرتا ہوں۔ اس نعرہ کی وجہ سے ان کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی (صفحہ ۲۵۶)

سبھاش چندر بوس (اور جواہر لال نہرو) اس زمانہ میں نوجوانوں کے مقبول رہنما بنے ہوئے تھے۔ وہ دونوں فوراً آزادی چاہتے تھے اور اس کے لیے باقاعدہ لڑائی چھیڑنے کے لیے تیار تھے۔ دونوں مہاتما گاندھی کے مصالحانہ رویہ پر نہایت سخت احتجاج کر رہے تھے (صفحہ ۲۶۱) ان کے اثر سے گاندھی جی کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ تک انڈیا کو آزاد کر دیا جائے، ورنہ میں یک طرفہ طور پر آزادی کا اعلان کر دوں گا اور اپنی تمام کشتیاں جلا ڈالوں گا (صفحہ ۲۵۷)

سبھاش چندر بوس مہاتما گاندھی کے سخت مخالف تھے (۲۶۹) گاندھی جی کا نظریہ پر امن جدوجہد کا تھا، جب کہ سبھاش چندر بوس کھلے طور پر تشدد کی بات کرتے تھے اور برطانیہ کے خلاف مسلح بغاوت (armed revolt) کے وکیل تھے (۳۴۲) لوئی فشر نے ۲۵ جون ۱۹۴۶ کو نئی دہلی میں گاندھی جی سے ملاقات کی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے گاندھی جی سے کہا تھا کہ سبھاش چندر بوس ۱۹۴۴ میں جرمنی گئے۔ اگر ان کا خیال تھا کہ وہ جرمنی سے مدد لے کر انڈیا کو بچا سکتے ہیں تو وہ ایک بیوقوف آدمی تھے اور سیاسی لیڈر بے وقوفی کا تحمل نہیں کر سکتا:

> Bose went to Germany. If he believed that India would be saved by Germany, he was stupid, and statemen cannot afford to be stupid. (p. 442)

نیتاجی سبھاش چندر بوس نے انڈین نیشنل آرمی کے نام سے ایک آزاد فوج بنائی تھی۔ اس کے ایک کیپٹن ڈاکٹر رتن چند (سری گنگا نگر) تھے۔ انھوں نے اپنی یادداشت شائع کی ہے جس کا عنوان ہے: ایک شام نیتاجی کے ساتھ۔ اس میں وہ ۲۰ دسمبر ۱۹۴۴ کی ایک میٹنگ کا حال بیان

کرتے ہیں جب کہ نیتاجی برما کے باتو پہاٹ آفیسرز ٹریننگ اسکول کی سالانہ تقریب میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ دو سوال وجواب یہ تھا :

سوال : آپ کہتے ہیں کہ ہتھیار بند انقلاب کے بغیر ہندستان آزاد نہیں ہو سکتا۔ تو سوال یہ ہے کہ ہتھیاروں کا انتظام کیسے ہوگا ؟

جواب : ہندستان میں بہت سے ہتھیار پہلے ہی سے موجود ہیں۔ آپ لوگوں کا کام ان کو چھیننا اور ان کو اپنے استعمال میں لانا ہے۔ مثال کے طور پر میں چٹاگانگ کے اسلحہ خانہ کی ڈکیتی کا ذکر کرتا ہوں۔ جس طرح وہاں سے ہتھیار چھینے گئے تھے اسی طرح اگر ہندستانی کوشش اور ہمت کریں تو باہر سے ہتھیار لانے کی ضرورت نہ رہے گی۔

سوال : جاپانیوں نے ہماری سرکار کو تسلیم کیا ہے۔ ہمیں ہر طرح کی مدد بھی دے رہے ہیں۔ مگر وہ ہماری عزت نہیں کرتے۔ ان کے سپاہی ہمارے افسروں کو سلوٹ تک نہیں کرتے۔ پورٹ ڈکسن میں جب ہم جاپانیوں سے ٹریننگ لینے گئے تھے تو ہم نے اپنے جاپانی انسٹرکٹر سے کہا کہ آپ ہمیں ایک آزاد حکومت کے افراد تسلیم کرتے ہوئے بھی ہمارے افسروں کی عزت نہیں کرتے۔ جاپانی انسٹرکٹر نے جواب دیا کہ آپ کی آزاد حکومت آخر بنائی ہوئی کس کی ہے ؟

جواب : چند ایک افراد کے غلط رویہ اور بد دماغی کے کارن ہم سب جاپانیوں کو برا نہیں کہہ سکتے۔ (ہند سماچار، جالندھر، ۲۳ جنوری ۱۹۹۵)

فرینکفرٹ سے دہلی کے لیے لفتھانسا کی فلائٹ نمبر ۷۰۰ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز چلنا شروع ہوا تو اعلان کرنے والی خاتون نے خالص ہندی لہجہ میں یہ الفاظ کہے : لفتھانسا کی اس اڑان پر ہم آپ کا ہاردک سواگت کرتے ہیں۔ لفتھانسا ایک جرمن کمپنی ہے۔ مگر اس کی موجودہ پرواز میں زیادہ تر ہندستانی مسافر ہیں۔ اس لیے مسافروں کی رعایت سے انھوں نے کلام کا یہ انداز اختیار کیا۔

تاجر کو جو تعلق اپنے گاہک سے ہوتا ہے، داعی کو وہی تعلق اپنے مدعو سے ہوتا ہے۔ لوگوں میں اگر دعوتی جذبہ آجائے تو وہ اپنے مدعو کے لیے اسی طرح سراپا ہمدردی بن جائیں گے۔ وہ یک طرفہ طور پر مدعو کی رعایت کریں گے۔ وہ اپنے جذبات سے زیادہ مدعو کے جذبات کا لحاظ کریں گے۔ تاجر اگر اپنے گاہک کی رعایت نہ کرے تو وہ اپنے گاہک کو کھو دے گا، اسی

طرح داعی اگر اپنے مدعو کی رعایت نہ کرے تو وہ مدعو کو دور کرنے کا سبب بن جائے گا۔

۳۰ نومبر کی رات کو لفتھانسا کی فلائٹ میں میرے لیے جو کھانا آیا، اس کی پیکنگ پر جرمن میں میرا نام چھپا ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ جرمن اور انگریزی میں لکھا ہوا تھا کہ اپنی پسند کے کھانے کا لطف اٹھائیے :

enjoy your meal

دہلی میں رزرویشن کے وقت یہ لکھوا دیا گیا تھا کہ مجھے سفر میں انڈین ویجیٹیرین میل چاہیے۔ حسب قاعدہ یہ ہدایت ہر جگہ کے کمپیوٹر پر ریکارڈ ہو گئی۔ چنانچہ اس سفر میں آتے اور جاتے ہوئے میں نے چار جہاز استعمال کیے جو تین مختلف کمپنیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ہر ایک میں خود بخود "اسپشل میل" کے لیبل کے ساتھ میرا مطلوب کھانا میرے لیے آتا رہا۔ موجودہ جہاز جس میں میں نے فرینکفرٹ سے دہلی کا سفر کیا، اس میں تقریباً ساڑھے چار سو سیٹیں تھیں۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں کمپوٹر اور انڈسٹریل تہذیب نے کیسا نظام بنایا ہے اور کس طرح وہ عالمی سطح پر نہایت صحت کے ساتھ کام کر رہا ہے۔

یہ فرینکفرٹ سے دہلی کے لیے نان اسٹاپ فلائٹ تھی۔ ساڑھے سات گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد رات کو ڈیڑھ بجے ہمارا جہاز دہلی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ یہاں جہاز سے نکل کر باہر جانے کے لیے آدمی ایک لمبی گیلری سے گزرتا ہے۔ ایک طرف یہ گیلری ہے اور دوسری طرف وسیع انتظار گاہ ہے۔ دونوں کے درمیان شیشہ کی دیوار حائل ہے۔ اس طرح دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔

جس وقت میں گیلری سے دوسرے ہم سفر لوگوں کے ساتھ باہر کی طرف جا رہا تھا۔ اس وقت بہت سے لوگ انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ یہاں اس انتظار میں تھے کہ آگے جانے والے جہاز سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو سکیں۔

اس دنیا میں ہر اسٹیشن اور ہر ایر پورٹ پر یہی منظر دکھائی دیتا ہے۔ ہر وقت کچھ لوگ آتے ہیں اور کچھ لوگ واپس چلے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر آخرت کے اعتبار سے ہے۔ کچھ لوگ پیدا ہو کر دنیا میں آرہے ہیں۔ کچھ اور لوگ اپنی مدتِ قیام پوری کر کے آخرت کی طرف واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ آنا اور جانا اسی طرح جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے اور دو دنیاؤں کے نظام کو ختم کر کے صرف ایک دنیا کا نظام ابدی طور پر قائم کر دیا جائے۔

سفرنامہ فلسطین

سفرنامہ فلسطین

روم کی مسیحی تنظیم (The Community of S. Egidio) کی طرف سے یروشلم میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس میں یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے نمائندے اکٹھا ہوئے۔ اس کی دعوت پر فلسطین کا سفر ہوا۔ ذیل میں اس سفر کی روداد درج کی جاتی ہے۔

۲۶ ستمبر ۱۹۹۵ کی شام کو سفر پر روانگی ہوئی۔ ایرپورٹ کے راستہ میں مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا۔ یہاں کینٹونمنٹ ایریا میں ایک مسجد ہے۔ اس کے چاروں طرف دور تک سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ گاڑی سڑک کے کنارے روک کر مسجد میں پہنچا۔ جماعت کھڑی ہوچکی تھی۔ امام صاحب نے سورہ الکوثر تلاوت کرتے ہوئے کہا: فصل لربك وانحر ان شانئك هو الابتر" دل سے دعا نکلی کی خدایا، تیرے حکم کے مطابق میں نے نماز ادا کرلی۔ اب تو ان شانئك هو الابتر کے وعدہ کو میرے لیے پورا فرما۔ امام صاحب نے بتایا کہ اس مسجد کا نام الحبیبیہ مسجد ہے۔

اس مخصوص علاقہ میں ایک خوب صورت مسجد کو دیکھ کر خیال آیا کہ کچھ مسلم لیڈروں کی نادانی سے اس ملک کے مسلمانوں نے اگرچہ بہت کچھ کھودیا ہے۔ مگر اب بھی یہاں ملک کے طول وعرض میں تقریباً چار لاکھ ایسی مسجدیں موجود ہیں جو اہل توحید کے لیے امید اور اعتماد کا نشان ہیں۔ فیضی کا یہ شعر مسلمانوں کے لیے مزید اضافہ کے ساتھ سچا ثابت ہوا ہے:

گفتہ گرشد زکفم شکر کہ ناگفتہ بجا است از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام

دہلی کے انٹرنیشنل ایرپورٹ پر میں فلائٹ کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ کچھ لوگ خوش پوش اور خوش باش چہرہ کے ساتھ چلتے ہوئے نظر آئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ یہ کہہ رہے ہوں کہ ہم کامیاب ہیں۔ ہماری جیب میں پیسے ہیں۔ ہم اپنی پسند کی کوئی بھی چیز دنیا کے بازار سے خرید سکتے ہیں۔ ہم اپنی راحت اور خوشی کی کوئی بھی قیمت ادا کرسکتے ہیں۔

میرے دل نے کہا کہ کیسا جھوٹا احساس کامیابی ہے جس میں لوگ جی رہے ہیں۔ کاش انھیں اصل حقیقت سے آگاہ کیا جاسکے۔ کاش وہ اس جھوٹے بھرم سے باہر نکل سکیں۔

میرے سفر کا راستہ یہ تھا —— دہلی، بمبئی، تل ابیب، دہلی۔ ایر انڈیا کی فلائٹ ۳۱۱

کے ذریعہ دہلی سے روانگی ہوئی۔ جہاز کا مقرروقت ۹ بجے شام تھا۔ مگر جہاز ڈیڑھ گھنٹہ کی تاخیر سے روانہ ہوا۔ دہلی سے بمبئی کی دوری ۱۱۰۰ کیلومیٹر ہے جو پونے دوگھنٹہ میں پوری ہوئی۔

دوران پرواز ایر انڈیا کی فلائٹ میگزین نمسکار (جولائی۔ اگست ۱۹۹۵) دیکھا۔ اس کے ایک صفحہ پر اوپر کے درجہ کے مسافروں سے کہا گیا تھا کہ فرسٹ کلاس اور ایگزیکٹیو کلاس کے مسافروں کے لیے دوران سفر میں بلا انقطاع تفریح (non-stop entertainment) کا انتظام کیا گیا ہے۔ میری سیٹ کے ساتھ ایر فون رکھا ہوا تھا مگر میں نے اس کو استعمال نہیں کیا۔

اس قسم کی تفریحات نے انسان سے یہ موقع چھین لیا ہے کہ وہ کائنات میں بکھری ہوئی خدا کی تجلیات پر غور کرے اور ان سے اپنی روح کے لیے ربانی غذا حاصل کرے۔ کائنات میں ہر طرف خدائی نغمے بلند ہو رہے ہیں مگر انسان نے "ہیڈ فون" لگا کر اپنے آپ کو اس سے محروم کر لیا ہے کہ وہ زیادہ اعلیٰ نغماتِ خداوندی کو سن سکے۔

بمبئی کے انٹرنیشنل ایرپورٹ پر اترا تو یہاں بہت زیادہ بھیڑ نظر آئی۔ مسلمان اور عرب بھی کافی تعداد میں تھے۔ ایرپورٹ پر لمبی مسافت طے کر کے ایل آل کے کاؤنٹر پہ پہنچا۔ یہاں ایک خاتون نے کہا کہ میں ایل آل کی طرف سے سیکوریٹی چیک کے لیے ہوں۔ اور میں آپ سے سوالات کروں گی۔ یہ خاتون آدھا گھنٹہ تک مجھ سے طرح طرح کے بے معنی سوالات کرتی رہی —— آپ کہاں سے آئے ہیں۔ کہاں جا رہے ہیں۔ آپ کا ٹکٹ کس نے خریدا ہے۔ آپ کو کسی نے کوئی گفٹ دیا ہے۔ آپ کے بیگ میں کیا کیا چیزیں ہیں۔ آپ کا یہ پاسپورٹ نیا ہے پھر پچھلا پاسپورٹ کہاں ہے۔ اس بیگ میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے۔ اگر سب سامان نکال دیا جائے تو بیگ کس کا ہے۔ آپ دہلی میں رہتے ہیں تو دہلی سے کیوں نہیں گئے، بمبئی سے کیوں جا رہے ہیں۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک وہ اس قسم کے سوالات کرتی رہی۔ میں پہلے تو معتدل انداز میں اس کا جواب دیتا رہا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ اس کے سوالات ختم ہی نہیں ہو رہے ہیں تو مجھے غصہ آگیا۔ میں نے کہا:

Who are you foolish girl to ask me such silly questions.

میں نے کہا کہ میں تل ابیب نہیں جاؤں گا۔ میرے کاغذات مجھے لوٹا دو۔ میں اب دہلی واپس جا رہا ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ تم اپنا نام بتاؤ۔ میں تمہاری کمپلینٹ کروں گا اور پھر تم کو سب کچھ معلوم

ہو جائے گا۔ اب وہ گھبرا گئی اور نام بتانے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ آخر میں ایک مرد آیا۔ اس نے کہا کہ تم ان کو مت روکو اور اپنا نام لکھ کر دے دو۔ اس کے بعد اس نے اپنا نام سوسن جیکب (Ms Susan Jacob) لکھا۔ اور فوراً میرا بورڈنگ کارڈ مجھے دے دیا۔ اس کے بعد ایک اور مرد مسٹر نیویل مستری (Naville Mistry) کو میرے ساتھ کر دیا۔ وہ پہلے مجھے ریستوراں میں لے گیا۔ اس کے بعد مجھے گیٹ نمبر ۸ تک پہنچایا جہاں سے مجھے آگے کا جہاز لینا تھا۔

ہندستان میں ساڑھے چھ ہزار یہودی ہیں۔ ان میں سے ساڑھے پانچ ہزار بمبئی میں آباد ہیں۔ بمبئی کی سموئیل اسٹریٹ پر یہودیوں کی ایک عبادت گاہ (synagogue) ہے جو ۱۷۹۶ میں تعمیر کی گئی تھی۔ ہندستان میں یہودی دو ہزار سال پہلے آئے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے برصغیر ہند میں ان کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ بمبئی میں مجموعی طور پر یہودیوں کے نو سینیگاگ موجود ہیں۔ تاہم یہودیوں کی دلچسپی اپنے مذہب سے اتنی کم ہے کہ سموئیل اسٹریٹ کے دو سو سالہ قدیم سینیگاگ میں سنیچر (سبت) کے دن بمشکل دس یہودی اپنی ہفتہ وار عبادت کے لیے آتے ہیں (آفٹر نون، بمبئی، ۳ ستمبر ۱۹۹۵)

بمبئی کے ابو البقا صاحب (عمر ۶۴ سال) نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۵ کی ایک ملاقات میں بتایا کہ بمبئی میں ایران سے آیا ہوا ایک یہودی تھا۔ اس کا نام مسٹر کلاٹی (A.A. Kelaty) تھا۔ اس کی تجارتی فرم کا نام یہ تھا:

Kelaty Trading Company

وہ شیپ کیسنگ (sheep casing) کی سپلائی کا کام کرتا تھا۔ ۱۹۷۱ میں اس کے ساتھ ابو البقا صاحب کی پارٹنر شپ ہوئی۔ کئی سال تک اس کے ساتھ پارٹنر شپ بہت اچھی طرح چلتی رہی۔ اس کے بعد وہ بمبئی چھوڑ کر اسرائیل گیا اور وہاں سے پھر امریکہ چلا گیا۔

جب دونوں میں پارٹنر شپ کی بات ہوئی تو مسٹر کلاٹی نے کہا کہ دیکھئے، آپ مسلمان ہیں، میں ایک یہودی ہوں۔ عرب اور اسرائیل کی نزاع میں میرا آپ کا اختلاف واضح ہے، اس کے باوجود ہمیں اپنی مشترک تجارت کو کامیابی کے ساتھ چلانا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ ہم آپ کبھی عرب اور اسرائیل کے مسئلہ پر بات نہ کریں۔ چنانچہ دونوں اس پر قائم رہے۔ ان کی پارٹنر شپ آخر وقت تک کامیابی کے ساتھ چلتی رہی۔

اسرائیلی ایر لائن کا نام ایل آل (El Al) ہے۔ اس کی فلائٹ نمبر ۸۲ (LY-082) کے ذریعہ بمبئی سے روانگی ہوئی۔ جہاز اپنے وقت پر صبح چار بجے روانہ ہوا۔ جب کہ کیلنڈر میں ۲۱ اگست کی تاریخ ہو چکی تھی۔ یہ سات گھنٹہ کی مسلسل پرواز تھی۔ راستہ میں بار بار نیند آتی رہی۔ اس طرح راستہ آسانی کے ساتھ طے ہو گیا۔

جہاز میں ایک شخص نے میرے چہرہ پر داڑھی اور سر پر پگڑی دیکھ کر کہا کہ کیا آپ سکھ ہیں:

Are you a Sikh

میں نے کہا کہ نہیں، میں مسلم ہوں۔ اگر وہ زیادہ غور کرتا تو ایسا سوال نہ کرتا۔ کیوں کہ میری داڑھی سکھوں کی داڑھی سے مختلف تھی۔ اسی طرح میری سفید پگڑی سوڈانیوں کی پگڑی سے مشابہ تھی نہ کہ سکھوں کی پگڑی سے۔ فرق یہ ہے کہ سوڈانیوں کی پگڑی کافی بڑی ہوتی ہے اور میری نسبتاً چھوٹی۔

جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو نیچے بادلوں کا منظر تھا جس کے اوپر جہاز رینگتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہی منظر ہر جہاز میں اور ہر ملک میں سفر کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اسرائیل کے سفر میں جو منظر مشاہدہ میں آرہا ہے وہی غیر اسرائیل کے سفر میں بھی نظر آتا ہے۔ مگر انسان کا مزاج عجیب ہے۔ وہ مشابہتوں پر دھیان نہیں دیتا اور اختلافات کی طرف زیادہ دوڑتا ہے۔

جہاز اور اس کی سروس دوسرے ملکوں کے جہازوں کے مقابلہ میں معمولی تھی حتی کہ ایر انڈیا کے مقابلہ میں بھی۔ رات کو مسافروں کی تفریح کے لیے جو فلم دکھائی گئی وہ زیادہ تر مار دھاڑ کی فلم تھی۔ کچھ نوجوان گولی مارتے ہوئے اور بم مارتے ہوئے دکھائے گئے جس سے ماحول میں تباہی پھیل گئی۔ میں نے سوچا کہ اسرائیل کی اقتصادیات جنگی اقتصادیات (war-based economy) ہے۔ یہاں کے تمام بہترین وسائل جنگی تیاریوں اور متشددانہ کارروائیوں پر صرف ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسرائیل سنگاپور اور جاپان کی طرح ترقی نہ کر سکا۔

صبح کو کھڑکی کھولی تو سورج کی سنہری روشنی کھڑکی کے راستہ سے اندر داخل ہوئی اور جہاز کے اندر ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ میں نے سوچا کہ سورج اسرائیلی جہاز اور غیر اسرائیلی جہاز میں فرق نہیں کرتا۔ اس کی نفع رسانی ہر ایک کے لیے یکساں طور پہ جاری ہے۔ یہ خدائی اخلاقیات ہے جس کو گویا سورج کے ذریعہ معلوم و مشہود بنایا جا رہا ہے۔

بمبئی اور تل ابیب کے درمیان پرواز کرتے ہوئے ایک انگریزی میگزین ایکشن ایشیا (Action Asia) کا شمارہ اگست۔ستمبر ۱۹۹۵ دیکھا۔یہ میگزین امریکہ سے شائع ہوتا ہے۔یہ دوماہی میگزین ہر اعتبار سے نہایت عمدہ تھا۔امریکہ موجودہ زمانہ میں غیر امریکی ملکوں کا بھی چیمپین بنا ہوا ہے۔

اس میں ایک مضمون کامیاب لوگوں (Achievers) کے بارہ میں تھا۔اس میں بتایا گیا تھا کہ نیپال کے کچھ دریاؤں میں پانی نہایت طغیانی کے ساتھ بہتا ہے۔ان میں کشتی چلانا بہت جوکھم کا کام ہے۔معذور لوگوں کی ایک ٹیم نے طے کیا کہ وہ ان دریاؤں میں عین طغیانی کے زمانہ میں کشتی چلائیں۔انھوں نے سوچا کہ ہم جسم کے اعتبار سے معذور ہیں مگر ہمارا دماغ معذور نہیں :

We are disabled only in body, not in mind.

نومبر ۱۹۹۴ میں چھ معذور افراد نے ہر قسم کے ضروری سامان سے لیس ہو کر اپنی کشتی دریا میں ڈال دی۔انھوں نے ہمت سے کام لے کر کامیابی حاصل کی اور یہ ثابت کیا کہ اعلیٰ کارکردگی کے لیے واحد رکاوٹ صرف وہ ہے جو آدمی خود اپنے اوپر ڈال لے :

A group of disabled adventurers took on the wild white water of Nepal, and proved the only limits to performance are those we impose on ourselves.

بمبئی کے تجربہ کی بنا پر مجھے اندیشہ تھا کہ شاید اسرائیلی ایرپورٹ پر پہنچ کر وہاں بھی اسی قسم کا سخت تر معاملہ پیش آئے۔تاہم یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ وہاں ایرپورٹ پر کانفرنس کے منتظمین موجود ہوں گے اور وہ میرے لیے کافی ہو جائیں گے۔مگر جہاز سے باہر آنے کے بعد وہاں کوئی دکھائی نہیں دیا۔چنانچہ میں دوسرے مسافروں کے ساتھ لائن میں لگ گیا۔یہاں بھی اتفاق سے کھڑکی کے پیچھے ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔مگر اس نے چند معمولی سوال پوچھ کر فوراً ہی میرے پاسپورٹ پر اسٹیمپ ڈال دی اور مجھے رخصت کر دیا۔

باہر آیا تو ڈاکٹر لیونارڈو مل گئے جو میری رہنمائی کے لیے یہاں آئے ہوئے تھے۔ان کے ساتھ کچھ دیر کے لیے وی آئی پی لاؤنج میں بیٹھا۔پھر بذریعہ کار یروشلم کے لیے روانگی ہوئی۔یروشلم یہاں سے تقریباً چالیس کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔جس اسرائیلی ایرپورٹ پر ہمارا جہاز اترا اس کا نام بن گوریان انٹرنیشنل ایرپورٹ ہے وہ لُد (Lod) کے علاقہ میں واقع ہے۔لُد کے

وسیع ایرپورٹ پر جہاں ہمارا جہاز اترا عین اسی مقام پر سفید رنگ کا ایک اونچا مینار تھا۔ یہ مینار اپنی بلندی کی وجہ سے دور سے دکھائی دیتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ مسیح ابن مریم جب نازل ہوں گے تو وہ دجال کا پیچھا کریں گے۔ یہاں تک کہ وہ لُد کے دروازہ پر اس کو پکڑیں گے اور اس کو قتل کر دیں گے (فیطلبہ حتی یدرکہ بباب لُدٍّ فیقتلہ) صحیح مسلم، سنن ابی داؤد وغیرہ

اس مقام کا قدیم نام لُد ہے۔ انگریزی میں اس کو لِڈہ (Lydda) کہتے ہیں۔ حدیث میں جس مقام کا ذکر ہے، ممکن ہے کہ وہ یہی مقام ہو۔ اس کا نام بائبل میں کئی بار آیا ہے۔ اقوام متحدہ نے ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ کو فلسطین کی تقسیم کا جو رزولیوشن پاس کیا تھا اس کے تحت یہ مقام عربوں کو دیا گیا تھا۔ مگر ۱۲ جولائی ۱۹۴۸ کو اسرائیلی فوجوں نے حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے وہ اسرائیل کا ایک حصہ ہے۔ لد کا یہ انٹرنیشنل ایرپورٹ اسرائیل کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ ہے۔

دور آخر میں حضرت مسیح کے نزول کے بارہ میں بعض حضرات نے مختلف رائیں پیش کی ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں:

آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہیں　　یا مجدد، جس میں ہوں فرزند مریم کے صفات

ایرپورٹ سے یروشلم کا سفر بذریعہ کار طے ہوا۔ سڑک نہایت عمدہ تھی۔ دونوں طرف درخت کی قطاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ مگر درختوں پر وہ ہریالی نہ تھی جو ایک ہفتہ پہلے ہریانہ کے سفر میں سڑک کے دونوں طرف میں نے دیکھی تھی۔ اس کی وجہ یہاں بارش کی کمی ہے۔ موسم کافی گرم تھا۔

راستہ میں سڑک کے دونوں طرف بستیاں دکھائی دیں۔ وہ سب کریم کلر کے پتھروں سے بنائی گئی تھیں۔ یروشلم میں داخل ہوا تو تمام عمارتیں اسی قسم کے پتھروں کی نظر آئیں۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ عمارتوں کو پتھر سے بنانے کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ اس کی قدیم وضع کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ تاہم تمام عمارتیں جدید فن تعمیر کے مطابق بنائی گئی تھیں اور خوب صورت تھیں۔

یروشلم کا عرب سیکٹر جغرافی اعتبار سے یہاں کے سب سے بہتر اور خوب صورت علاقہ میں واقع ہے۔

یروشلم کی سڑکوں پر چلتے ہوئے مختلف قسم کے مناظر سامنے آئے۔ دکانوں کے سائن بورڈ میں انگریزی اور عبرانی کے ساتھ عربی زبان کے اندراجات بھی دکھائی دیے۔ مثلاً ٹیلی فون کے ساتھ تلفون وغیرہ۔

سڑک سے گزرتے ہوئے ہم ایک علاقہ میں پہنچے تو میرے گائڈ نے کہا، یہ جیوش ایریا ہے۔ جیوش علاقہ واضح طور پر زیادہ صاف اور کشادہ تھا۔ ایک فرق یہ نظر آیا کہ عرب ایریا میں دکانوں کے آگے لوگ فٹ پاتھ پر کرسیاں بچھائے ہوئے باہر بیٹھے ہیں۔ تجارتی سامان بھی باہر رکھا ہوا تھا۔ مگر یہودی ایریا میں دکانوں کے سامنے نہ کرسی دکھائی دی نہ دکان کے باہر کوئی سامان رکھا ہوا نظر آیا۔ اسی طرح عرب ایریا میں دکانوں سے عربی گیت کی آواز سنائی دے رہی تھی جب کہ یہودی ایریا میں خاموشی کا منظر تھا۔

اسی خوب صورت عرب سیکٹر کے ایک سرسبز رقبہ میں وہ ہوٹل واقع ہے جس میں میرے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس ہوٹل کا نام (Hotel 7 Arches) ہے۔ اس کے کمرہ نمبر ۶۰۲ میں میرا قیام تھا۔ اس کمرہ کے اندر میں داخل ہوا تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ کمرہ کے ایک طرف کی لمبی دیوار جو پوری کی پوری شیشہ کی تھی۔ اس کے اوپر حسب قاعدہ پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے پردہ ہٹایا تو سامنے کھلی دھوپ میں بیت المقدس کا سنہری رنگ کا گنبد چمک رہا تھا۔ وہ اس ہوٹل سے بہت قریب ہے اور میرے کمرہ کے شیشہ سے بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا میرے دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے یروشلم میں میرے لیے بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کے عین پڑوس میں قیام کا انتظام فرمایا۔

میں دیر تک بیت المقدس اور اس کے اردگرد علاقہ کو دیکھتا رہا۔ یہی وہ علاقہ ہے جس کے بارے میں قرآن میں الذی بارکنا حولہ کہا گیا ہے۔ تاریخ مجسم ہو کر سامنے کھڑی ہوئی نظر آئی۔ خلیفہ ثانی عمر فاروق ؓ نے آکر اسی مقام پر نماز ادا کی تھی اور پھر وہاں مسجد بنائی گئی تھی۔ ۱۹۸۲ میں جب میں حج کو گیا تو اکثر بیت اللہ میں داخل ہو کر کعبہ کو دیکھتا رہتا تھا۔ یہاں میں خود اپنے ہوٹل کے کمرہ سے بیت المقدس کو دیکھ رہا ہوں۔ اللہ تعالےٰ نے میرے لیے یہ سعادت بھی مقدر فرمائی تھی۔

دہلی میں میری رہائش ایک ایسے مکان میں ہے جو گویا نئی دہلی اور پرانی دہلی کے درمیان

ہے۔ موجودہ ہوٹل کی نوعیت بھی یہی ہے۔ اس ہوٹل کے ایک طرف جدید یروشلم کی عمارتیں دکھائی دیتی ہیں۔ دوسری طرف قدیم یروشلم ہے جس میں عرب سیکٹر واقع ہے۔ ظہر کا وقت ہوا تو مختلف مسجدوں سے اذان کی آوازیں آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ ہندستان کے شہروں کی طرح یہاں بھی عرب علاقہ کی مسجدوں میں اور خود بیت المقدس میں لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے ہیں اور پانچوں وقت ان سے اذان کی آوازیں فضا میں بلند ہوتی ہیں۔ مجھے تعجب انگیز خوشی ہوئی کہ پچاس سالہ یہود و عرب کے خونیں نزاعات کے باوجود آج بھی یہاں یہ مواقع موجود ہیں کہ مسلمان لاؤڈ اسپیکر پر پانچوں وقت اذان بلند کریں اور مسجدوں میں جمع ہو کر باقاعدہ نماز ادا کریں۔

فلسطین تین بڑے مذہب کا مقدس مقام سمجھا جاتا ہے۔ یہود کا اس لیے کہ ان کے خیال کے مطابق وہ براہ راست خدا کی طرف سے انھیں دیا گیا ہے۔ وہ ان کے لیے ارض موعود ہے (Promised Land) جس کا فیصلہ براہ راست خدا کی طرف سے کیا گیا۔ عیسائیوں کا اس لیے کہ حضرت مسیح یہاں پیدا ہوئے اور اسی سرزمین میں انھوں نے اپنے مشن کی تکمیل کی۔ مسلمانوں کا اس لیے کہ پیغمبر اسلامؐ معراج کے سفر میں یہاں آئے اور ہجرت کے بعد ایک سال سے زیادہ مدت تک بیت المقدس کو اپنی عبادت کا قبلہ بنایا۔

فلسطین کا اہم ترین شہر یروشلم ہے۔ اسی کے علاقہ میں تینوں مذاہب کے مقدس مقامات واقع ہیں۔ اس کی تاریخ ۱۴ ویں صدی قبل مسیح تک جاتی ہے جب کہ اس علاقہ پر مصریوں کی حکومت تھی۔ اس کے بعد بار بار اس علاقہ کی حکومت بدلتی رہی۔ اس زمانہ کی تقریباً تمام قومیں ایک کے بعد ایک اس پر حکومت کرتی رہیں یہاں تک کہ ایک ہزار قبل مسیح میں حضرت داؤد علیہ السلام کی حکومت فلسطین و شام کے علاقہ میں قائم ہوئی۔ جو مزید اضافہ کے ساتھ ان کے صاحب زادہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ تک جاری رہی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یروشلم کی توسیع کی اور قدیم یہودی عبادت خانہ (ہیکل) تعمیر کیا۔ جس کا اب صرف ایک حصہ دیوار گریہ (مغربی دیوار) کی صورت میں موجود ہے۔ حضرت سلیمان کے بعد مختلف حکمراں یروشلم کو اور معبد کو تباہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سلیمانی ہیکل ایک کھنڈر کی صورت میں باقی رہ گیا۔

۶۳۸ میں جب کہ اس علاقہ میں رومیوں کی حکومت تھی، عربوں نے رومیوں کو شکست

دے کر فلسطین پر اپنا قبضہ قائم کیا۔ خلیفہ دوم عمر فاروق فاتحانہ طور پر مدینہ سے یروشلم پہنچے۔ ان کے اس سفر کی یادگار مسجد عمر کی شکل میں آج بھی یروشلم میں کنیسۂ قیامہ کے پاس موجود ہے۔ بنوامیہ کی سلطنت کے زمانہ میں خلیفہ عبدالملک بن مروان نے مقدس صخرہ کے اوپر ایک گنبد تعمیر کیا جو بیت المقدس (قبۃ الصخرۃ) کے نام سے مشہور ہے۔

خلیفہ عمر فاروق رضؓ نے اہل فلسطین کے ساتھ نہایت رواداری کا معاملہ فرمایا۔ بحیثیت فاتح وہاں انھوں نے جو تقریر کی تھی اس میں یہ اعلان کیا کہ اے اہل فلسطین تم کو بھی وہی تمام حقوق حاصل ہوں گے جو اسلامی قانون کے تحت مسلمانوں کو حاصل ہیں (یا اهل ایلیاء لکم مالنا وعلیکم ما علینا)

مسلم سلطنتوں کے زمانہ میں خلافت راشدہ کے بعد بھی رواداری کی یہی پالیسی جاری رہی۔ مورخین یہ اعتراف کرتے ہیں کہ بنوامیہ اور بنوعباس دونوں نے یہودی اور عیسائی باشندوں کے حق میں فراخدلی کی پالیسی اختیار کی :

Both the Umayyads and their successors, the Abbasids, pursued a liberal policy towards Christians and Jews. (10:140)

عباسی سلطنت کے بعد یہ پالیسی پوری طرح باقی نہ رہ سکی۔ کہا جاتا ہے کہ مصر کے فاطمی خلیفہ نے ۱۰۱۵ میں عیسائیوں کے مقدس مقامات کو توڑنے کی دھمکی دی۔

عیسائی اپنی سابق روایت کے مطابق مختلف مقامات سے جوق در جوق اپنے مقدس مقامات کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ اس سلسلہ میں مقامی طور پر غالباً کچھ ناخوشگوار واقعات ہوئے۔ سلجوقی سلطنت کے زمانہ میں ۱۰۷۱ میں عیسائی زائرین کے راستے بند کر دیے گئے۔ اس سے عیسائیوں کا مذہبی طبقہ بہت زیادہ برانگیختہ ہو گیا۔ اس نے یورپ کے مسیحی حکمرانوں کو غیرت دلائی۔ اس کے نتیجہ میں قدس پر مسیحی قبضہ بحال کرنے کے لیے وہ طویل جنگ شروع ہوئی جو کروسیڈس کے نام سے مشہور ہے۔

ان صلیبی جنگوں کے نتیجہ میں مسیحی حکمراں عارضی طور پر یروشلم پر قابض ہو گئے۔ ان کا یہ قبضہ ۱۰۹۹ سے ۱۱۸۷ تک باقی رہا۔ اس کے بعد صلاح الدین ایوبی نے ایک فیصلہ کن جنگ

میں مسیحی قبضہ کو ختم کر کے دوبارہ قدس پر مسلم سلطنت قائم کی۔

اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفہ کے لیے چند انقلابات پیش آئے اور آخر میں ۱۵۱۷ میں عثمانی سلطان سلیم اول نے یہاں ترک حکومت قائم کی جو مسلسل چار سو سال تک باقی رہی۔ ۱۹۱۷ میں برطانیہ نے لیگ مینڈیٹ کے تحت یروشلم پر سیاسی بالادستی حاصل کرلی۔ ۱۹۴۸ سے فلسطین کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد یروشلم کا نیا دور آیا تو ابتدا میں شہر ۱۹۴۸ سے ۱۹۶۷ تک دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک کو اردنی سیکٹر اور دوسرے کو اسرائیلی سیکٹر کہا جاتا تھا۔ جون ۱۹۶۷ کی چھ روزہ جنگ میں اسرائیل نے بقیہ نصف پر قبضہ کر کے پورے یروشلم پر اپنا کنٹرول قائم کر لیا۔ مصر کے سابق حکمراں جمال عبدالناصر، جو الاخوان المسلمون کی مکمل تائید سے حکومت میں آئے تھے، انھوں نے احمقانہ جوش کے تحت جولائی ۱۹۵۶ میں نہر سوئز کے پٹہ کو قبل از وقت منسوخ کر دیا اور اس کو سرکاری قبضہ میں لینے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد حالات میں جو زبردست تبدیلی ہوئی اسی کا نتیجہ تھا کہ یروشلم پورا کا پورا اسرائیلی قبضہ میں چلا گیا۔ بیشتر انسانی تباہیاں ہمیشہ نادانی کے اقدام کے نتیجہ میں پیش آتی ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، الرسالہ نومبر ۱۹۹۲، صفحہ ۲۸)

یروشلم میں پہلی عبادت گاہ (ہیکل) حضرت سلیمان ؑ نے اپنی بادشاہت کے زمانہ میں بنائی۔ یہ ہیکل ۹۵۷ ق م میں بن کر تیار ہوا۔ اس عبادت گاہ کو بابل (عراق) کے حکمراں بنوخذنصر (Nebuchadrezzar II) نے لوٹا اور ۵۸۶ ق م میں اس کو مکمل طور پر ڈھا دیا۔ ایک عرصہ کے بعد یہودیوں نے یہ عبادت گاہ دوبارہ بنائی۔ اس دوسری عبادت گاہ (ہیکل) کو بھی رومیوں نے ۷۰ء میں ڈھا کر کھنڈر کر دیا۔ اس عمارت کی صرف ایک دیوار باقی رہ گئی ہے جس کو دیوار گریہ (Wailing Wall) یا مغربی دیوار کہا جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یروشلم کی وہ کون سی "مسجد اقصیٰ" تھی جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسراء اور معراج کے وقت ۶۲۲ء میں تمام انبیاء کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔ تاریخی شہادت کے مطابق، اس وقت وہاں صرف کھنڈر تھا، اس وقت وہاں کوئی "مسجد" موجود نہ تھی۔ مگر صحیح بخاری کی روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں جب اپنے اس واقعہ کا اعلان فرمایا

توقریش نے اس پر یقین نہیں کیا۔ اس وقت مکہ میں کچھ ایسے افراد تھے جنھوں نے یروشلم کا سفر کیا تھا اور مسجد کو دیکھا تھا۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپؐ مسجد کا نقشہ بتا سکتے ہیں۔ رسول اللہؐ نے نقشہ بتانا شروع کیا تو اس کی بعض چیزوں کے بارے میں آپؐ مشتبہ ہو گئے۔ اسی وقت مسجد لاکر آپ کے سامنے رکھ دی گئی۔ اور آپ نے دیکھ کر اس کا پورا نقشہ بیان کر دیا۔ قریش نے کہا کہ جہاں تک بیان کرنے کا تعلق ہے انھوں نے ٹھیک بیان کیا (اما النعت فقد اصاب) فتح الباری ۸/۲۴۴

بخاری کی روایت کے مطابق ، ۶۲۲ء میں وہاں باقاعدہ "مسجد" کی عمارت ہونا چاہیے۔ مگر موجودہ تاریخی شہادتوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہ مسئلہ اس قابل ہے کہ از سرِ نو اس کی تحقیق کی جائے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اہل کتاب کی روایت کے مطابق ، حضرت یعقوب علیہ السلام جن کو یہودی اسرائیل کہتے ہیں ، انھوں نے مسجد اقصیٰ کی بنا ڈالی ، یہ فلسطین (ایلیا) کی مسجد ہے جس کو بیت المقدس کہا جاتا ہے (البدایہ والنہایہ ۱/۱۶۲)

اصل یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے جس مقام پر یہودی معبد کی بنیاد رکھی تھی ، اسی مقام پر بعد کو ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی گئی۔ اس ہیکل کو ایک سے زیادہ بار تباہ کر دیا گیا۔ معراج کے وقت یہاں زیادہ تر کھنڈر رہا تھا۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے لکھا ہے کہ قرآن میں (المسجد الاقصیٰ) سے مراد جگہ ہے نہ کہ کوئی عمارت :

(Masjid) properly denotes the site, not the building of a mosque. (3/2)

مسجد اقصیٰ بظاہر ہیکل سلیمانی کے کھنڈر پر بنائی گئی۔ اور بیت المقدس کی تعمیر صخرہ (چٹان) کے اوپر ہوئی۔ یہاں دیکھ کر معلوم ہوا کہ مسجد اقصیٰ ایک بہت بڑے ہال کی مانند ہے اور وہ پورے معنوں میں ایک مسجد ہے۔ مگر بیت المقدس معروف معنوں میں کوئی مسجد نہیں ہے۔ اس کی تعمیر مقبرہ جیسی ہے۔ جس طرح ہمارے یہاں قبر کے اوپر گنبد بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح صخرہ کے اوپر گنبد بنایا گیا ہے۔ اس کے اندر باجماعت نماز نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے یہاں کسی موقع پر نماز ہوتی ہے تو قبہ کے باہر میدان میں صفیں قائم کی جاتی ہیں۔

صخرہ کے متعلق یہود کی روایت ہے کہ یہاں ان کے ستر نبی قتل کیے گئے ان میں حضرت یحییٰ بن زکریا

بھی تھے۔ یہود کا عقیدہ ہے کہ حضرت ابراھیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی بھی اسی صخرہ پر کی تھی۔ ان کے نزدیک یہ حضرت اسحاق تھے۔ کیوں کہ وہ لوگ حضرت اسحاق علیہ السلام ہی کو ذبیح مانتے ہیں (البدایہ والنھایہ ۵۵/۲)

کویت کے میگزین المجتمع (یکم اگست ۱۹۹۵) میں سعودیہ کے سعود محمد الزعبی نے لکھا تھا کہ ۸۰ فیصد مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ قبۃ الصخرۃ ہی المسجد الاقصیٰ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اصل تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ غالباً ۹۹ فی صد لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اور یہ غلط فہمی بہت پہلے سے چلی آرہی ہے۔

ابن ہشام نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے جایا گیا اور وہ بیت المقدس ہے (ثم اُسریٰ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی وھو بیت المقدس) سیرۃ ابن ہشام ۲/۲

ابن کثیر نے اپنی تفسیر قرآن میں لکھا ہے کہ: الی المسجد الاقصی وھو بیت المقدس (تفسیر ابن کثیر ۲/۳) یہی بات قرطبی نے بھی لکھی ہے کہ: اُسری بہ من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی وھو بیت المقدس (۲۱۰/۱۰)

اسی طرح مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنی تفسیر قرآن میں لکھا ہے کہ ——— یعنی جس ملک میں مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) واقع ہے۔ (صفحہ ۳۶۵) مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے: مسجد حرام یعنی بیت اللہ سے مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس تک (تفہیم القرآن ۵۸۸/۲)

مسجد اقصیٰ کا مسئلہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے نزدیک ان کا سب سے زیادہ بڑا مسئلہ ہے اس کے بارے میں ساری دنیا کے مسلم پریس میں مسلسل مضامین اور رپورٹوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ کی اصل نوعیت کے بارے میں لوگوں کی معلومات بے حد کم ہیں۔ ہر ایک بس جذباتی انداز کی تحریریں شائع کر رہا ہے۔ مثلاً مسجد اقصی کی بازیابی پر ایک مضمون چھپے گا اور اس کے ساتھ جو تصویر شامل کی جائے گی وہ بیت المقدس کی ہوگی۔ حالاں کہ دونوں واضح طور پر دو الگ الگ عمارتیں ہیں اور دونوں کی نوعیت ایک دوسرے سے بالکل الگ ہے۔ مثلاً بمبئی کے ایک ماہنامہ میں اس مسئلہ پر ایک نہایت جذباتی

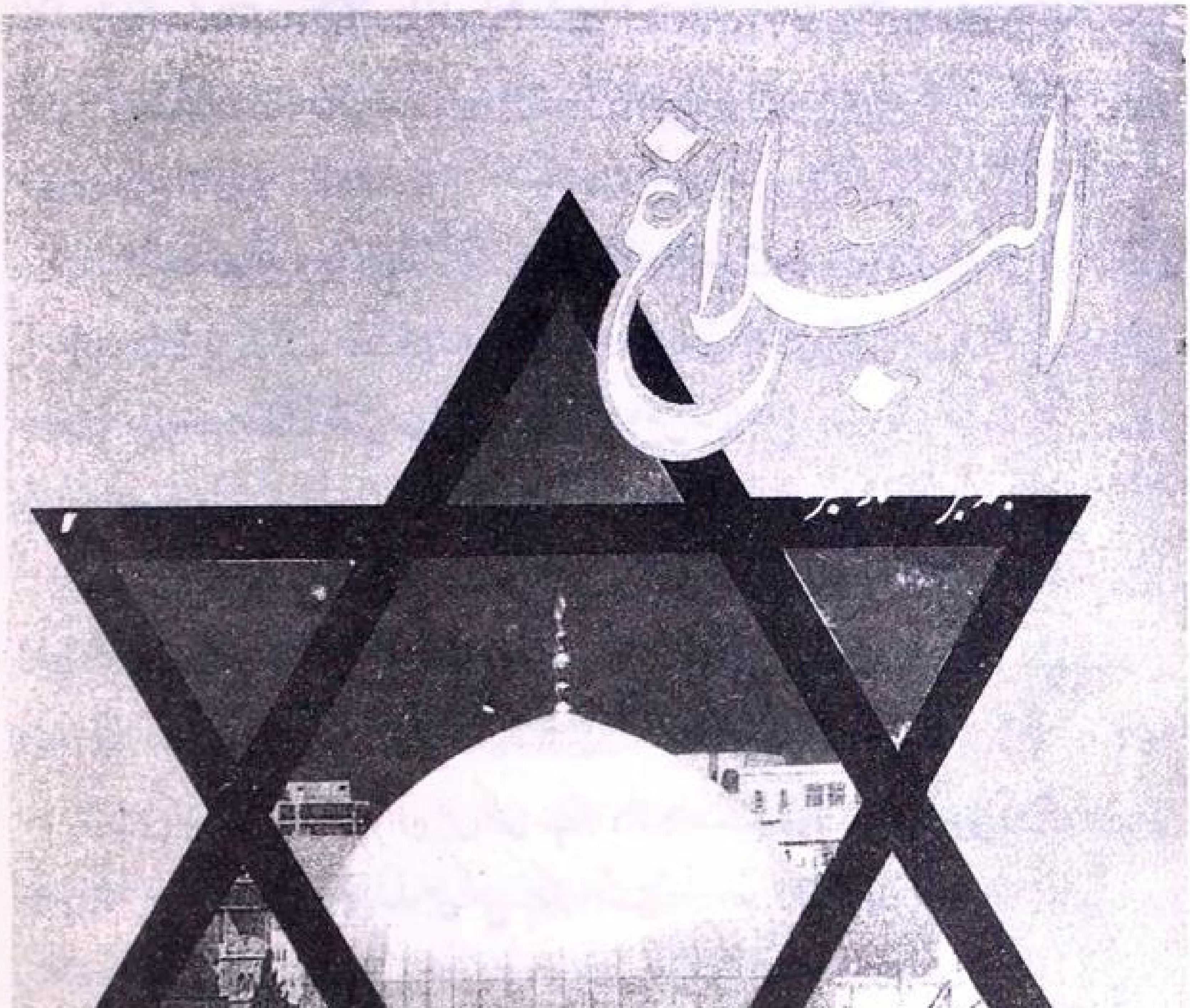
البلاغ
December'1995
Rs. 10.

تحریر شائع ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ مسجد اقصیٰ کی تصویر ہے اور اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے: "مسجد اقصیٰ کو یہودی تولیت سے آزاد کراؤ"۔ (تصویر اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اصل مضمون جو نہایت جذباتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کے چند جملے یہ ہیں:

جہاں تک مسجد اقصیٰ کا تعلق ہے اس پر پورے عالم اسلام کا حق ہے اور اس پر یہودیوں کے غاصبانہ تسلط کو عالم اسلام کبھی برداشت نہیں کر سکتا اور جب تک یہودی اس پر قابض ہیں دنیا کا ایک ایک مسلمان اس کی آزادی کے لیے جہاد کرتا رہے گا اور عالم اسلام میں اس وقت تک امن و چین کا ماحول پیدا نہیں ہوگا جب تک مسلمانوں کا پہلا قبلہ اور پیغمبر اسلامؐ کے معراج کی پہلی منزل یہودیوں سے آزاد نہیں ہو جاتی۔ اس لیے مسجد اقصیٰ اور عالم اسلام کے دوسرے مقامات مقدس کی بابت یہودیوں سے سازباز اور ان سے سیاسی سودے بازی کو مسلمان کبھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ اور اس سلسلہ میں مصری علماء اور شیخ الازہر کے کسی فتوے کو دنیا کے مسلمان تسلیم نہیں کر سکتے۔ مسجد اقصیٰ مسلمانوں کی امانت ہے اس پر تولیت کا حق صرف مسلمانوں کا ہے (ماہنامہ البلاغ، دسمبر ۱۹۹۵)

اس طرح کے مضامین پڑھ کر اکثر میری زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں —— اس سے زیادہ عجیب بات شاید اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ مسجد اقصیٰ کو جانتے بھی نہیں اور اس کے حقوق کے محافظ بنے ہوئے ہیں۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعد کے دور میں مسلمانوں نے "قبلہ اول" کے لفظ کو جذباتی طور پر تو بہت استعمال کیا مگر مسجد اقصیٰ کی زیارت کا رواج ان کے درمیان نہیں پڑا۔ آمد و رفت کی اس کمی کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگوں کے ذہن میں واضح تصویر نہیں بنی کہ بیت المقدس کیا ہے اور مسجد اقصیٰ کیا ہے۔

یہاں قریب سے دیکھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس کا ایک سبب غالباً دونوں کا جغرافی فرق بھی ہے۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ بیت المقدس (قبة الصخرة) ایک اونچی چٹان پر ہے۔ اس کے مقابلہ میں مسجد اقصیٰ اس سے الگ نسبتاً نشیبی زمین پر ہے۔ اِس بنا پر جب کوئی فوٹو لینے والا فوٹو لیتا ہے تو دونوں عمارتیں بیک وقت فوکس میں نہیں آتیں۔ اِلّا یہ کہ کسی بڑے کیمرے

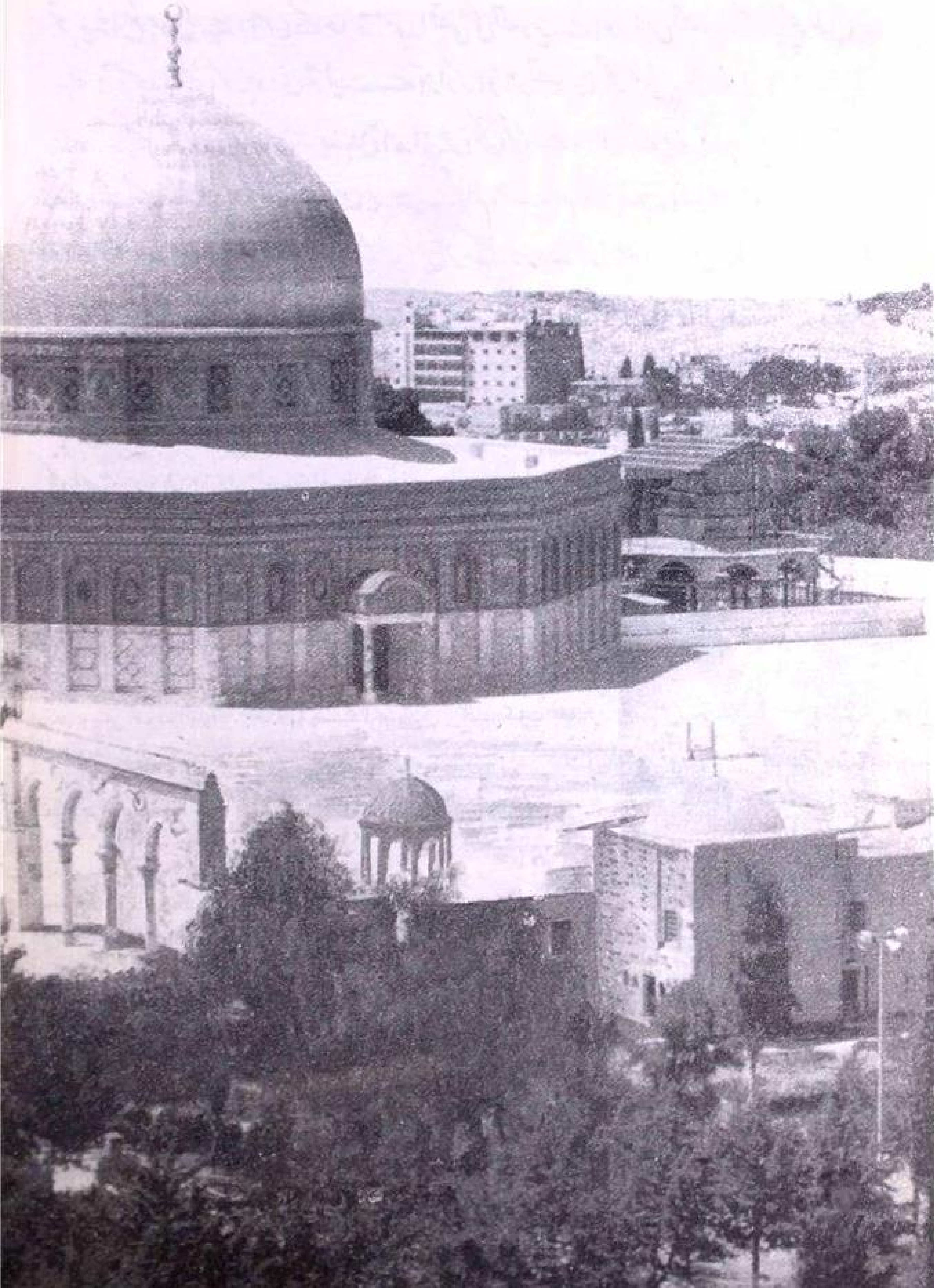

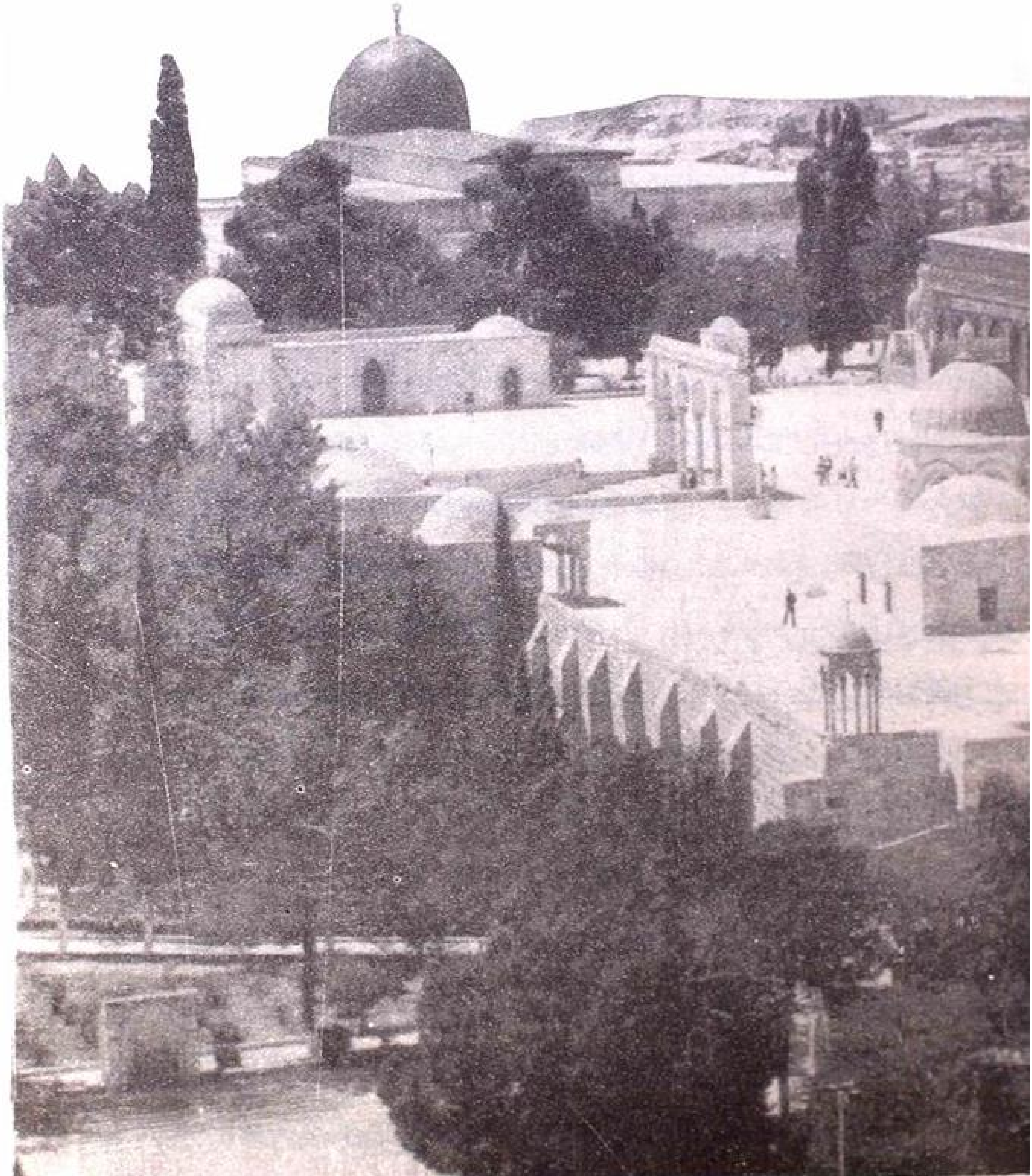

کے ذریعہ کافی دور سے اس کا فوکس لیا جائے۔ تاہم دور سے فوکس لینے کی شکل میں بھی یہ صورت بدستور قائم رہتی ہے کہ اسی جغرافی فرق کی بنا پر تصویر میں بیت المقدس (قبۃ الصخرۃ) نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے اور مسجد اقصیٰ اس کے پیچھے صرف غیر نمایاں انداز میں نظر آتی ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہجرت کے بعد جس زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنایا، اس وقت وہاں موجودہ گنبد نہ تھا، اس وقت صرف سنگ خارا کی ایک چوکور چٹان تھی۔ یہی چٹان یہودیوں کا قبلہ بھی تھا اور عارضی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بھی۔ گویا قبلۂ یہود یا قبلۂ اول دونوں ہی "صخرہ" ہیں نہ کہ وہ "سنہرا گنبد" جس کو بیت المقدس کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ گنبد اس وقت سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (م ۳۱۰ھ) نے اپنی تفسیر قرآن میں قبلۂ اول کے مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ خلاصہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے مسلمان (انصار) بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۲۲ء میں مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو آپ نے بھی اسی کے مطابق عمل فرمایا۔ اس کی وجہ اہل کتاب کی تالیف قلب تھی (فاختار بیت المقدس لکی یتألف اهل الکتاب)

بیت المقدس کتنے عرصہ تک قبلہ رہا، اس میں اختلاف ہے۔ بعض روایتوں کے مطابق، سولہ ماہ، بعض کے مطابق سترہ ماہ اور بعض کے مطابق انیس ماہ۔ غالباً اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ جن راویوں نے انصار کے زمانہ کو شامل کر کے بتایا انھوں نے زیادہ مدت بتائی، اور جنھوں نے صرف رسول اللہ ؐ کی مدت کو بتانا چاہا انھوں نے کم مدت بیان کی۔

اس وقت بیت المقدس کی موجودہ عمارت (قبہ) موجود نہ تھی۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دراصل صخرہ (چٹان) کو قبلہ بنایا تھا جس کو یہود مقدس سمجھتے تھے اور وہی یہود کا قبلہ تھا (کان یستقبل صخرۃ بیت المقدس وهی قبلۃ الیهود) تفسیر طبری ۲/۲-۵

ابن کثیر نے حضرت عمر کے سفر کے بارے میں ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ مدینہ سے گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہوئے تاکہ سفر تیزی سے طے ہو سکے۔ اور مدینہ میں حضرت علیؓ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ اس طرح چلتے ہوئے وہ جابیہ (سرحد فلسطین) پر پہنچے (البدایہ والنهایہ ۷/۵۶)

دوسری روایت کے مطابق، آپ کا سفر اونٹ کے ذریعہ طے ہوا۔ اسی طرح اس میں بھی اختلاف ہے کہ سفر کس طرح طے ہوا۔ ایک روایت کے مطابق، آپ اور آپ کا غلام دونوں اونٹ پر باری باری بیٹھتے تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق، تین باری تھی۔ ایک بار آپ اور ایک بار غلام سوار ہوتا تھا اور تیسری بار اونٹ کو خالی رکھا جاتا تھا تاکہ وہ آرام کرلے۔

خلیفہ ثانی عمر فاروق ۶۳۸ء میں فاتحانہ طور پر یروشلم میں داخل ہوئے تھے۔ اس کے بعد سے فلسطین مسلسل مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔ بارھویں صدی عیسوی میں مسیحیوں نے یروشلم پر قبضہ کرلیا جو ۸۸ سال تک جاری رہا۔ اس قبضہ کو صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۷ء میں ختم کیا۔ ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ بظاہر صلاح الدین ایوبی نے یہ کامیابی صرف ایک دن (۴ جولائی ۱۱۸۷) کی جنگ حطین میں حاصل کی تھی۔ مگر یہ کامیابی جوش کا نہیں بلکہ تیاری کا نتیجہ تھی۔ اس ایک دن کی فتح کے لیے صلاح الدین نے کئی سال تک غیر معمولی تیاریاں کی تھیں، یہاں تک کہ اس کی فوجی طاقت لاطینی صلیبیوں کے برابر ہوگئی۔

مورخین نے اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں نے جب یروشلم کو فرینک (Franks) کے قبضہ سے واپس لیا تو انھوں نے وہاں کے باشندوں سے انتہائی شرافت کا معاملہ کیا۔ مسیحیوں نے جب یروشلم پر قبضہ کیا تو انھوں نے وحشیانہ طور پر وہاں کے باشندوں کو قتل کیا تھا اور آزادانہ طور پر لوگوں کا خون بہایا تھا۔ اس کے بالکل برعکس مسلمانوں کی دوبارہ فتح ممتاز طور پر شائستگی کا انداز لیے ہوئے تھی۔ صلاح الدین اور اس کے فوجیوں نے لوگوں سے نہایت فیاضانہ سلوک کیا :

In stark contrast to the city's conquest by the Christians, when blood flowed freely during the barbaric slaughter of its inhabitants, the Muslim reconquest was marked by the civilized good faith and courteous behaviour of Saladin and his troops. (16/177)

صلاح الدین ایوبی نے ۵۸۳ھ میں یروشلم (قدس) کو فتح کیا تھا۔ اس وقت یہ ایک حصار بند شہر تھا اور نہایت مشکل کے ساتھ اس کی فتح ممکن ہوسکی۔ فتح کے بعد جب مسلمان اندر داخل ہوئے تو مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ میں کثرت سے صلیب اور تماثیل وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ حتی کہ کہا جاتا ہے کہ وہاں خنزیر بھی موجود تھے۔ مسلمانوں نے ان مقدس مقامات کی پوری صفائی کی اور اس کو پھر

سے پاک کر کے اس کو عبادت کے قابل بنایا (البدایہ والنہایہ ۱۲/۳۲۴)

جاک بیرک ایک فرانسیسی تھا۔ وہ ۱۹۱۰ میں الجزائر میں پیدا ہوا۔ اس وقت الجزائر پر فرانس کا قبضہ تھا۔ جاک بیرک کے فرانسیسی والدین ایک استعماری ادارہ میں کام کرنے کے لیے الجزائر آئے تھے، جولائی ۱۹۹۵ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

جاک بیرک نے الجزائر میں عربی زبان سیکھی اور اس میں کمال حاصل کر لیا۔ وہ اسلامی موضوعات پر ایک عالم کی طرح کلام کرتا تھا۔ اسلامی لٹریچر کے مطالعہ سے وہ اسلام سے غیر معمولی طور پر متاثر ہو گیا۔ حتی کہ وہ اسلام کی حمایت و مدافعت کرنے لگا۔ اس کی کئی کتابیں اس موضوع پر ہیں۔ مثلاً (العرب امس والیوم ۱۹۶۰)۔ اس نے قرآن کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ بھی کیا جو ایک عمدہ ترجمہ شمار کیا جاتا ہے۔ وغیرہ۔

ایک عرب نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا: احب جان بیرك العربیة والاسلام حتی لتحسبه عربیا مسلما۔ وقد خسر العلم بموته خسارة یصعب ان تعوض۔ وخسر العرب والمسلمون صدیقا من طراز نادر۔

میں نے کہا کہ استعماری دور میں اس طرح کے بہت سے یورپی پیدا ہوئے جو یا تو اسلام دوست بن گئے یا انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس میں ہمارے لیے ایک بہت بڑا سبق چھپا ہوا ہے۔ وہ یہ کہ جب "استعمار" جیسا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ کوئی غیر قوم آپ کے اوپر سیاسی غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ مگر اس کا دوسرا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس عمل کے دوران اہل اسلام اور غیر اہل اسلام کے درمیان اختلاط پیش آتا ہے۔ بالفاظ دیگر مدعو خود چل کر داعی کے پاس آجاتا ہے۔ لوگ عام طور پر پہلے رخ کو دیکھتے ہیں، وہ اس واقعہ کا دوسرا پہلو نہیں دیکھتے، اس لیے وہ اس کو استعمال بھی نہیں کر پاتے۔ اگر اس دوسرے پہلو کو منظم طور پر استعمال کیا جائے تو جاک بیرک جیسے ہزاروں لوگ پیدا ہو جائیں۔ حتی کہ خود اسرائیلیوں میں بھی، جن کو اب تک آپ صرف دشمن اور مخالف اسلام کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

یروشلم میں میں نے مختلف لوگوں سے پوچھا کہ کہا جاتا ہے کہ یہودی موجودہ مسجد اقصیٰ کو ڈھا کر وہاں دوبارہ ہیکل سلیمانی بنانا چاہتے ہیں۔ مگر لوگوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ یہ ایک بے وقوفی کی بات ہوگی کہ ہزار سال کی تاریخ کو رد کرکے نئی تاریخ لکھنے کی کوشش کی جائے۔

ایک عیسائی انجینیر جو روم میں رہتے ہیں اور بار بار یروشلم آتے رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے کبھی نہیں سنا کہ یہودیوں میں کوئی سنجیدہ خواہش اس بات کی ہے کہ ہیکل سلیمانی کو دوبارہ اسی جگہ بنایا جائے۔ بعض انتہا پسند افراد ایسا کہتے ہوں گے مگر نہ وہ یہودی قوم کی بات ہے اور نہ حکومت اسرائیل کی بات:

I have never heard that there is a serious intention to rebuild the temple of Israel on the same area where it was before its last destruction. (Antonello Paba)

مجھے جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا اس کا انگریزی نام (Hotel 7-arches) ہے، اور اس کا عربی نام فندق الاقواس ہے۔ جائے وقوع کے اعتبار سے یہ یروشلم کا نمبر ایک ہوٹل ہے۔ اس کے چاروں طرف قدرتی مناظر اور تاریخی نشانیوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔

ہوٹل میں یہودی اور مسلمان بالکل معتدل فضا میں ملتے ہوئے نظر آئے۔ اکثر صباح الخیر، السلام علیکم، حیاک اللہ جیسے عربی الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ ہوٹل کی دیواروں پر شیشہ کے فریم میں جو خوب صورت تصویریں لگی ہوئی ہیں، ان میں متعدد خالص عربوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً ایک بڑے فریم میں بہت سی رنگین تصویریں ہیں۔ اس کے اوپر عربی میں لکھا ہوا ہے: لمحة عن الحياة البدوية۔ اس میں تصویروں کے ذریعہ بدوی علاقہ کے فلسطینیوں کی زندگی کے مختلف مناظر دکھائے گئے ہیں۔ اس طرح ایک اور فریم دیوار پر نظر سے گزرا۔ اس کے اوپر لکھا ہوا تھا: التراث الفلسطيني۔ اس میں فلسطینیوں کی بعض تاریخی چیزیں خوب صورت تصویروں کے ذریعہ دکھائی گئی تھیں۔

۲۷ اگست کو دوپہر بعد میں اپنے ساتھی کے ہمراہ نکلا۔ گاڑی ہم نے ایک جگہ پارک کر دی اور عرب سیکٹر کے بہت بڑے علاقہ میں پیدل گھومتے رہے۔ گھنٹوں اِدھر سے اُدھر گئے۔ فلسطینی بچے، نوجوان اور بڑی عمر کے لوگ بالکل معتدل انداز میں اپنا کام کرتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے چہروں پر غم یا خوف وہراس نظر نہیں آیا۔ پورے علاقہ میں صرف ایک جگہ تین اسرائیلی فوجی

گن لیے ہوئے بیٹھے تھے۔ وہ آپس میں غالباً عبرانی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔

۲۷ اگست کی صبح کو میں نیچے اترا تو ریسپشن ڈسک کے پیچھے کھڑے ہوئے خوش پوش نوجوان نے کہا کہ آج آپ کیسے ہیں (How are you today) میں نے کہا کہ فائن۔ اس نے دوبارہ کہا: الحمدللہ۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ یہ ہوٹل فلسطینی عربوں کا ہے۔ چنانچہ ہوٹل کا عملہ بیشتر عرب افراد پر مشتمل ہے۔ ایک نئی بات یہ نظر آئی کہ یہاں ہوٹل کی خدمات میں عام قاعدہ کے مطابق، لڑکیاں نہیں ہیں بلکہ سارا کام مرد کرتے ہیں۔ کسی بھی شعبہ میں مجھے کوئی خاتون نظر نہیں آئی۔

۲۷ اگست کی شام کو چار بجے مسٹر اینٹی نیو (Mr. Antonello Paba) کے ساتھ مقاماتِ مقدسہ دیکھنے کے لیے نکلا۔ کئی کیلو میٹر کے دائرہ میں پھیلا ہوا ایک وسیع احاطہ ہے جس کے اندر یہودیوں اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے مقدس مقامات واقع ہیں۔ راستہ میں ہر جگہ سیاح مردوں اور عورتوں کی بھیڑ نظر آئی۔

طویل راستہ طے کرنے کے بعد ہم لوگ مسجد اقصیٰ پہنچے۔ یہ ایک ہی بڑا احاطہ ہے جس کے اندر ایک طرف مسجد اقصیٰ ہے اور دوسری طرف سَو قدم کی دوری پر بیت المقدس (قبۃ الصخرہ) واقع ہے۔ سب سے پہلے میں مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا۔ یہ بہت بڑی اور بلند و بالا مسجد ہے۔ اس کا اندرونی حصہ ایک طرف سے ۱۱۰ قدم اور دوسری طرف ۸۵ قدم ہے۔ یہاں میں نے دو رکعت نماز پڑھی اور دعائیں کیں، کئی آدمی بلند آواز سے قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے نظر آئے۔

اس کے بعد بیت المقدس میں گیا۔ اس کو قبۃ الصخرہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے نیچے درمیان میں پتھر کی ایک چٹان ہے۔ یہ چٹان تقریباً کمر تک اونچی ہے۔ چٹان کے چاروں طرف لکڑی کا کٹہرا بنا دیا گیا ہے۔ کٹہرا اور گنبد کی دیوار کے درمیاں گول دائرہ میں ایک گیلری ہے۔ میں نے اس گیلری میں چل کر دیکھا تو وہ دو سَو قدم تھی۔ اس گیلری میں میں نے دو رکعت نماز ادا کی اور دعائیں مانگیں۔ قبۃ الصخرہ مسجد نہیں ہے بلکہ چٹان کے اوپر قبہ ہے، اور اس کے باہر کشادہ صحن۔

اس کے بعد میں مسجد عمر بن الخطاب گیا۔ یہ مسجد چھوٹی ہے۔ ۲۵ قدم چوڑی اور ۲۵ قدم لمبی۔ اس کی چھت بھی زیادہ اونچی نہیں۔ یہاں بھی میں نے دو رکعت نماز ادا کی۔ مسجد کے بیرونی حصہ میں جدید طرز کے وضو خانے اور غسل خانے بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کے پاس ہی

کنیسۃ القیامہ (Church of Resurrection) ہے جو کافی بڑا ہے۔

اس وقت مجھ پر ایک تحیر کی کیفیت طاری تھی۔ ان مقدس مقامات کی زیارت اور ان میں نماز ادا کرنا مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ کیوں کہ زندگی میں کبھی میں یہ سوچ بھی نہیں سکا تھا کہ میں قدس جاؤں گا اور وہاں ایسی جگہ سجدہ کروں گا جہاں پیغمبروں نے اور اصحاب پیغمبر نے سجدے کیے ہیں۔

۲۸ اگست کو صبح کا وقت ہے۔ سورج کی چمک دار روشنی باہر کے پورے ماحول کو منور کیے ہوئے ہے۔ میرے کمرہ کے "قد دیوار" شیشوں کے باہر بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی عمارتیں دکھائی دے رہی ہیں۔

مسجد اقصیٰ کے اندر آپ داخل ہوں تو وہ نہایت عظیم اور پرہیبت دکھائی دیتی ہے۔ میں نے اتنی پرہیبت مسجد کوئی اور نہیں دیکھی۔ بیت المقدس کا نقشہ دوسرا ہے۔ اس کا طرز مقبرہ جیسا ہے۔ یعنی درمیان میں بڑا سا پتھر، اس کے اوپر اونچا گنبد، اور پتھر کے گرد گول دائرہ میں ایک گیلری۔

کمرہ سے ان تاریخی مناظر کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں قرآن کی یہ آیت آئی: سُبحانَ الَّذی اَسْریٰ بِعَبْدِہٖ لیلاً مِنَ المَسْجِدِ الحَرامِ اِلَی المَسْجِدِ الاَقْصَی الَّذِی بَارَکْنا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ آیاتِنا (الاسراء) ان قرآنی الفاظ پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ بارکنا حولہ سے مراد غالباً اس مقام کا یہ امتیازی پہلو ہے کہ یہاں کی سرزمین سے بہت سے جلیل القدر انبیاء کی تاریخ وابستہ ہے۔ گویا کہ یہ سرزمین نبوت ہے۔ اور لنریہ من آیاتنا سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو چشم زدن میں مکہ سے ۱۲۰۰ کیلومیٹر دور یروشلم میں لاکر اس نئے آنے والے دور کا تعارف کرایا جس کو دور مواصلات (age of communication) کہا جاتا ہے۔

اس غیر معمولی سفر کے ذریعہ اس بات کا ایک مظاہرہ کیا گیا کہ خدا کا دین اب قومی نبوت کے دور سے گزر کر بین اقوامی نبوت کے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ اب وہ مقامی پیغام رسانی کی محدودیت سے نکل کر عالمی پیغام رسانی کے وسیع تر دائرہ میں پہنچ گیا ہے۔

أسرى بعبده ليلا من المسجد الحرام الى المسجد الاقصىٰ ——— یہ فقرہ اپنے ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے ذات نبوت کے بارے میں ہے مگر اسی کے ساتھ اس کا ایک وسیع تر مفہوم بھی ہے جس کا تعلق پوری امتِ محمدیؐ سے ہے۔ پیغمبر اسلام کو ایک لمحے میں ۸۰۰ کیلومیٹر کا دوطرفہ سفر کرانا گویا کہ علامتی طور پر پوری امت کو یہ بتانا تھا کہ اس دین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تیز رفتار سفر کا دور شروع کر دیا ہے۔ پیغمبر اسلام کو عالمی پیغمبر بنانے کے ساتھ ہی یہ امکان بھی کھول دیا گیا ہے کہ آپ کے امتی بسہولت آپ کے دین کی عالمی پیغام رسانی کر سکیں۔

سفر اسراء میں اس بات کا اشارہ تھا کہ اس نئے دور کا سب سے اہم پہلو کمیونی کیشن ہوگا نہ کہ سیاسی اقتدار۔ مگر موجودہ زمانہ میں جب یہ دور اپنے عظیم امکانات کے ساتھ ظاہر ہوا تو تمام دنیا کے مسلمان سیاسی اقتدار کے مسئلہ میں الجھ گئے۔ وہ دین خداوندی کی دعوت کو عام کرنے کے لیے جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال نہ کر سکے۔

اس ناکامی کا اصل سبب حکمت نبوت سے محرومی ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے علماء اور دانشور، اس حکمت نبوی سے بالکل بے خبر ہیں جس کی ممتاز مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر اسراء میں پائی جاتی ہے۔ جس وقت آپؐ کا یہ سفر ہوا، اس وقت یروشلم پر ایک مشرک بادشاہ کی حکومت قائم تھی۔ اس کے باوجود آپ بجسدہ الشریف وہاں گئے اور تمام نبیوں کے ساتھ مسجد اقصیٰ میں ایک خدا کی عبادت کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی ایک سنت الفصل بین القضیتین ہے۔ یعنی سیاسی اشو کو الگ کر کے دینی مواقع کو استعمال کرنا۔ مگر اس حکمت سے بے خبر ہونے کی بنا پر ہمارے تمام رہنما سیاسی مسائل میں الجھ گئے اور نئے دینی امکانات کو استعمال کرنے میں ناکام رہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، الرسالہ نومبر ۱۹۹۵)

۲۸ اگست کا دن خالی تھا۔ اس لیے آج تفصیل کے ساتھ یروشلم کے مختلف حصوں کو دیکھا۔ مجھے خاص دل چسپی اس حصہ سے تھی جو عرب سکٹر کہا جاتا ہے اور جس میں تمام مقامات مقدسہ واقع ہیں۔ اس علاقہ میں کثرت سے تنگ گلیاں ہیں۔ اس لیے ہم نے گاڑی چھوڑ دی۔ تاکہ اس کے ہر حصہ میں داخل ہو کر اس کو دیکھا جا سکے۔ ایک چیز بڑی عجیب تھی کہ اس علاقہ کی دیواروں پر

کثرت سے عربی زبان میں نعرے لکھے ہوئے تھے۔ یہ تقریباً ویسا ہی منظر تھا جو پرانی دہلی کی دیواروں پر پوسٹر کی صورت میں نظر آتا ہے۔ یہ تمام کے تمام جنگ جویانہ نعرے تھے۔ مزید یہ کہ وہ ہاتھ سے بدخط انداز میں لکھے ہوئے تھے اور بمشکل پڑھے جاتے تھے۔ ان راستوں سے مسلسل مرد اور عورت گزر رہے تھے مگر میں نے اپنے سوا کسی کو بھی نہیں پایا جس کو ان نعروں سے کوئی دلچسپی ہو یا وہ ان کو پڑھنے کے لیے ایک لمحہ وہاں رکنا پسند کریں۔ چند نعرے یہ تھے :

قاتلو اعداء اللہ

الارض لنا والقدس لنا

التحیۃ کل التحیۃ لشھداء الخلیل

العیدُ لمن مات شھیداً

تحیۃ لکل قطرۃ دم سالت دفاعا

تحیۃ الی المتعلقین الابطال ـــ فتح

یہ پورا علاقہ تاریخی علاقہ ہے۔ یہاں قدم قدم پر عمارتوں کے اوپر ایسے بورڈ نظر آتے ہیں جو اس کی تاریخی حیثیت کی یاد دلاتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ایک عمارت کے گیٹ پر عربی میں لکھا ہوا نظر آیا : مکان مقدس، ھنا بدأ یسوع آلامہ۔ ایک پھاٹک پر عبرانی اور انگریزی میں لکھا ہوا تھا :

Tomb of the Prophets, Haggai and Maleachi

ایک جگہ لکھا ہوا تھا : Birthplace of Virgin Marry ایک جگہ لکھا ہوا تھا : ساحۃ النبی داؤد (En-Nabi Dawoud Squire) مسلم نوعیت کے بورڈ بھی جگہ جگہ دکھائی دیے۔ مثلاً ایک عمارت کے دروازہ پر لکھا ہوا تھا : ادارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ (مدیر اوقاف القدس) ایک جگہ لکھا ہوا تھا : جامع الزاویۃ النقشبندیۃ۔ اس علاقہ میں زیادہ تر دکانیں فلسطینیوں کی ہیں۔ ایک دکان کے آگے بنیان کے اوپر یہ الفاظ چھپے ہوئے تھے : بحبك یا فلسطین (اے فلسطین میں تجھ سے پیار کرتا ہوں)

۲۸ اگست کو دوبارہ میں اپنے ساتھی کے ہمراہ تاریخی مقامات دیکھنے کے لیے نکلا۔ ہم نے اپنی گاڑی چھوڑ دی تاکہ ہم گلیوں اور تنگ راستوں میں بھی جا سکیں اور زیادہ سے زیادہ مقامات

کو دیکھیں۔ ہم ایک ڈھلوان راستہ پر چل رہے تھے کہ سامنے سے ایک فلسطینی مسلمان آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا جس کی عمر غالباً دس سال ہوگی۔ بچہ اپنے ہاتھ میں زیتون کی شاخیں لیے ہوئے تھا۔ اس نے ایک شاخ مجھ کو اور ایک شاخ میرے ساتھی کو پیش کی۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ زیتون کی شاخ امن کی علامت ہے اور وہ اپنی امن پسندی کے اظہار کے لیے یہ شاخ ہمیں دے رہا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ وہ انسان کی نمائندگی کر رہا ہو اور پوری انسانیت کی طرف سے کہہ رہا ہو کہ ان بے فائدہ جھگڑوں کو بند کرو اور ہمیں امن کے ساتھ رہنے دو۔

۲۸ اگست کی دوپہر کو ایک اطالوی مسیحی کے ہمراہ کنیستہ القیامہ (Church of Resurrection) دیکھا۔ یہ بہت بڑا ہے اور مسجد عمر سے ملا ہوا ہے۔ اسی کے اندر وہ جگہ ہے جس کے متعلق عیسائی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہاں حضرت مسیح کو سولی دی گئی تھی۔ اس کو مقدس سپلکر (Holy Sepulchre) کہا جاتا ہے۔ یہاں عجیب و غریب منظر ہے۔ دیوار سے ملا ہوا حضرت مسیح کا قد آدم مجسمہ ہے۔ اس کے پیچھے صلیب کی لکڑی ہے۔ اس لکڑی کے ساتھ آپ کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں میں کیل ٹھونکی ہوئی ہے جس سے خون نکل رہا ہے۔ گردن میں پھانسی کی رسّی ہے۔ آپ کا جسم مردہ کی مانند لٹک رہا ہے۔

اسی کے ساتھ چرچ میں کئی اور مقدس مقامات ہیں۔ وہ مقام جہاں مسیحی عقیدہ کے مطابق، حضرت مسیح کے جسم کو صلیب سے اتار کر رکھا گیا تھا۔ یہاں ایک چبوترہ ہے جس کو عورتیں چومتی ہوئی نظر آئیں۔ ایک اور مقام ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تین دن کے بعد حضرت مسیح دوبارہ زندہ ہو کر یہاں نمودار ہو گئے۔ اور یہاں سے پھر آسمان میں چلے گئے۔

۲۸ اگست کی شام کو دیوار گریہ (Wailing wall) دیکھی۔ یہ مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کے احاطہ کی دیوار سے ملی ہوئی ہے۔ دیوار کے ساتھ ملا ہوا وسیع میدان ہے جس میں ایک رسّی تان کر عورت اور مرد کا علاقہ الگ کر دیا گیا ہے۔ بہت سے یہودی مرد اور عورت دیوار کے پاس کھڑے ہو کر پیشانی کے ساتھ دیوار سے چمٹے ہوئے تھے اور دعائیں مانگ رہے تھے۔

لاطینی زبان میں قبر کے لیے سپلکر (sepulchre) کا لفظ ہے۔ یروشلم میں مسیحی عقیدہ کے

مطابق، حضرت مسیح کی جو قبر ہے، اس کو مقدس مزار (Holy Sepulchre) کہا جاتا ہے۔ ایسٹر سے پہلے آنے والے جمعہ کو مسیحی حضرات گڈ فرائڈے کہتے ہیں اور اس کو حضرت مسیح کے مصلوب ہونے کی یادگار کے طور پر مناتے ہیں۔ ہر سال گڈ فرائڈے کو یروشلم کے "مقدس مزار" پر بڑی تعداد میں مسیحی لوگ جمع ہوتے ہیں۔ اس میں جو تقریبات کی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ صلیب کی صورت میں پھانسی کی لکڑی کھڑی کی جاتی ہے۔ اور ایک آدمی اس پر چڑھ کر ڈرامائی انداز میں اپنے آپ کو مصلوب کرتا ہے (ملاحظہ ہو، نیچے کی تصویر)

۲۸ اگست کو شام کا کھانا ہوٹل "امریکن کالونی" میں تھا۔ یہ ایک تاریخی ہوٹل ہے۔ اس کے بیشتر کارکن فلسطینی ہیں۔ اس میں ایک لمبی گیلری ہے جس میں فلسطین کی پچھلی تاریخ کو

Mexican Roman Catholic worshippers re-enacting Jesus Christ crucifixion during the annual Good Friday procession at the Holy sepulchre in Jerusalem on Friday.

تصویروں کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ ترکی عہد کی بہت سی تصویریں یہاں خوب صورت فریم میں لگی ہوئی ہیں۔ سب سے زیادہ نمایاں تصویر فلسطین کے ترک حاکم جمال پاشا کی تھی۔ وہ ایک شاندار گھوڑے پر بیٹھے ہیں۔ میں دیر تک اس کو دیکھتا رہا، گھوڑا اللہ تعالیٰ کی ایک عجیب نعمت ہے۔ جو شان گھوڑے کی سواری میں ہے وہ کسی بھی دوسری سواری میں نہیں۔

ہم لوگ کھانا کھا چکے تو شیشہ کے گلاس نما برتن میں آئس کریم لاکر سب کے سامنے رکھی گئی۔ میں چمچہ اٹھا کر کھانا چاہتا تھا کہ ہوٹل کا ایک نوجوان کارکن اچانک آیا، اس نے میری آئس کریم اور چمچہ تیزی سے اٹھالیا، اور پھر دوسری آئس کریم اور دوسرا چمچہ لاکر رکھ دیا۔ فوری طور پر میں اس کا راز سمجھ نہ سکا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ آئس کریم میں الکحل کی آمیزش تھی۔ نوجوان نے میری صورت سے سمجھا کہ یہ مسلمان ہیں۔ چنانچہ فوری طور پر اس نے الکحل کے بغیر دوسری آئس کریم تیار کی اور جلدی سے لاکر اس کو میرے سامنے رکھ دیا اور پچھلی آئس کریم کھانے سے مجھ کو بچالیا۔

اس نوجوان سے مل کر میں نے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ فلسطینی مسلمان ہے اور اس کا نام بھجت ہے۔ میں نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ وہ عربی بولتا تھا اور بظاہر نہایت ذہین اور مستعد نوجوان تھا۔

یورپ کے ایک تعلیم یافتہ مسیحی جو اکثر یروشلم آتے رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میری معلومات کے مطابق، بہت تھوڑے یہودی ہیں جو مسجد اقصیٰ کو توڑ کر اس کی جگہ سلیمانی ہیکل دوبارہ بنانے کی بات کرتے ہیں۔ بیشتر یہودی اس کے مخالف ہیں۔ مذہبی یہودیوں کے نزدیک دو ہزار سال پہلے جب رومن اس میں داخل ہوئے اور اس کو ڈھادیا تو اب یہ جگہ ناپاک ہو چکی ہے۔ مسیحا جب آئیں گے تو وہی دوبارہ اس کو پاک کریں گے۔ دوسرے یہ کہ یہودیوں کے یہاں عبادت گاہ کا خاص مقصد سوختنی قربانی پیش کرنا ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ یہودی اس قسم کی قربانی کو غیر مہذب سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ کبھی نہیں چاہتے کہ ہیکل دوبارہ تعمیر ہو۔ اور وہاں اس قسم کے غیر مہذب کام دوبارہ کیے جانے لگیں۔

عرب علاقہ میں چلتے ہوئے ایک جگہ کچھ فلسطینی بچے نظر آئے۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ کورس (chorus) کی صورت میں ایک پر جوش ترانہ (أنشودة حماسية) گا رہے ہیں۔ یہ شعر کی

اصطلاح میں ایک ترجیع تھا جس میں ہر چند مصرعوں کے بعد اِس شعر کی تکرار ہوتی تھی کہ آؤ ھم جنگ کریں، آؤ ہم جنگ کریں۔ کیوں کہ جنگ ہی رشد و فلاح کا راستہ ہے:

هَلُمُّوا نُقَاتِل هَلُمُّوا نُقَاتِل   فَإِنَّ القِتَالَ سَبِيلُ الرَّشَادِ

یہ ترانہ شریعت کے خلاف بھی ہے اور عقل کے خلاف بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ۸ھ میں دس ہزار صحابہ کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی طرف مارچ کیا تو ایک سردار کی زبان سے نکلا: الیوم یوم الملحمۃ (آج گھمسان کی جنگ کا دن ہے) آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ آج رحمت کا دن ہے (الیوم یوم المرحمۃ)

وہ عقل کے خلاف اس لیے ہے کہ موجودہ زمانہ کی تبدیلیوں نے جنگی اقدامات کے بجائے پر امن جد و جہد کو طاقت کا سرچشمہ بنا دیا ہے۔ میں نے سوچا کہ فلسطینی قیادت، اگر حدیث کے الفاظ میں اپنے زمانہ سے باخبر (بصیراً بزمانہ) ہوتی تو وہ اپنی نئی نسل کو جنگ کے بجائے امن کا سبق دیتی۔ اور آج برعکس طور پر، ہر فلسطینی بچہ کی زبان پر یہ الفاظ ہوتے:

هَلُمُّوا نُسَالِم هَلُمُّوا نُسَالِم   فَإِنَّ السَّلَامَ سَبِيلُ الرَّشَادِ

(آؤ امن کی روش اختیار کریں آؤ امن کی روش اختیار کریں۔ کیونکہ امن ہی رشد و کامیابی کا راستہ ہے)

ایک عرب عالم سے جہاد (بمعنی قتال) کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ قرآن میں جنگ کا حکم اسلام کی اشاعت کے لیے دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات صحیح نہیں۔ قرآن میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ جنگ کر کے اسلام کی اشاعت کرو۔ قرآن میں صرف یہ ہے کہ فتنہ کو ختم کرنے کے لیے ان سے جنگ کرو (۲ : ۱۹۳)

اس آیت میں فتنہ سے مراد مذہبی جبر (religious persecution) ہے۔ جب مذہبی جبر ختم ہو جائے تو جنگ کا حکم اپنے آپ ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے نماز کے لیے تیمم کی اجازت دی جائے جب کہ پانی نہ ہو۔ پھر جب پانی آجائے تو اپنے آپ تیمم کی اجازت ختم ہو جائے گی۔ آب آید تیمم برخاست۔

میں نے کہا کہ بخاری میں یہ روایت ہے کہ فتنۂ ابن الزبیر کے زمانہ میں کچھ مسلمانوں نے اپنی اس جنگ کے لیے قتال برائے ختم فتنہ کی آیت کو استعمال کیا تو اس وقت حضرت عبد اللہ بن عمر نے

اس کی تردید کی۔ انھوں نے کہا کہ فتنہ کو اصحاب رسولؐ نے جنگ کر کے ختم کر دیا (قد فعلنا) اور جب فتنہ ختم ہوگیا تو اب جنگ کس لیے (فتح الباری، بشرح صحیح البخاری ۱۶۰/۸)

میں نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمر کے اس قول کے مطابق، خلافت راشدہ کے بعد ہی اس فتنہ (مذہبی جبر) کا خاتمہ ہوگیا جس کے خلاف جنگ کا حکم دیا گیا تھا۔ اور جب مذہبی جبر ختم ہو جائے تو اس کے بعد پرامن دعوت اسلام کا زمانہ آجاتا ہے نہ کہ غیر ضروری طور پر متشددانہ جنگ کا۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو لڑائیاں کی ہیں وہ ملک گیری کی لڑائیاں تھیں نہ کہ حقیقی معنوں میں جہاد فی سبیل اللہ۔

۲۹ اگست ۱۹۹۵ کی صبح کو دوبارہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ مسجد الاقصی اور بیت المقدس کی زیارت کے لیے روانہ ہوا۔ میرے ساتھ ایک مسلمان اور دو مسیحی تھے۔ ہم لوگ ایک گیٹ پر پہنچے۔ وہاں اسرائیلی پولیس کے دو آدمی تھے۔ انھوں نے عربی اخلاق کے مطابق گفتگو کی۔ مرحبا، صباح الخیر، اھلاً وسھلاً جیسے کلمات سے ہمارا استقبال کیا۔ مگر انھوں نے کہا کہ اس گیٹ سے صرف مسلم جا سکتے ہیں۔ آپ کے مسیحی دوست کو سیاحوں والے گیٹ سے داخلہ ملے گا۔ ہم لوگ چلتے ہوئے دوسرے گیٹ پر پہنچے تو وہاں بھی پولیس کے دو آدمی تھے اور انھوں نے بھی دوبارہ یہی جواب دیا۔ پھر ہم لوگ روانہ ہوکر تیسرے گیٹ پر پہنچے تو وہاں بھی ہم کو یہی جواب دیا گیا۔ آخر کار ہم چوتھے دروازے پر (دیوار گریہ کے قریب) پہنچے۔ وہاں سب کو بیک وقت داخلہ دیا گیا۔ دکتور محمد امین السماعیلی (المغرب) نے کہا: القضیۃ کلھا مادیۃ۔ چوں کہ مسلمانوں کے لیے داخلہ فری ہے۔ مگر غیر مسلم سیاحوں کو داخلہ کے لیے ٹکٹ لینا پڑتا ہے، اس لیے ان کے داخلہ کے لیے ایک گیٹ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک مسلمان کا تعلق ہے، وہ کسی بھی دروازہ سے بغیر ٹکٹ داخل ہو سکتے ہیں۔

آج میں دوسری بار مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا اور دو رکعت نماز ادا کی۔ اس وقت اسرائیل کے اعتبار سے ۹ بجے صبح کا وقت تھا اور ہندستان کے لحاظ سے ساڑھے گیارہ بجے کا۔ نماز پڑھتے ہوئے دل بھر آیا۔ سجدہ میں روتے ہوئے دعا کے یہ الفاظ نکلے کہ خدایا، زمانہ کا فرق تیرے نزدیک کوئی فرق نہیں۔ تو میرے لیے زمانی دوری کو ختم کر دے۔ مجھ کو اس مقدس جماعت کی صفوں میں شریک کر دے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں امامت کر رہے تھے اور ان کے پیچھے انبیاء صف باندھ کر نماز ادا کر رہے تھے۔

اس کے بعد ہم لوگ بیت المقدس (قبۃ الصخرہ) میں داخل ہوئے۔ اس کا سنہری گنبد اس وقت سورج کی روشنی میں نہایت شان کے ساتھ چمک رہا تھا۔ وہاں بھی دو رکعت نماز ادا کی اور اپنے لیے اور دوسرے لوگوں کے لیے دعائیں کیں۔

شیخ الازہر جاد الحق علی جاد الحق نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ میں نے کبھی بھی قدس جانے کے لیے نہیں سوچا جب کہ وہ اسرائیلی قبضہ کے تحت ہو۔ اللہ کے حکم سے میں اس کی آزادی کے بعد وہاں جاؤں گا (لم افکر ابداً فی زیارۃ القدس وهی تحت الاحتلال الاسرائیلی۔ وسوف ازورها باذن اللہ بعد تحریرها) الدعوۃ، الریاض، العدد ۱۴۰۰، ۲۵ شعبان ۱۴۱۵ھ، ۲۶ جنوری ۱۹۹۵، صفحہ ۲۵

مگر شیخ جاد الحق علی جاد الحق ۹۰ سال کی عمر میں ۱۵ مارچ ۱۹۹۶ کو قاہرہ میں انتقال کر گئے۔ اور وہ قدس کی زیارت نہ کر سکے۔ اس سفر کے دوران میں نے جب مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھی اور وہاں ان غیر معمولی کیفیات کا تجربہ کیا جو کسی بھی دوسرے مقام پر ممکن نہیں، تو میں نے سوچا کہ شیخ الازہر کا فیصلہ کوئی صحیح فیصلہ نہیں تھا۔ دینی رزق کے حصول میں سیاسی قبضہ کو مانع بنانا سنتِ رسولؐ کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں نماز پڑھی جب کہ وہ مشرکین کے قبضہ میں تھا۔ اسی طرح آپؐ نے سفر معراج میں مسجد اقصی میں نماز ادا کی۔ حالاں کہ اس وقت اس پر ایران کے مشرک بادشاہ کی حکومت قائم تھی۔ شاید لوگوں کو روحانی یافت کی قیمت نہیں معلوم، اس لیے وہ سیاسی قضیوں کو غلو آمیز اہمیت دے کر اپنے آپ کو اس نعمت سے محروم کیے ہوئے ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، فکر اسلامی کا باب، الفصل بین القضیتین)

موجودہ زمانہ میں بین اقوامی طور پر مسلّمہ قانون کے تحت ہر آدمی کو یہ آزادی ہے کہ وہ جہاں چاہے جائے مگر مذکورہ غلط پالیسی کی بنا پر ساری دنیا کے مسلمانوں نے یروشلم کا سفر ترک کر رکھا ہے۔ اس کا بھیانک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلمانوں کو یروشلم اور اسرائیل کے حقیقی حالات کا سرے سے پتہ ہی نہیں۔ ساری دنیا کے مسلمان ایک ایسے دشمن کے خلاف لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں جس کے بارہ میں خود ساختہ پروپیگنڈوں کے سوا انھیں کچھ اور نہیں معلوم۔ حتی کہ آمد و رفت نہ ہونے کے نتیجہ میں انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ قدس کیا ہے اور مسجد اقصی کیا ہے۔ دنیا کے تقریباً ۹۹ فی صد مسلمان قدس ہی کو مسجد اقصیٰ سمجھتے ہیں۔ جب کہ دونوں نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے الگ ہیں بلکہ ان کی نوعیت

بھی ایک دوسرے سے مکمل طور پر مختلف ہے۔

ایک فلسطینی نوجوان نے فلسطین کی آزادی کی تحریک کے لیے تطهير القدس من ابناء القردة والخنازير کے الفاظ استعمال کیے۔ یعنی قدس کو بندروں اور سوروں کی اولاد سے پاک کرنا۔ میں نے کہا کہ خدا کے فیصلہ کے تحت رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ نے یہود ونصاریٰ کو جزیرہ عرب سے نکالا۔ مگر اس کے لیے انھوں نے آپ جیسے الفاظ استعمال نہیں کیے۔ رسول اللہؐ نے سادہ طور پر فرمایا: (اخرجوا اليهود والنصارى من جزيرة العرب۔ اور آپ لوگ رسولؐ کی اتباع کے نام پر اس قسم کی غیر شرعی اور غیر اخلاقی زبان استعمال کر رہے ہیں۔

حیدرآباد کے ایک صاحب مرزا مشکور بیگ اپنے کسی کام کے تحت اسرائیل میں مقیم ہیں۔ انھوں نے اپنے کچھ تاثرات حیدرآباد کے روزنامہ سیاست (۵ نومبر ۱۹۹۵) میں چھپوائے ہیں۔ اس کا ایک جزیہ ہے: اسرائیل کے ہر باشندہ کو ۱۸ سال کی عمر ہوتے ہی ریوالور رکھنے کی اجازت ہوجاتی ہے۔ جس طرح ہمارے حیدرآباد میں ہر گلی میں ایک "تیتر" ہوتا ہے جو گلے کے بٹن کھلے رکھ کر سینہ تان کر صرف کمزوروں کو دباتا ہے جس کو حیدرآبادی زبان میں "ابوشیر" کہتے ہیں۔ وہ یہاں نہیں ہے کیوں کہ ہر ایک مسلح ہے۔ کمزور بھی اور طاقت ور بھی۔ اور دونوں ایک دوسرے سے ڈرے ہوئے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اسرائیل میں ہر یہودی کو قانونی طور پر ریوالور رکھنے کی عام اجازت ہے مگر یہ لوگ اس کو صرف غیروں پر استعمال کرتے ہیں نہ کہ اپنے لوگوں پر۔ لیکن مذکورہ بیان کے مطابق، اس چیک کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہر ایک کے پاس ہتھیار رہے۔ اگر ہر ایک کے پاس ہتھیار ہونا چیک بن جاتا ہو تو کراچی اور افغانستان میں یہ واقعہ کیوں نہیں پیش آیا جہاں ہر ایک کے پاس ہتھیار ہونا باہمی خانہ جنگی کا سبب بن گیا۔ اصل یہ ہے کہ یہودی ایک تعلیم یافتہ اور باشعور قوم ہیں۔ ان کی یہی صفت اس بات کے لیے روک بن گئی ہے کہ ایک یہودی اپنا ہتھیار دوسرے یہودی کے خلاف استعمال نہ کرے۔

یہاں کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۶۹ میں ساری دنیا کے یہودیوں نے چندہ جمع کیا تھا تاکہ یروشلم میں ایک بہت بڑا اسنگاگ تعمیر کیا جائے۔ یہ رقم ایک بلین امریکن ڈالر پر مشتمل تھی۔

یہ پوری رقم چیف ربائی کی خدمت میں پیش کی گئی۔ لیکن چیف ربائی نے عبادت گاہ کی تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا : خدا ساری دنیا کا مالک ہے۔ ساری شان وشوکت اسی کے لیے ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں اس کے لیے ایک بلین ڈالر کی رقم کا محل تعمیر کرنے والے۔ اس کی بندگی تو ہر جگہ سوتے جاگتے کی جا سکتی ہے۔ خدا کو جاننے کے لیے علم ضروری ہے۔ جاؤ اس رقم سے ایک تعلیمی ٹرسٹ بناؤ تاکہ کوئی یہودی بے علم نہ رہے۔ اس طرح دنیا کا سب سے بڑا تعلیمی ٹرسٹ ۱۹۷۰ میں اسرائیل میں وجود میں آیا۔

اسرائیل میں یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کے بعد سب سے بڑا درجہ تعلیم کا ہے۔ یہاں تعلیم کو ہوا اور پانی کی طرح فری کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر فرد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔

یروشلم موجودہ زمانہ میں یہودیوں کا مرکز ہے۔ یہاں بہت سے یہودیوں سے ملاقات ہوئی اور ان سے باتیں ہوئیں۔ میرا احساس یہ تھا کہ یہودی کوئی غیر انسانی مخلوق نہیں ہیں۔ وہ بھی اسی طرح انسان ہیں جس طرح دوسرے بہت سے انسان ہیں۔ وہ بھی اپنے اندر ایک فطرت رکھتے ہیں۔ اسی طرح موجودہ اختلافی زمانہ میں بھی بہت سے یہودی مسلمان ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک تازہ مثال پاکستان کے مشہور کھلاڑی عمران خان کی بیوی جمائما کی ہے۔ وہ لندن کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ مگر اسلام کی تعلیمات نے انھیں متاثر کیا۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس وقت وہ پاکستان میں رہ رہی ہیں۔ اور اب ان کا لباس قمیص اور شلوار اور دوپٹہ ہے۔

یہودیوں سے گفتگو کے دوران محسوس ہوا کہ ان کے بھی مفادات ہیں جس طرح ہمارے مفادات ہیں۔ تاہم وہ بھی اسی طرح عقلی دلائل کے آگے جھکتے ہیں جس طرح دوسرے انسان عقلی دلائل سن کر جھک جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہودیوں کے سلسلہ میں ہم کو زیادہ فطری نقطۂ نظر اختیار کرنا چاہیے۔ یعنی ہم انھیں "دشمن" کے روپ میں دیکھنے کے بجائے "مدعو" کے روپ میں دیکھیں۔ اور فطرت کے اسلوب میں انھیں دین حق کا مخاطب بنائیں۔

یروشلم کے چند روزہ قیام کے دوران بہت سے ادارے اور عبادت خانے دیکھنے کا موقع ملا۔ مسلمانوں کے بھی اور غیر مسلموں کے بھی۔ میں نے پایا کہ عیسائی حضرات کے یروشلم میں کثیر تعداد میں بہت بڑے بڑے چرچ ہیں، یہاں ان کے شاندار ادارے ہیں۔ انھوں نے جلسوں اور میٹنگوں

کے لیے نہایت عمدہ قسم کے ہال بنا رکھے ہیں۔ مگر جہاں تک میں معلوم کر سکا تو فلسطینی مسلمانوں کے یہاں اس طرح جدید معیار کے اعلیٰ ادارے موجود نہیں۔ اس کی وجہ غالباً دونوں کے مزاج کا فرق ہے۔ عیسائی حضرات تعمیری شعبوں میں اپنے کو مستحکم بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ذہن سیاست اور اقتدار سے اتنا زیادہ ماؤف ہیں کہ وہ یہ سوچ نہیں پاتے کہ یہاں کوئی اور بھی کام ہے جس میں انھیں مشغول ہونا چاہیے۔

یہ دراصل فکری پس ماندگی کی علامت ہے۔ قدیم زمانہ میں سیاسی ادارہ ہی واحد سب سے بڑا ادارہ سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں سیاسی ادارہ نے ثانوی حیثیت حاصل کرلی ہے باشعور قوموں نے اس تبدیلی کو جان کر اس کے مطابق اپنی تعمیر کرلی۔ مگر مسلم رہنما اور دانشور سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے سیاست کی چٹان سے اپنا سر ٹکرا رہے ہیں۔ بے شمار قربانیوں کے باوجود وہ کوئی بھی حقیقی چیز حاصل نہ کر سکے۔

مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگ اکثر جذباتی انداز میں کہتے ہیں کہ: مَنْ لِلقدس؟ یعنی کون ہے جو قدس کے لیے کچھ کرے۔ یہ جملہ بظاہر یہ تاثر دیتا ہے جیسے کہ قدس کا میدان خالی پڑا ہوا ہے اور وہاں کوئی کچھ نہیں کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ بات صد فیصد بے بنیاد ہے۔

۱۹۴۸ میں شیخ حسن البنّا نے قاہرہ میں جلوس نکالا جس میں ایک لاکھ مصری شریک تھے۔ اس کا نعرہ تھا: لبیك یا فلسطین (اے فلسطین ہم حاضر ہیں) پھر کئی بار باقاعدہ مسلم فوجوں نے اسرائیل سے جنگ کی۔ اس کے علاوہ فلسطینیوں کی عسکری تنظیمیں ہر روز قربانی دے کر اس محاذ پر لڑائی لڑ رہی ہیں۔ اس کی آخری حد یہ ہے کہ پر جوش فلسطینی اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر اسرائیلی آبادی میں گھس جاتے ہیں۔ یہ خودکش بمبار خود بھی ہلاک ہوتے ہیں اور بہت سے اسرائیلیوں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ وغیرہ۔

ایسی حالت میں مَنْ لِلقدس کا جذباتی نعرہ سراسر بے معنی ہے۔ اس قسم کے دانش وروں کی غلطی یہ ہے کہ وہ فلسطینی جدوجہد کا نتیجہ نہیں دیکھ رہے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ اس محاذ پر جدوجہد بھی نہیں ہو رہی ہے۔ حالاں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جدوجہد تو سرفروشانہ حد تک جاری ہے۔ مگر عملاً وہ سب کی سب بے نتیجہ ثابت ہو رہی ہیں۔ یا یہ قرآنی الفاظ میں، حبط اعمال کا

شکار ہو رہی ہیں۔ گویا کہ جو چیز مفقود ہے وہ جدوجہد کا نتیجہ ہے نہ کہ خود جدوجہد۔

ہندستان اور اسرائیل کے وقت میں ڈھائی گھنٹہ کا فرق ہے۔ ۲۹ اگست کی صبح کو مقامی وقت کے اعتبار سے آٹھ بجے ہیں۔ میری گھڑی ہندستان کے اعتبار سے ساڑھے دس بجے کا وقت بتا رہی ہے۔ سورج میلوں تک کے پورے ماحول کو آخری حد تک روشن کیے ہوئے ہے۔ میں اپنے کمرہ میں لگے ہوئے "قد دیوار" شیشوں کے پیچھے کھڑا ہوا باہر شہر قدس کا منظر دیکھ رہا ہوں ——— یہ حضرت داؤدؑ کے محل کے کھنڈر ہیں۔ یہاں حضرت سلیمانؑ کے محل کا کھنڈر تھا۔ یہ بیت المقدس ہے جس کو عبد الملک بن مروان اموی نے بنوایا تھا۔ یہ وہ رومی عدالت ہے جہاں حضرت مسیحؑ کے خلاف فیصلہ سنایا گیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت مریم کی پیدائش ہوئی۔ یہ مسجد اقصیٰ ہے جہاں پیغمبر اسلامؐ نے تمام نبیوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کی۔ یہ مسجد عمر ہے جہاں فتح فلسطین کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے نماز ادا فرمائی۔ اسی طرح پورے علاقوں میں جگہ جگہ نبیوں کے نام کی تختیاں لگی ہوئی ہیں۔ سبھی مذہبی فرقے ان نبیوں اور بزرگوں کا احترام کرتے ہیں، مگر یہی فرقے آپس میں ایک دوسرے کا احترام کرنے کے لیے تیار نہیں۔

فلسطین کا مسئلہ پچھلے پچاس سال سے پوری مسلم دنیا، خصوصاً عرب دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ اس دور کا عرب لٹریچر فلسطین کی باتوں سے پُر ہے۔ لکھنے اور بولنے والوں نے نہایت جذباتی انداز میں اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ ایک عرب شاعر الزرکلی نے کہا کہ صلاح الدین کو دوبارہ ہمارے درمیان لاؤ اور حطین یا حطین جیسا معرکہ دوبارہ تازہ کرو:

هاتِ صلاح الدين ثانيةً فينا   جدد حطين او شبه حطينا

ایک اور عرب شاعر احمد مطار جو آج کل لندن میں رہتے ہیں، ان کی نظم کے دو شعر یہ ہیں:

القدس للدنيا قمر   في القدس قد نطق الحجر

لا مؤتمر لا مؤتمر   انا لا اريد سوى عمر

(قدس دنیا کے لیے چاند ہے۔ قدس میں پتھر بھی بول پڑا۔ مجھے کانفرنس نہیں چاہیے۔ میں تو صرف عمر کو چاہتا ہوں)

مگر عملی اعتبار سے دیکھا جائے تو فلسطین کے محاذ پر اب تک کچھ بھی حاصل نہ کیا جا سکا۔

موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مسلمان امریکہ سے نفرت کرتے ہیں۔ اور اس کو اسلام کا

دشمن نمبر ایک کہتے ہیں۔ اس کا سبب، ایک فلسطینی نوجوان کے الفاظ میں یہ ہے کہ — امریکی مدد ہی اسرائیل کے وجود و بقا کا واحد راز ہے (الدعم الامریکی هو سر استمرار اسرائیل و بقاء ها)

عجیب بات ہے کہ عین اسی وقت ساری دنیا کے مسلمان امریکہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کوئی براہ راست طور پر اور کوئی بالواسطہ طور پر۔ آج بھی ایک مسلمان یہ کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے کہ میں نے امریکہ کا سفر کیا، یا میرا بیٹا امریکہ میں سٹل ہو گیا ہے۔ مزید یہ کہ جو مسلمان امریکہ میں باقاعدہ بس گئے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ ان کی نئی نسل امریکی شہری ہونے پر فخر کرتی ہے۔ مکہ سے نکلنے والے العالم الاسلامی کی (۶ ذوالقعدہ ۱۴۱۶ھ) رپورٹ کے مطابق، امریکہ کے ایک مسلم نوجوان نے کہا کہ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں ایک امریکی مسلمان ہوں:

I am proud to be an American Muslim.

یہی دو عملی موجودہ دنیا کے مسلمانوں کی اصل کمزوری ہے۔ جس روش کو اصولی طور پر وہ ماننے کے لیے تیار نہیں، اسی روش کو نہایت اطمینان کے ساتھ ان کے تمام چھوٹے اور بڑے عملاً اختیار کیے ہوئے ہیں۔

عرب علاقہ میں کئی بار جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک جگہ کچھ عرب نوجوان آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہاں کھڑے ہو کر ہم لوگ انھیں دیکھنے لگے۔ پھر میں ایک نوجوان کے قریب گیا۔ گفتگو کے دوران اس نے جو باتیں کہیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ صہیونی مقبوضہ فلسطین کو ایک عظیم قید خانہ میں تبدیل کر رہے ہیں (الصهاينة يحوّلون فلسطين المحتلة الى سجن كبير)

میں نے کہا کہ آپ لوگ یہود کی طاقت کو جانتے ہیں مگر فطرت کی طاقت سے آپ لوگ بے خبر ہیں۔ اگر کوئی یہودی کہے کہ "ہم پورے فلسطین کو ایک قید خانہ بنا دیں گے" تو آپ کو اس کے جواب میں کہنا چاہیے کہ ایک پورے ملک کو قید خانہ بنانا کوئی سادہ بات نہیں، یہ خدا کے مقرر کیے ہوئے نظامِ فطرت سے لڑنا ہے۔ اور نظامِ فطرت سے لڑنا نہ کسی منی پاور کے لیے ممکن ہے اور نہ کسی سپر پاور کے لیے۔

دنیا کے کسی بھی حصہ میں کسی بھی مسلمان سے بات کی جائے تو وہ فلسطینی عربوں کے اوپر

اسرائیل کے وحشیانہ مظالم کی بات کرے گا۔ بطور واقعہ یہ بات صحیح ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس شکایت اور احتجاج کا کوئی نتیجہ ہے۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ فلسطینی عربوں کا موقف اپنی جگہ پر درست ہے، مگر جب وہ جنگ کی طاقت نہیں رکھتے تو وہ اپنی تحریک متشددانہ انداز پر کیوں چلاتے ہیں۔ جب کہ بار بار کے تجربہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایک اسرائیلی بس پر بم مارتے ہیں تو اسرائیل پوری عرب بستی پر بمباری کر کے اس کو تباہ کر دیتا ہے۔

ساؤتھ افریقہ کے پریسیڈنٹ نیلسن منڈیلا (Nelson Mandela) نے فلسطینیوں کی حمایت میں ایک بیان دیا اور حماس کے نمائندوں سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو تمام عرب خوش ہو گئے۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے کہا کہ نیلسن منڈیلا کے ان الفاظ سے زیادہ کارآمد خود ان کا عملی نمونہ ہے۔ ان کو بھی اپنے ملک میں فلسطین جیسے حالات کا سامنا تھا۔ مگر انھوں نے اپنی پوری تحریک پر امن انداز میں چلائی۔ یہاں تک کہ وہ کامیاب ہو گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فلسطینیوں کو نیلسن منڈیلا کے اس تجربہ سے سبق لینا چاہیے۔

ایک بار میں نے ایک عرب اسکالر کو بتایا کہ میں ایک انٹرنیشنل پیس کانفرنس میں جانے والا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ یہ پیس کانفرنسیں بالکل بے کار ہیں۔ یہ لوگ انصاف کے سوال کو نظر انداز کر کے امن قائم کرنا چاہتے ہیں حالاں کہ انصاف کے بغیر امن ممکن نہیں۔ مگر یہ ایک غیر حقیقی بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امن کا تعلق انصاف سے نہیں ہے۔ امن کا مقصد انصاف حاصل کرنا نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف مواقع عمل تلاش کرنا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ معاہدہ کے ذریعہ امن حاصل کیا۔ حالاں کہ وہ واضح طور پر انصاف کے خلاف تھا۔ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد انصار نے "منا امیر ومنکم امیر" کا مطالبہ واپس لے کر امن حاصل کیا۔ حالانکہ وہ انصاف کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں جب بھی امن حاصل کیا گیا ہے، انصاف کے سوال کو نظر انداز کر کے حاصل کیا گیا ہے۔ انصاف تو اس جدوجہد کا ثمرہ ہے جو امن کے بعد جاری کی جاتی ہے۔ وہ خود امن کے اندر براہ راست طور پر شامل نہیں ہوتا۔

سفر کے دوران ایک فلسطینی عرب سے گفتگو ہوئی۔ میں نے امن کی اہمیت پر زور دیا

اور تشدد کو بے فائدہ بتایا۔ انھوں نے کہا کہ ہم تشدد کے خلاف ہیں۔ مگر ہم وہ امن چاہتے ہیں جو عدل کے ساتھ ہو (نحن نبنذ العنف ولكننا نريد سلاماً عادلاً)

یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے طبقہ کا نظریہ ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی زبان میں یہی بولی بول رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مسلم انگریزی میگزین (ریڈینس ۲۴-۳۰ مارچ ۱۹۹۶) نے اس موضوع پر ایک پرجوش آرٹیکل شائع کیا ہے۔ اس کا خلاصہ مذکورہ میگزین نے اپنے ٹائٹل کے اوپر اس طرح جلی حرفوں میں نمایاں کیا ہے ـــــ امن بغیر انصاف، دور کا خواب ہے:

Peace sans justice—a distant dream

یہ الفاظ بظاہر خوب صورت معلوم ہوتے ہیں مگر عملی اعتبار سے وہ سراسر بے معنی ہیں۔ کیونکہ موجودہ دنیا میں امن کبھی بھی نظری انصاف کی بنیاد پر نہیں ملتا، حتی کہ پیغمبر کو بھی نہیں۔ امن یہاں جب بھی کسی کو ملتا ہے صورت موجودہ پر راضی ہونے کی بنیاد پر ملتا ہے نہ کہ بوقت صلح غیر حاصل شدہ انصاف کو حاصل کرنے کی بنیاد پر۔ پیغمبر کی زندگی میں اس کی ایک واضح مثال حدیبیہ کا معاہدۂ امن ہے۔ اس کا حصول صرف اس وقت ممکن ہو سکا جب کہ پیغمبر نے صورت موجودہ (اسٹیٹس کو) پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

۱۹۱۷ میں برٹش امپائر نے فلسطین کی تقسیم کا ایک فارمولا بنایا جو عام طور پر بالفور ڈیکلریشن کے نام سے مشہور ہے۔ اس تقسیم میں فلسطین کا صرف ایک تہائی حصہ اسرائیل کو دیا گیا تھا اور اس کا دو حصہ عربوں کے لیے خاص کیا گیا تھا جس میں پورا کا پورا یروشلم بھی شامل تھا مگر اس وقت کی مسلم قیادت نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک عرب عالم نے اس کو قبول کر لینے کی بات کہی تو اس پر عرب مفاد سے غداری کا الزام لگایا گیا چنانچہ وہ شخص یہ شعر کہہ کر مر گیا ـــــ عنقریب میری قوم جان لے گی کہ میں نے اس کو دھوکا نہیں دیا ہے۔ اور رات خواہ کتنی ہی لمبی ہو جائے صبح بہرحال آکر رہتی ہے:

سیعلم قومی اننی لا اُغشُّھم　　　ومھما استطال اللیل فالصبح واصل

اُس وقت کی مسلم قیادت نے اگر اسٹیٹس کو (حالت موجودہ) کو قبول کر لیا ہوتا تو فلسطینیوں کی حالت

آج سوگنا بہتر ہوتی۔ مزید یہ کہ وہ اس ناقابل بیان تباہی سے بچ جاتے جو پچھلے پچاس سال سے جاری ہے اور ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ نزاعی مسائل کو حل کرنے کا واحد ممکن فارمولا یہی ہے۔ دسمبر ۱۹۹۶ میں میری ملاقات اقوام متحدہ کے ایک ذمہ دار سے ہوئی۔ انھوں نے ذاتی ملاقات میں مجھ سے پوچھا کہ اجودھیا اور کشمیر کے مسئلہ کا حل کیا ہے۔ میں نے کہا، دونوں کے لیے واحد نکاتی فارمولا صرف ایک ہے —— حالت موجودہ کو قبول کر لیجئے۔

I have one-point formula for both—accept the status quo.

فلسطینیوں نے یاسر عرفات کی قیادت میں اسرائیل کے یہودیوں سے جو صلح ستمبر ۱۹۹۵ میں کی ہے اس پر مسلم دنیا میں مختلف رائیں ظاہر کی گئی ہیں۔ سعودی عرب کے مشہور عالم شیخ ابن باز نے اس کو درست قرار دیا ہے۔ اس پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا اور کہا کہ قرآن کے مطابق یہودیوں سے مودت اور موالات جائز نہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ ابن باز نے کہا ہے کہ یہودیوں اور دوسرے کافروں سے صلح ان کے ساتھ مودت اور موالات کو لازم نہیں کرتی (الصلح مع اليهود أو مع غيرهم من الكفرة لا يلزم مودتهم ولا موالاتهم)

الدعوه، ریاض ۲۵ شعبان ۱۴۱۵ھ / جنوری ۱۹۹۵ء

شیخ ابن باز کے اس فتوے سے اسلام کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کوئی گروہ خواہ بظاہر وہ دشمن اسلام کیوں نہ ہو، اس کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ معاہدہ ان کے ساتھ مودت اور موالات کو مستلزم نہیں ہوگا۔ دو چیزوں میں فرق کرتے ہوئے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ دیکھنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم سنت ہے اور اس پر آپ نے بار بار عمل فرمایا ہے۔ مزید یہ کہ یہ ایک حکمتِ حیات ہے، اور اس حکمت کی رعایت کیے بغیر اس دنیا میں کوئی بڑی کامیابی نہیں ہو سکتی۔

پی ایل او جس کو تقریباً ......۵۰ فلسطینیوں کی نمائندہ تنظیم بتایا جاتا ہے، وہ ۱۹۶۴ میں قائم کی گئی تھی۔ اس تنظیم کا مقصد اس کے ابتدائی چارٹر کے مطابق یہ تھا —— اسرائیل کا استیصال اور صہیونی تحریک کا مکمل خاتمہ۔

مگر عملاً بالکل برعکس صورت پیش آئی۔ یہاں تک کہ یہ تحریک اپنے اعلان کردہ مقصد میں اس حد تک ناکام ہوئی کہ تقریباً ۳۵ سال بعد ۲۴ اپریل ۱۹۹۶ کو فلسطین نیشنل کونسل کی میٹنگ غازہ پٹی میں ہوئی۔ اس میں اتفاق رائے سے قدیم چارٹر کی اس دفعہ کو سرے سے حذف کر دیا گیا۔

مسلم پریس نے عام طور پر یاسر عرفات کے زیر قیادت فلسطینی تنظیم کے اس فیصلہ کی مذمت کی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ٹھیک یہی قابل مذمت فعل ان دوسرے مسلم رہنماؤں نے بھی عملاً کر رکھا ہے جو ابھی تک مسلم پریس میں قابل تعریف سمجھے جاتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام مسلم رہنماؤں نے یہی کیا ہے کہ ابتداءً وہ "باطل کی کامل تخریب" کے پرشور نعروں کے ساتھ اٹھے اور اب انھیں لوگوں نے ہر جگہ اس باطل کے ساتھ موافقت کا انداز اختیار کر رکھا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ فلسطینی قیادت نے پسپائی کا یہ فیصلہ اعلان کے ساتھ کیا، جبکہ بقیہ مسلم رہنما بلا اعلان اسی مصالحانہ روش کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔

پاکستانی اخبار نوائے وقت کے شمارہ ۱۶ مارچ ۱۹۹۶ میں ایک خبر جلی سرخیوں کے ساتھ نظر سے گزری۔ انسداد دہشت گردی کی عالمی کانفرنس کے خاتمہ پر حماس کی طرف سے اسرائیل کے خلاف ایک اعلان کیا گیا جو مذکورہ اخبار میں اس سرخی کے ساتھ چھاپا گیا: یہودیوں کو سکون کی نیند نہیں سونے دیں گے۔

میں نے اس خبر کو پڑھا تو میرے دل نے کہا کہ یہ اعلان ادھورا ہے۔ فلسطینی تنظیم حماس کا اعلان مکمل طور پر ان الفاظ میں ہونا چاہیے: یہودیوں کو سکون کی نیند نہیں سونے دیں گے، خواہ ہم کو وہ موت کی نیند سلا دیں۔

ایک صاحب کو مجھ سے کافی عقیدت ہے۔ کانفرنسوں میں کئی بار ان سے ملاقات ہو چکی ہے۔ اس بار ملاقات ہوئی تو انھوں نے جلدی سے میرا ہاتھ چوم لیا۔ اس کو دیکھ کر ایک بزرگ نے فرمایا: کیا یہ اسلام میں جائز ہے۔ میں نے کہا کہ اس قسم کی چیزیں ہمیشہ وقتی جذبہ کے تحت ہوتی ہیں۔ ان کا جائز اور ناجائز سے کوئی تعلق نہیں۔

ابن کثیر نے باب "فتح بیت المقدس علی یدی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ" کے تحت لکھا ہے کہ

عمرؓ جب شام پہنچے تو ابو عبیدہؓ اور دوسرے سرداران سے ملے۔ مثلاً خالدبن الولیدؓ، یزیدبن ابی سفیان۔ پھر ابو عبیدہ سواری سے اتر کر پیدل چلے اور عمر بھی سواری سے اتر کر پیدل چلے ـــــ پھر ابو عبیدہ نے اشارہ کیا تاکہ عمر کا ہاتھ چومیں، تو عمر نے چاہاکہ ابو عبیدہ کا پاؤں چوم لیں۔ چنانچہ ابو عبیدہ رک گئے اور عمر بھی رک گئے (البدایہ والنہایہ ۷/۵۵)

۲۹ اگست ۱۹۹۵ کی صبح کو افتتاحی اجلاس تھا۔ وہ یروشلم کے نوٹرڈیم (Notre Dame) ہال میں ہوا۔ اسٹیج کے پیچھے حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے تھے:

Community of St. Egidio
International Meetings: People and Religions
Together in Jerusalem: Jews, Christians and Moslems

معاً فی القدس : یھوداہ ومسیحیین ومسلمین

تقریروں کا خلاصہ یہ تھا کہ تینوں مذہب (یہودیت، مسیحیت، اسلام) کو پر امن طور پر مل کر رہنا چاہیے۔ کیوں کہ ہم ایک وسیع انسانی برادری کے افراد ہیں:

We are all members of one large human family.

یہودی مقرر نے کہاکہ ہم روزانہ اپنی تین وقت کی عبادت میں اور دوسرے مواقع پر "شلوم" کہتے ہیں جس کا مطلب امن ہے۔ اس نے کہاکہ امن یہودیت کا بنیادی اصول ہے۔ امن ہے تو سب کچھ ہے، امن نہیں تو کچھ بھی نہیں:

With peace every thing, without peace nothing.

شیخ عبد السلام مدیر اوقاف القدس نے اپنی تقریر میں اسٹیج کو منبر الحب کہا۔ ان کا عربی لہجہ بہت اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ انھوں نے موضوع سے متعلق قرآن کی مختلف آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ انھوں نے کہاکہ قدس کا نام ہی بتاتا ہے کہ اس علاقہ کو ہر قسم کی اخلاقی برائیوں سے پاک ہونا چاہیے۔ آیت لاینال عھدی الظالمین کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہاکہ جو عہد پر قائم رہے اس کے لیے خدا کا وعدہ ہے جو عہد سے نکل جائے وہ اس سے نکل گیا "شرعُ من قبلنا شرعٌ لنا مالم ینسخ" پچھلی شریعت بھی ہماری شریعت ہے، جب تک وہ منسوخ نہ ہو۔ جہاد کے معنی کوشش (بذل الجھد) کے ہیں۔ اگر قولی دعوت کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو تو قتال نہیں ہے۔ لیکن

غیر مسلم کی طرف سے قتال کیا جائے تو داعی بھی دفاع کرے گا۔ ان کا پورا انداز پر جوش مجاہدانہ تھا۔ صدر اجلاس نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا پیس، شلوم، سلام۔

۲۹ اگست کو دوپہر کے سیشن میں کئی تقریریں تھیں۔ ربی ڈیوڈ روزن (David Rosen) نے اپنی پر جوش انگریزی تقریر میں یروشلم کی زبردست تعریف بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ دنیا میں جو حسن اتارا گیا اس کا دس میں سے نو حصہ یروشلم کو دیا گیا اور باقی ایک حصہ ساری دنیا میں تقسیم کیا گیا۔ انھوں نے یہودیوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم یہاں صرف رہنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ اس لیے ہیں کہ ہم یروشلم سے محبت کریں :

We are here not just to live in Jerusalem, but to love Jerusalem.

آج کے سیشن میں میں نے آدھ گھنٹہ کا ایک پیپر پیش کیا۔ اس انگریزی پیپر کا خلاصہ یہ تھا کہ یروشلم میں تین مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) کے درمیان جو نزاع پیدا ہوگئی ہے اس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنّت پر عمل کرکے حل کیا جاسکتا ہے۔ وہ ہے میرے لفظوں میں ـــــ الفصل بین القضیتین یا عدم الخلط بین الشیئین ہے۔ معراج کے موقع پر پیغمبر اسلام خدائی انتظام کے تحت مکہ سے یروشلم آئے اور یہاں مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کی۔ اس وقت یروشلم پر مشرک ایرانیوں کی حکومت تھی۔ آپ نے سیاسی اشو کو مذہب سے الگ رکھا۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو اس وقت آپ ایک ایسی مسجد میں نماز نہ ادا کرتے جو عملاً غیر مسلموں کے سیاسی اقتدار کے تحت تھی (یہ مقالہ پوری شکل میں الرسالہ نومبر ۱۹۹۵ میں دیکھا جاسکتا ہے)

یہودی علماء اور دانشوروں کی باتوں اور ان کی تقریروں کو سن کر مجھے احساس ہوا کہ ان کے اندر وہ نفسیات مزید اضافہ کے ساتھ موجود ہے جو موجودہ مسلمانوں میں ہے۔ یعنی "فخر کے ساتھ کہو ہم یہودی ہیں" میں نے سوچا کہ اس کا راز کیا ہے۔ میری سمجھ میں آیا کہ اس کا راز یہ ہے کہ بائبل میں دور اول کے یہودیوں کے بارہ میں جو باتیں ہیں اس کو وہ اپنے اوپر چسپاں کررہے ہیں۔ اور بعد کے زوال یافتہ یہودیوں کے بارہ میں جو باتیں ہیں اس کو انھوں نے نظر انداز کر رکھا ہے۔ ٹھیک ایسا ہی خود مسلمان بھی کر رہے ہیں۔ قرآن و حدیث میں دور اول کے اہل ایمان کے بارہ میں جو باتیں ہیں موجودہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو اس کا مصداق بنا رکھا ہے۔ اور اس

میں جو باتیں بعد کے زوال یافتہ مسلمانوں کے بارہ میں کہی گئی ہے، اس سے اس طرح چشم پوشی اختیار کرلی ہے جیسے کہ وہ کسی اور گروہ کے بارہ میں ہوں۔

ایک یہودی دانشور جو آج کل امریکہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی تجویز تو بڑی اچھی ہے، مگر کیا یہ ممکن بھی ہے۔ میں نے کہا کہ یقینی طور پر ممکن ہے۔ اور وہ اس طرح کہ آپ فلسطینی عربوں کو وہی شہری حقوق اور وہی مذہبی آزادی دینے کے لیے تیار ہو جائیں جو آپ خود امریکہ میں حاصل کیے ہوئے ہیں۔ امریکہ میں آپ کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ وہاں آپ کو یکساں شہری حقوق ملے ہوئے ہیں۔ یہی آپ دل سے فلسطینیوں کو دے دیں۔ اس کے بعد یہ تجویز سراسر قابل عمل ہو جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف تھوڑے لوگ ہوتے ہیں جو سیاسی آرزوئیں اپنے سینہ میں لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ بیشتر لوگوں کی دلچسپی صرف اس سے ہوتی ہے کہ انھیں یکساں شہری حقوق حاصل ہوں۔ وہ آزادانہ طور پر اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ ان کے لیے تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے مواقع کھلے ہوئے ہوں۔ ان کو اپنے ماحول میں عزت واحترام ملا ہوا ہو۔ اگر کوئی حکومت عام شہریوں کو یہ چیزیں دے دے، جیسا کہ امریکہ اپنے شہریوں کو دیے ہوئے ہے تو سیاسی شورشیں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

میں نے سنا تھا کہ اسرائیل میں خوف و ہراس کا ماحول ہونے کی وجہ سے وہاں ہارٹ اٹیک کے واقعات بہت ہوتے ہیں۔ اس کی ایک تصدیق غالباً یہ تھی کہ میں نے ایک اشتہار دیکھا اس میں بتایا گیا تھا کہ اسرائیل میں ایک نئی ہارٹ لائن ٹکنالوجی ڈولپ کی گئی ہے۔ اس کے مطابق آدمی کے ٹیلی فون سے جیبی سائز کا ایک ٹرانسمیٹر وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ ممکن ہو جاتا ہے کہ بوقتِ ضرورت آدمی فی الفور میڈیکل سنٹر سے ربط قائم کر سکے اور ذاتی طور پر میڈیکل سنٹر پہنچے بغیر اس کی ای سی جی جانچ ہو جائے اور فوری طور پر وہ طبی مشورہ حاصل کر سکے۔ اس اشتہار کے چند الفاظ یہ تھے :

Heart attacks are still today's No. 1 Killer,
But Heartline can help in saving lives.

اسرائیل کے شہری مسلسل طور پر اپنے کو غیر محفوظ محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کو تحفظ دینے کے لیے اسرائیلی ریاست ہر سال اپنے بجٹ کا بہت بڑا حصہ خرچ کرتی ہے۔ اسرائیلی حکومت کو یہ مہنگا خرچ منظور ہے مگر اس کو یہ منظور نہیں کہ وہ فلسطینیوں کو ان کا جائز حق دے دے۔ اور اس طرح فلسطین میں عدم تحفظ کی صورت حال کا خاتمہ کر دے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ بجٹ والا مسئلہ صرف خرچ کا مسئلہ ہے، جب کہ حقوق دینے کا مسئلہ ان کے لیے قومی وقار کا مسئلہ ہے۔ اور تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ قومیں اپنے وقار کا جھنڈا کسی حال میں نیچے اتارنے پر راضی نہیں ہوتیں خواہ اس کے نتیجہ میں انھیں سو گنا زیادہ بڑے نقصان کو برداشت کرنا پڑے۔

اطالوی مسیحی تنظیم (Community of St. Egidio) کی طرف سے یروشلم میں جوائنٹ انٹرنیشنل کانفرنس (۲۹-۳۰ اگست ۱۹۹۵) منعقد کی گئی، اس کا شعار یہ تھا:

Together in Jerusalem: Jews, Christians and Moslems

اس کانفرنس میں ۳۰ اگست کی صبح کو "راونڈ ٹیبل" کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے درمیان ایک پولیٹکل ڈائیلاگ تھا۔ اس میں فلسطینیوں کی طرف سے مسٹر فیصل حسینی شریک تھے جو سابق مفتی اعظم فلسطین کے صاحبزادے ہیں۔ اسرائیل کے نمائندہ کی حیثیت سے اس کے اکونمی اور پلاننگ شعبہ کے منسٹر مسٹر یوسی بیلن موجود تھے۔ درمیانی مددگار کی حیثیت سے اٹلی کے سینیر جرنلسٹ مسٹر اریگو لیوی تھے۔

۳۰ اگست کی صبح کو میں یروشلم کے نوٹر ڈیم سنٹر (Notre Dame Centre) پہنچا تو وہاں کے وسیع ہال میں ایک طرف سامعین کی کرسیاں مکمل طور پر بھری ہوئی تھیں۔ دوسری طرف اسٹیج پر ایک لمبی میز تھی جس پر تین کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک فلسطینی نمائندہ کے لیے، دوسری اسرائیلی نمائندہ کے لیے، اور تیسری درمیانی کرسی اطالوی صدر کے لیے۔ میز پر ناموں کی تختیاں حسب ذیل ترتیب کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں:

Yossi Beilin—Arrigo Levi—Feisal Husseini

ٹھیک دس بجے تینوں صاحبان پیچھے کے دروازہ سے ہال میں داخل ہوئے۔ میری نشست اگلی کرسی پر عین اسٹیج کے سامنے تھی، اس لیے میں ان کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ پرشوق سامعین

کے ہجوم اور ویڈیو کیمروں کی ہماہمی کے درمیان دونوں کی سیاسی گفتگو شروع ہوئی۔

پہلے صدر جلسہ نے کچھ ابتدائی باتیں کیں۔ اس کے بعد دونوں نمائندوں کے درمیان گفتگو ہوئی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسرائیلی نمائندہ کا یہ کہنا تھا کہ فلسطین کے سیاسی جغرافیہ کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب اس کو قبول کر کے آپ یہاں اپنی زندگی کی تشکیل کیجئے۔ فلسطینی نمائندہ کا مطالبہ تھا کہ یروشلم کے معاملہ پر نظر ثانی کی جائے۔ اس کو کھلا شہر قرار دیا جائے۔ اور یہاں فلسطینیوں اور یہودیوں کی دوگونہ راجدھانی قائم کی جائے:

One open city with two capitals.

مگر دونوں اپنے اپنے موقف پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ میٹنگ کا مقرر وقت ختم ہو گیا۔

گفتگو کے دوران واضح طور پر محسوس ہوتا تھا کہ اسرائیلی نمائندہ زیادہ ذہین اور ماہر ہے۔ اس کے مقابلہ میں فلسطینی نمائندہ ہر اعتبار سے کمتر ثابت ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر اسرائیلی نمائندہ نے بتایا کہ میں نے پچھلے ہفتہ اریحا جا کر مسٹر یاسر عرفات سے ملاقات کی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے ایک طرف ہم سے امن معاہدہ کیا ہے، اور دوسری طرف فلسطینی مسئلہ پر آپ جہاد کی باتیں بھی کر رہے ہیں۔ یہ تضاد کیوں۔ فلسطینی نمائندہ نے اس کے جواب میں کہا کہ اسلام میں جہاد کا مطلب صرف قتال نہیں ہے۔ انھوں نے حدیث (رجعنا من الجهاد الأصغر الى الجهاد الأكبر) سنا کر کہا کہ اسلام میں زیادہ بڑا جہاد تو نفس کا جہاد ہے اور جہاد بالسیف چھوٹا جہاد ہے۔ انھوں نے جہاد اکبر کا انگریزی ترجمہ (bigger jihad) کیا اور جہاد اصغر کا ترجمہ (smaller jihad) میں سمجھتا ہوں کہ یہ جواب بھی نادرست تھا اور یہ ترجمہ بھی نادرست۔

پچھلے دن کے اجلاس میں میں نے اپنا پیپر پیش کیا تھا جس میں کہا تھا کہ اس خطہ میں امن قائم کرنے کے لیے پولیٹکل اشو اور مذہبی اشو کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ جلسہ کے اطالوی صدر نے آخر میں اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہی اس نازک مسئلہ کا حل ہے۔ میرے پاس اپنے پیپر کی ایک نقل موجود تھی۔ میں نے فوراً اٹھ کر صدر جلسہ کو وہ نقل دے دی۔ انھوں نے فوراً ہی اس کی مزید فوٹو کاپی کروائی۔ ایک اپنے پاس رکھی اور بقیہ فلسطینی اور اسرائیلی نمائندوں کو دی۔

فلسطین کے موجودہ مسئلہ کا آغاز برطانی گورنمنٹ کے بالفور ڈیکلریشن (۱۹۱۷) سے ہوتا ہے۔ یہ ڈیکلریشن سر بالفور (Arthur James Balfour) کی طرف منسوب ہے جو اس وقت برطانی گورنمنٹ میں فارن سکریٹری تھا۔ اس وقت برطانیہ کے سامنے ایک ہی نوعیت کے دو مسئلے تھے۔ ایک یہ کہ آئرلینڈ کے لوگ ہوم رول مانگ رہے تھے۔ دوسری طرف برطانیہ (اور دوسرے ملکوں کے یہودی) یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ فلسطین کو یہودیوں کا ہوم لینڈ بنا دیا جائے۔

بالفور نے آئرلینڈ کے قوم پرستوں کے لیے جو پالیسی بنائی وہ تھی ——— ہوم رول کو نرمی سے ختم کرنا (Killing home rule by kindness) مگر فلسطین کے لیے اس کی پالیسی یہ تھی کہ یہودی تنظیم کے مطالبہ کو پورا کرتے ہوئے فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ ۲ نومبر ۱۹۱۷ کو حکومت برطانیہ کی طرف سے بالفور ڈیکلریشن کی صورت میں اعلان کیا گیا کہ فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک نیشنل ہوم (قومی وطن) قائم کیا جائے گا۔

تاہم یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ برطانیہ کا یہ اقدام کسی اسلام دشمنی کی بنا پر تھا۔ یہ تمام تر اپنے سیاسی مفاد کے لیے کیا گیا۔ ۱۹۱۷ میں جب روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو چوں کہ اس کی قیادت میں زیادہ تر یہودی شامل تھے۔ برطانیہ کے سیاست دانوں نے یہ سمجھا کہ وہ یقیناً یہودی تحریک (Zionism) کی حمایت کرے گی۔ روس کو اپنے موافق بنانے کے لیے انھوں نے ضروری سمجھا کہ وہ یہودی مطالبہ کو مان لیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح انھیں عالمی سطح پر یہودیوں کی ہمدردی بھی حاصل ہو جائے گی۔ اس طرح کے اور بھی کئی اسباب تھے جس کی بنا پر برطانی سیاست دانوں نے یہ رائے قائم کی کہ یہودی مطالبہ کو مان لینا ان کے ایمپائر کے حق میں مفید ہوگا۔ اگرچہ یہ رائے سطحی تاثر کے تحت تھی نہ کہ کسی گہرے تدبر کے تحت۔

کچھ لوگوں نے یہ رائے دی ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کی شکل یہ ہے کہ یروشلم کو ایک کھلا شہر (Open City) قرار دے دیا جائے۔ یعنی یروشلم پر کسی بھی فریق کا کامل سیاسی اقتدار نہ ہو۔ بلکہ اقوام متحدہ کی ماتحتی میں اس کا انتظام چلایا جائے۔ اس انتظام کی حکمت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس طرح ہر مذہب کے لوگوں کو وہاں آزادانہ داخلہ (free access) کی اجازت مل جائے گی۔ خاص طور پر یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کو، جن کے مقدس مذہبی مقامات یروشلم میں واقع ہیں۔

یہ تجویز خواہ نظریاتی طور پر کتنی ہی خوب صورت ہو مگر عملاً وہ ممکن نہیں۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اصل مقصود مذہبی مقصد کے لیے آزادانہ داخلہ ہے اور وہ بالفعل ہر ایک کو یروشلم میں حاصل ہے۔ یہ آزادی اسرائیل کی کسی عنایت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ زمانی تبدیلی کی بنا پر ہے۔ موجودہ زمانہ میں مذہبی آزادی کا جو انقلاب آیا ہے اور جس کی ضمانت خود اقوام متحدہ نے دے رکھی ہے۔ اس نے ناقابل تنسیخ انداز میں اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ ہر شخص ہر جگہ جا سکے۔ شرط صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ وہ جہاں بھی جائے ہر جگہ وہ امن کی روش پر قائم رہے۔

۳۰ اگست کی شام کو سی این این (CNN) کے نمائندہ جیروڈ کیسل (Jerrold Kessel) اور ان کی ٹیم نے ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ابتداءً انھوں نے صرف پانچ منٹ کے انٹرویو کے لیے کہا تھا۔ مگر جب انٹرویو شروع ہوا تو وہ آدھ گھنٹہ تک مسلسل بات کرتے رہے۔ انھوں نے آخر میں کہا کہ آپ کا انٹرویو بہت دل چسپ رہا۔

تمام سوالات اسلام کے بارہ میں تھے۔ ان کے سوالات کسی قدر جارحانہ ہوتے تھے۔ مگر میں خدا کے فضل سے نہایت معتدل انداز میں ان کا جواب دیتا رہا۔ ایک سوال یہ تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اپنا رول ختم کر چکا ہے۔ میں نے کہا کہ میرا تو خیال یہ ہے کہ اسلام از سر نو اپنا رول ادا کرنے کے لیے ابھر رہا ہے۔ کچھ سال پہلے تک لوگ کمیونسٹ آئیڈیالوجی پر اعتماد کیے ہوئے تھے۔ مگر سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد اب ساری دنیا میں ایک قسم کا نظریاتی خلا (ideological vacuum) پیدا ہو گیا ہے۔ اس خلا کو صرف اسلام ہی پُر کر سکتا ہے۔

انھوں نے کہا کہ بظاہر تو اسلام اس خلا کو پُر کرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ میں نے کہا کہ مجھے تو اس کے برعکس یہ نظر آ رہا ہے کہ آج اسلام ساری دنیا کا مرکزِ توجہ بن گیا ہے۔ آپ کے ملک میں ہیوی ویٹ چیمپین (ٹائسن) نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ برطانیہ میں ایک بہت اونچے خاندان کی لڑکی (جمائما) اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئی ہے۔ فرانس میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص (گارودی) نے قبول اسلام کا اعلان کر دیا ہے، وغیرہ۔

کناڈا کی ٹی وی کمپنی (Villagers Communication) کے نمائندہ اسٹیو ڈیمی (Steve Dawn Deme) اور ان کی پارٹی نے ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ان کے سوالات زیادہ تر

مسلمانوں کی موجودہ حالت کے بارے میں تھے۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ آپ کو چاہیے کہ مسلمانوں کو اسلام کی روشنی میں دیکھیں نہ کہ مسلمانوں کی روشنی میں اسلام کو:

You have to judge Muslims by Islam and not vice versa.

تیسرا انٹرویو بی بی سی (ٹی وی) کی خاتون نمائندہ جانا بیرس (Jana Beris) کا تھا۔ مگر وقت کی کمی کے باعث وہ بہت مختصر رہا۔

مسلمانوں میں روایتی طور پر یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ یہودی بحیثیت قوم ہمیشہ کے لیے محتاج اور ذلیل کر دیے گئے ہیں۔ قتادہ نے کہا کہ تم کسی بھی ملک میں کسی یہودی سے ملو تو تم پاؤ گے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ ذلیل ہے (لا تلقی یهودیا فی بلد الا وقد وجدته من اذل الناس) تفسیر النسفی ۱/۲۹۲

موجودہ زمانہ میں معاملہ اس کے برعکس دکھائی دیتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں یہودی لوگوں کے درمیان کم از کم ظاہری طور پر باعزت جگہ پائے ہوئے ہیں اور مسلمان عملاً ہر جگہ بے قیمت ہو رہے ہیں۔ حتی کہ اقبال نے کہا:

یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

ممکن ہے کہ ضربت علیهم الذلة والمسکنة (البقرہ ۶۱) سے مراد یہودیوں کی وہ نسل ہو جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی معاصر تھی۔ اور مسلمان اس شعر کے مصداق ہوں:

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہو کر ہم ہوئے خوار و زبوں تارکِ قرآں ہو کر

اسحاق نافون (Yitzhak Navon) پہلا اسرائیلی صدر ہے جس نے ستمبر ۱۹۸۰ میں مصر کا دورہ کیا۔ اس کو قاہرہ کے قصر عابدین میں ٹھہرایا گیا تھا۔ اسرائیلی صدر نے قاہرہ کے استقبالیہ جلسہ میں فصیح عربی میں تقریر کی۔ اس میں اس نے مصریوں کو دعوت دی کہ وہ اسرائیل آئیں اور وہاں آزادانہ طور پر لوگوں سے ملیں —— اگر آپ ہم کو دوست سمجھیں تو دوست دوست سے ملتا ہے۔ اور اگر آپ ہم کو دشمن سمجھیں تو عربی مثل ہے کہ اپنے دشمن کو پہچانو:

اذا کنتم تعتبروننا اصدقاء فالصدیق یزور صدیقه و اذا کنتم تعتبروننا اعداء فالمثل العربی یقول: اعرف عدوك۔

مسلم اخباروں میں اکثر ایسی تصویریں چھپتی ہیں جن میں کچھ اسرائیلی سپاہی فلسطینی کو مارتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس تصویر کے اوپر یہ عنوان ہوتا ہے : اسرائیلی پولیس کی بربریت۔

لیکن اگر آپ دوسرے اخبارات کو دیکھیں تو یہی پولیس خود اسرائیلیوں کے خلاف ایسی ہی "بربریت" کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلی پولیس کی "بربریت" کسی فلسطینی پر محض فلسطینی ہونے کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ اس کے مخالفانہ رویہ کی بنا پر ہوتی ہے۔ جو فلسطینی صرف اپنے کام سے کام رکھنا چاہتے ہیں، وہ آج بھی اسرائیل میں پرامن طور پر رہ رہے ہیں۔ مگر جو فلسطینی سیاسی حریف بنتے ہیں یا تشدد کا فعل کرتے ہیں ان کے اوپر پولیس بھی کارروائی کرتی ہے۔ پولیس یہی کارروائی خود یہودیوں پر بھی اس وقت کرتی ہے جب کہ وہ سیاسی ہنگامہ کریں یا تشدد اور تخریب کاری کریں۔

موجودہ زمانہ میں مسلم صحافت نے ہر جگہ ایک مجرمانہ رول ادا کیا ہے۔ ہر سماج میں اور ہر زمانہ میں عُسر اور یُسر ساتھ ساتھ موجود رہتے ہیں۔ یعنی منفی واقعات بھی اور مثبت واقعات بھی۔ موجودہ زمانہ کے مسلم اخبارات نے یہ کیا کہ انھوں نے ہر جگہ صرف منفی پہلوؤں کی رپورٹنگ کی اور مثبت پہلوؤں کو سرے سے بیان ہی نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ کے مسلمان اپنے ملک اور اپنے سماج کے بارے میں منفی ذہنیت کا شکار ہو گئے۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ دنیا کی قومیں ان کی دشمن ہیں اور ان کے خلاف سازش کرنے میں مشغول ہیں۔ چنانچہ وہ تمام قوموں کے خلاف نفرت اور عداوت کی نفسیات میں مبتلا ہو گئے۔ اسی نفسیات کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر ملک میں، بشمول فلسطین مسلمانوں کے لیے بہترین مواقع موجود ہیں مگر وہ عین مواقع کے درمیان ان کو استعمال کرنے سے محروم ہیں۔

ایک مسلم دانشور جنھوں نے فلسطین کے مسئلہ پر کئی کتابیں لکھی ہیں، ان سے میں نے کہا کہ اسرائیلی حکومت لوگوں کو ویزا دینے میں بڑی فراخ دل ہے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے طنزیہ انداز میں جواب دیا : اس کا سبب تو واضح ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ زیادہ

سے زیادہ ان کے یہاں جائیں اور ان کی ترقیوں کو دیکھیں۔

اس کی ایک مثال ہندستان کے مشہور قانون داں مسٹر نانی پالکھی والا ہیں، انھوں نے اپنی اہلیہ کے ساتھ اسرائیل کا پانچ روزہ (۱۲-۱۶ جون ۱۹۹۴) دورہ کیا۔ اس سفر کے بعد مسٹر پالکھی والا نے ایک آرٹیکل لکھا جو نیوز فرام اسرائیل (News from Israel) کے شمارہ جولائی۔ اگست ۱۹۹۴ میں شائع ہوا ہے۔ یہ پرچہ بمبئی میں واقع اسرائیلی قونصل (Consulate of Israel) کی طرف سے شائع کیا جاتا ہے۔ مسٹر پالکھی والا کے مذکورہ آرٹیکل کے کچھ اقتباسات علاحدہ صفحہ پر یہاں نقل کیے جارہے ہیں۔

اس آرٹیکل کو پڑھنے کے بعد میں نے ایک صاحب سے کہا کہ جو مسلمان اس طرح کی باتوں پر غصہ ہوتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ مسلم ملکوں کو آمادہ کریں کہ وہ بھی اپنے یہاں ایسے واقعات رونما کریں جس کو لوگ آکر دیکھیں اور پھر واپس جاکر اس کی تعریف میں مضامین شائع کریں۔ جیسا کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تھا۔ اس وقت دنیا بھر کے لوگ بغداد اور قرطبہ اور غرناطہ کو دیکھنے کے لیے آتے تھے اور پھر واپس جاکر اپنے ہم وطنوں سے اس کا شاندار تذکرہ کرتے تھے۔

حدیث میں آیا ہے کہ خالفوا الیہود (یہود کے خلاف عمل کرو) اس کا مطلب اس سفر میں میری سمجھ میں آیا۔ یہاں "یہود" کا لفظ علامتی معنی میں ہے۔ یہ حدیث یہود کی گروہی مخالفت کے معنی میں نہیں ہے۔ وہ دراصل ظاہر پرستی والے دین کے خلاف ہے جو دورِ زوال میں یہود کے اندر بہت زیادہ آگئی تھی۔

حدیث میں ہے کہ یہود جوتا پہن کر نماز نہیں پڑھتے، اس لیے تم اس کے خلاف کرو۔ چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوتا پہن کر نماز پڑھی (مشکاۃ المصابیح ۱/۲۳۸) اسی طرح آپؐ نے افطار میں تعجیل کرنے کی ہدایت فرمائی اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ یہودی افطار میں تاخیر کرتے ہیں (لأن الیہود یؤخرون) سنن ابی داؤد ۲/۳۱۵

اس کی حکمت یہ ہے کہ یہود کے یہاں دین کی داخلی روح ختم ہوگئی تھی، البتہ وہ ظواہر کا خوب اہتمام کرتے تھے۔ مثلاً ان کا کہنا تھا کہ جوتا اتار کر عبادت کرنا افضل ہے اور جوتا پہن کر عبادت کرنا غیر افضل۔ اسی طرح یہودی اس کو متقیانہ احتیاط بتاتے تھے کہ روزہ افطار کرنے میں

دیر کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کی مخالفت کی بات دراصل اسی ظاہر پرستی کو توڑنے کے لیے فرمائی۔ آپ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ تم یہود کی طرح نہ ہو جاؤ جو ظواہر کے اہتمام کو دین سمجھتے ہیں۔ اس کے بجائے تم داخلی روح کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرو، کیونکہ وہی اصل مطلوب ہے۔

ابو عبیدہ بن الجراح کی قیادت میں شام فتح ہوا تھا۔ اس کے بعد ابو عبیدہ نے عمرو بن العاص کی سرداری میں ایک لشکر فلسطین بھیجا۔ یہاں اس وقت رومی (بازنطینی) سلطنت تھی۔ رومی لشکر کا سردار ارطبون تھا۔ مقابلہ میں رومی لشکر کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد وہ بیت المقدس (یروشلم) میں قلعہ بند ہو گیا۔ عمرو بن العاص نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ آخر کار وہ لوگ مجبور ہو گئے اور صلح کی پیش کش کی۔ البتہ یہ شرط رکھی کہ خلیفہ خود مدینہ سے یروشلم آئے۔

حضرت عمر فاروق مدینہ سے روانہ ہو کر جابیہ پہنچے۔ پھر وہاں سے یروشلم گئے۔ جزیہ کی ادائیگی پر مصالحت ہوئی، اس معاہدہ کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں آئی ہے۔ اس کی دفعات میں سے ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ان کے عبادت خانے ڈھائے نہیں جائیں گے اور نہ ان میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ان کے دین کے معاملہ میں ان پر کوئی جبر کیا جائے گا (لا تهدم كنائسهم ولا ينتقص منها ولا يكرهون على دينهم)

حضرت عمر فاروق یروشلم کے کنیسۃ القیامہ میں داخل ہوئے۔ عصر کی نماز کا وقت آگیا تو آپ نے نماز پڑھنا چاہا۔ پادری نے کہا کہ یہیں پڑھ لیجئے۔ مگر حضرت عمرؓ نے اندر نماز نہیں پڑھی۔ بلکہ باہر نکل کر چبوترہ پر اکیلے نماز پڑھی۔ یہ دیکھ کر پادری نے کہا کہ اگر آپ چرچ کے اندر نماز پڑھ لیتے تو مسلمان اس کو نظیر بنا لیتے اور کہتے کہ یہاں خلیفہ عمرؓ نے نماز پڑھی ہے۔

جنرل وایزمان اسرائیل کی کیبنٹ کا ایک منسٹر تھا۔ وہ مصر سے دوستی کی باتیں کرتا تھا۔ ایک صاحب نے اس کا قول عربی میں اس طرح نقل کیا کہ اعتماد باہمی مفاہمت کی کنجی ہے اور وہ تمام مشکلات کے حل کا راستہ ہے (الثقة هي مفتاح التفاهم والوصول الى حلول للمشاكل)

یہودیوں کا ایک گروہ اس کی "مصر دوستی" کی بنا پر اس سے ناراض تھا۔ ان لوگوں نے وایزمان کا لقب مسٹر ایجپٹ (Mr. Egypt) رکھ دیا تھا۔ اب اس کا تقابل مسلمان، خاص طور

پر برصغیر کے مسلمانوں سے کیجیے۔ سرسید نے انگریزوں سے مفاہمت کی بات کی تو یہاں کے مسلمانوں نے ان کو مسٹر انگلینڈ نہیں کہا، بلکہ ان کو انگریزوں کا نمک خوار اور دشمنوں کا ایجنٹ کہا۔ اسی طرح مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوؤں سے مفاہمت کی بات کی تو ان کو بھی مسٹر انڈیا کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انھیں ہندوؤں کا ایجنٹ اور ملت فروش بتایا گیا، وغیرہ۔

یہ بھی شاید ایک پہلو ہے اس حدیث کا جس میں آپؐ نے یہ خبر دی کہ —— یہود بہتّر فرقوں میں بٹ گئے، اور تم ان سے بھی زیادہ فرقوں میں بٹ جاؤ گے۔

میری سمجھ میں آیا کہ ہر جگہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جو تباہ کن جھگڑے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف باہر والوں کی شرکت سے پیدا ہوتے ہیں۔ جھگڑا پیدا ہونے کے بعد اگر معاملہ صرف مقامی لوگوں تک محدود رہے تو دونوں فریق فطرت کی رہنمائی میں کام کرتے ہیں اور مل جل کر مسئلہ کو حل کر لیتے ہیں۔ مگر جب جھگڑا باہر کے "لیڈروں" کے ہاتھ میں چلا جائے تو بات بگڑ جاتی ہے۔ اور معمولی نزاع ناقابل حل مسئلہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

فلسطین کے مقامی مسئلہ کو سب سے پہلے اخوانیوں نے عالمی مسئلہ بنایا۔ ۱۹۴۸ میں شیخ حسن البنا نے جذباتی نعرے، تقریریں کر کے قاہرہ میں ایک لاکھ مصریوں کو جمع کیا اور قاہرہ کی سڑکوں پر لبیک یا فلسطین لگاتے ہوئے جلوس نکالا۔ یہ بیرونی دخل اندازی بڑھتی رہی۔ مگر اس کے نتیجہ میں عملاً جو ہوا وہ صرف یہ کہ ذلت اور ناکامی میں ناقابلِ تلافی حد تک اضافہ ہو گیا۔

ترکی خلافت کے لیے ہندستان میں دھواں دھار تحریک چلانا، پاکستان کے لیے ان علاقوں میں ہنگامہ کھڑا کرنا جہاں پاکستان بننے والا نہ تھا۔ بابری مسجد کو اجودھیا کے دائرہ سے نکال کر سارے انڈیا بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا مسئلہ بنانا۔ بوسنیا کے سوال کو مقامی مسلمانوں اور مقامی عیسائیوں سے بڑھا کر سارے عالم کے مسلمانوں کا سوال بنا دینا۔ یہ قیادت نہیں ہے بلکہ صرف نادانی ہے۔ اور اس نادانی نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

یروشلم میں ایک اسلامک آرٹ میوزیم ہے۔ اس میں ساتویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی تک کے "اسلامک آرٹ" رکھے ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ اسلامی علوم کی ایک لائبریری بھی ہے جس میں قیمتی کتابیں جمع کی گئی ہیں۔

اس میں ایک قیمتی تصویر ہے۔ اس تصویر میں مغل حکمراں شاہ جہاں کو اپنے تخت پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ کو اوپر اٹھا کر خدا سے دعا کر رہا ہے تصویر زبان حال سے کہہ رہی ہے —— میں اگرچہ بادشاہ ہوں۔ مگر خدا کے آگے میں بھی عام انسانوں کی طرح ایک محتاج انسان ہوں۔

اسی طرح اس میں کلیلہ و دمنہ کا ایک فارسی نسخہ ہے۔ اس میں کلیلہ و دمنہ کے واقعات کو رنگین تصویروں کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ وغیرہ۔

کویت کے عربی ہفت روزہ المجتمع (۴ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ، یکم اگست ۱۹۹۵) میں المحامی خالد سیف (کردستان، العراق) کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے قبۃ الصخرۃ اور المسجد الاقصیٰ کی تصویریں چھاپی ہیں۔ اور لکھا ہے کہ دونوں واضح طور پر الگ الگ عمارتیں ہیں۔ مگر ۸۰٪ فی صد مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں ایک ہیں اور جو قبۃ الصخرہ ہے وہی مسجد اقصیٰ ہے

(ان ۸۰٪ من المسلمین یعتقدون بان مسجد قبۃ الصخرۃ ھو المسجد الاقصیٰ)

عجیب بات یہ ہے کہ خود مذکورہ مضمون نگار نے بھی قبۃ الصخرہ کو "مسجد قبۃ الصخرۃ" لکھا ہے، حالاں کہ وہ سرے سے مسجد ہے ہی نہیں۔

انھوں نے لکھا ہے کہ جب بھی مسجد اقصیٰ یا فلسطین کا ذکر ہوتا ہے تو ذہن فوراً سنہری رنگ کے قبۃ الصخرہ کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم دنیا کے ذرائع اعلام جب بھی فلسطین کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمیشہ وہ قبۃ الصخرہ کی تصویر دکھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ خود فلسطینی بھی اپنے جلسوں میں جو لوح لگاتے ہیں اس پر بھی قبۃ الصخرہ (بیت المقدس) کی تصویر بنی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں فلسطین کے موضوع پر ایسی کتابیں چھپی ہیں جن کے ٹائٹل پر قبۃ الصخرہ (بیت المقدس) کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اور اس کے نیچے لکھا ہوا ہے: وا اقصاہ۔

مضمون نگار نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ایسا یہودی سازش کے تحت ہو رہا

ہے۔ عربی کا مثل ہے کہ آنکھ سے دور تو دل سے بھی دور (البعید عن العین بعید عن القلب) یہودی یہ چاہتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ کو مسلمانوں کی آنکھ سے دور کر دیں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ان کے دل سے بھی دور ہو جائے گی۔ اور یہی یہودی جب اس کو ڈھائیں گے تو مسلمانوں کو خبر بھی نہیں ہوگی کہ مسجد اقصیٰ ڈھا دی گئی ہے۔

اس قسم کی باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ یہ ۸۰ فی صد کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ مضمون نگار سمیت تمام ہی مسلمان اس مسئلہ کی حقیقی نوعیت سے بے خبر ہیں۔

یروشلم میں یہودیوں کی سب سے زیادہ مقدس چیز دیوار گریہ ہے، اور مسلمانوں کی سب سے زیادہ مقدس چیز مسجد اقصیٰ۔ عجیب بات ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل متصل ہیں۔ ذیل کی تصویر مسجد اقصیٰ کا خارجی منظر پیش کرتی ہے۔ اوپر کے حصہ میں مسجد کا گنبد اور اس کی بلند دیوار ہے۔ اور نیچے اس سے بالکل ملی ہوئی دیوار گریہ ہے جس کا ایک جزو تصویر میں دکھائی دے رہا ہے۔

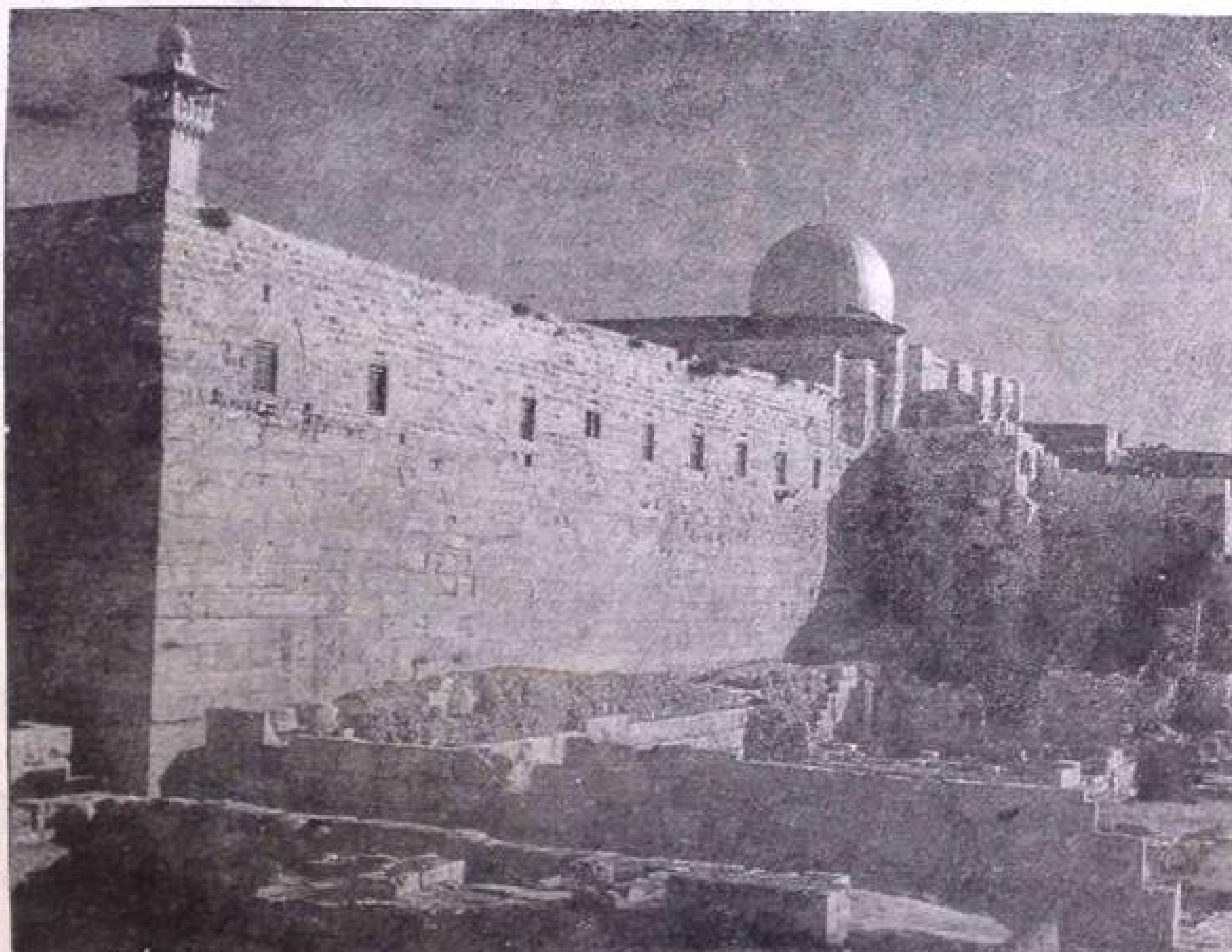

دیوار گریہ (Wailing Wall) کا دوسرا نام مغربی دیوار (Western Wall) ہے۔ رومیوں نے اس کو ۷۰ ء میں تباہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس کی صرف ایک دیوار کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا جو ابھی تک موجود ہے۔ اس سے ملی ہوئی اور اس کے اوپر وہ اونچی فصیل تعمیر کی گئی ہے جو مسجد اقصیٰ کا احاطہ کیے ہوئے ہے:

The wall now forms part of a larger wall that surrounds the Muslim Dome of the Rock and Al-Aqsa mosque. (EB/X/627)

اس دیوار کی لمبائی ۵۰ میٹر ہے اور وہ ۲۰ میٹر اونچی ہے۔ یہود کا عقیدہ ہے کہ خدا کی رحمت کبھی بھی مغربی دیوار سے جدا نہیں ہوتی۔ یہود بڑی تعداد میں یہاں دعا مانگنے کے لیے آتے ہیں۔

مصری لطیفہ بنانے میں بہت مشہور ہیں۔ انھوں نے ایک لطیفہ بنایا کہ امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر جب یروشلم گئے تو اس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم مناہن بیجن ان کو لے کر دیوارِ گریہ کے پاس گئے۔ یہودیوں کی نظر میں یہ ان کی سب سے زیادہ مقدس جگہ ہے۔ وہاں پہنچ کر جمی کارٹر نے دعا کی۔ انھوں نے اپنی دعا میں کہا کہ اے خدا! عربوں کو اور اسرائیل کو امن تک پہنچنے میں مدد دے۔ بیجن جو پاس ہی کھڑے تھے، انھوں نے فوراً کہا آمین۔ اس کے بعد جمی کارٹر نے کہا کہ خدایا! مصر کو اور اسرائیل کو پر امن طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی توفیق دے۔ بیجن نے کہا آمین۔ اس کے بعد جمی کارٹر نے کہا کہ خدایا! اسرائیلیوں کو بتا دے کہ وہ عربوں کو وہ تمام علاقے واپس کر دیں جن پر انھوں نے ۱۹۶۷ کی جنگ میں قبضہ کیا ہے۔ یہ سنتے ہی بیجن کا لہجہ بدل گیا۔ انھوں نے کہا کہ جنابِ صدر، میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ ایک دیوار سے بات کر رہے ہیں۔

یہ لطیفہ خود عربوں کا مرثیہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ۱۹۶۷ تک جو علاقے انھیں حاصل تھے، ان کو انھوں نے کیوں کر کھو دیا۔ یہ صرف اپنی پر جوش حماقت سے۔ مصر کی عرب قیادت نے اولاً سوئز کو قبل از وقت قومی ملکیت میں لینے کا احمقانہ اقدام کر کے سارے یورپ کو اپنا مخالف بنا لیا۔ اس کے بعد صحرائے سینا سے اقوام متحدہ کے مشاہدین کو واپس کر کے اسرائیل کے لیے اقدام کے دروازے کھول دیے۔ اس طرح کی کچھ اور نادانیوں نے اسرائیل کو موقع

دیاکہ وہ یورپ کی مدد سے مصر پر حملہ کرے اور اس کی فوجی طاقت کو توڑ دے۔

اگر نااہل عرب قیادت احمقانہ غلطی نہ کرتی تو یہ علاقے تو اسے از خود حاصل تھے۔

مسلمان عام طور پر قدس کے مسئلہ کو قبلۂ اول کی بازیابی کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ مگر یہ بات کسی اعتبار سے بھی درست نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ۱۳ سال تک کعبہ کی طرف رخ کرکے عبادت کرتے رہے۔ اس لیے "قبلۂ اول" کا لفظ اگر کسی کے لیے بولا جاسکتا ہے تو وہ خود کعبہ ہے۔ ہجرت کے بعد تقریباً ۱۸ مہینہ تک آپ نے بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھی۔ اس کے بعد تحویل قبلہ کا حکم آیا اور ہمیشہ کے لیے کعبہ مسلمانوں کا قبلۂ عبادت بن گیا۔ اس تاریخ کے مطابق، بیت المقدس قبلۂ درمیانی ہے نہ کہ قبلۂ اول۔

دوسری اہم تر بات یہ ہے کہ قدس میں جو اصل اسلامی سبق ہے، وہ قومی یا سیاسی یا جغرافی نوعیت کا نہیں ہے۔ وہ ان جھگڑوں سے مکمل طور پر الگ ایک اور سبق ہے۔ اور وہ مدعو کی تالیفِ قلب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد بیت المقدس کو قبلہ کیوں بنایا۔ اس کی وجہ مسلّمہ طور پر یہود کی تالیف قلب تھی جو رسول اللہ ؐ کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مدینہ پہنچے تو آپ کے لیے دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ سابق کی طرح کعبہ کو قبلہ بنائیں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ مدینہ کے یہود کی پیروی کریں جو بیت المقدس کی طرف رخ کرکے عبادت کرتے تھے۔ آپؐ نے قدس کا انتخاب فرمایا، اس طمع میں کہ یہود آپ کی طرف مائل ہوں گے اور ایمان لائیں گے (فاختار القدس طمعاً فی ایمان الیهود واستمالتهم) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، ۲/۱۵۰

گویا قدس کا اصل سبق یہ ہے کہ مدعو کی رعایت یہاں تک کرو کہ ان کے قبلہ کو اپنا قبلہ بنالو۔ آج اگرچہ ہمیں قبلہ بدلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم بہت سے دوسرے معاملات ہیں جن میں مدعو قوموں کی رعایت کرکے انھیں اسلام کے قریب لایا جاسکتا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان اس سنّت رسول ؐ سے مکمل طور پر بے خبر ہیں، خواہ وہ فلسطین کے مسلمان ہوں یا دوسرے ملکوں کے مسلمان۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان غیر مسلم قوموں سے ہر جگہ رقابت قائم کیے

ہوئے ہیں۔ یہ قدس اسپرٹ کے سراسر خلاف ہے۔

ایک یہودی عالم جو اچھی عربی جانتا تھا۔ اس نے کہا کہ قدس کو ہم اپنا حق اس لیے کہتے ہیں کہ ہماری کتابوں ہی میں نہیں بلکہ خود آپ کی مقدس کتاب قرآن میں بھی اس کو ہمارا حق بتایا گیا ہے۔ جب کہ قرآن میں کہیں نہیں لکھا ہے کہ قدس مسلمانوں کو دے دیا گیا۔

اس نے کہا کہ آپ لوگ قدس کو قبلۂ اول کہتے ہیں مگر وہ قبلۂ اول کہاں ہے وہ تو قبلۂ عارضی تھا۔ آپ کے پیغمبر پہلے کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ پھر وقتی طور پر کچھ دنوں بیت المقدس کو قبلہ بنایا اور اس کے بعد پھر کعبہ کو قبلہ بنا لیا۔ آپ کے عقیدہ کے مطابق، آپ کے پیغمبر نے یروشلم آکر یہاں نماز پڑھی۔ اس وقت یہاں غیر مسلموں کی سیاسی حکومت قائم تھی۔ آپ بھی ہماری سیاسی حکمرانی کے تحت یہاں آکر نماز پڑھئے۔ ہم آپ کو نہیں روکتے۔

میں نے جواب دیا کہ اس مسئلہ پر مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان سنجیدہ انداز میں ڈائیلاگ ہونا چاہیے۔

پاکستان میں اگر آپ جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں ہر چیز کو اسلامائز کر لیا گیا ہے۔ حتی کہ ایک فلم کمپنی اپنی کسی فلم کو ریلیز کرنے والی ہو گی تو اس کا اشتہار ان الفاظ میں شائع کیا جائے گا —— "ان شاء اللہ، اگلے جمعہ کو ہماری نئی فلم ریلیز کی جائے گی"۔

یہی معاملہ اسرائیل کا ہے۔ وہاں ہر چیز کو یہودی رنگ میں رنگ دیا گیا ہے۔ مثلاً یروشلم کی ایک جدید کالونی کا نام قریۂ داؤد (David's Village) ہے۔ ایک اور کالونی کا اشتہار میں نے دیکھا۔ اس کے اوپر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا کہ ارض موعود میں آپ کا اپارٹمنٹ :

Your own apartment in the promised land

ایک اخبار میں ایک اسرائیلی کمپنی کا اشتہار دیکھا۔ جس کا کام تل ابیب میں نجی جائدادوں کا انتظام (property management) کرنا ہے۔ اشتہار میں گھر کی دیکھ بھال اور اس کے انتظام کے سلسلہ میں جن باتوں کا ذکر تھا، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ —— اور ہم حفاظت کا انتظام کرتے ہیں :

We arrange security

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسرائیل میں کس طرح عام لوگ غیر محفوظ حالت میں زندگی گزارتے ہیں۔

یہودی جانتے ہیں کہ وہ صرف اسرائیل (فلسطین) کے اوپر زندہ نہیں رہ سکتے۔ انھیں ساری دنیا سے اپنی زندگی کی خوراک حاصل کرنا ہے۔ ایک یہودی تاجر نے کہا --- عالمی تجارت ہمارا مستقبل ہے :

Global business is our future.

قدیم زمانہ میں کوئی ملک زیادہ تر اپنے مقامی ذرائع پر انحصار کرتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں جدید کمیونی کیشن کے ظہور میں آنے کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ آج یہ ممکن ہوگیا ہے کہ آپ ایک چھوٹے سے خطۂ زمین پر بیٹھ کر ساری دنیا میں اپنے کاروبار کو پھیلائیں، اور ساری دنیا سے اپنے لیے رزق کا سامان حاصل کریں۔

ادارے چلانے کا روایتی طریقہ یہ ہے کہ اس کے ممبران کی ایک جگہ میٹنگ ہو۔ اس میں تبادلۂ خیال کے بعد زیر بحث مسئلہ میں کوئی بات طے کی جائے اور پھر اس پر عمل درآمد کیا جائے۔ اب یہ طریقہ دیر طلب قرار پا چکا ہے۔

یہودیوں نے موجودہ زمانہ میں ایسے عالمی ادارے قائم کیے ہیں جس کے ممبر صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو نہایت باشعور ہوں۔ یہ لوگ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں مگر دوری کے باوجود ان کے اجتماعی فیصلہ میں ایک یا دو دن سے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ یہ معجزہ جدید کمیونی کیشن کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔

مثلاً عالمی پریس میں ایک چیز چھپتی ہے جو یہودی مفاد سے ٹکراتی ہے۔ اب یہ ادارہ یہ کرتا ہے کہ فوراً بذریعہ فیکس اس کی نقل تمام ممبروں کے نام ساری دنیا میں بھیج دیتا ہے۔ یہ لوگ اپنے تبصرے دوبارہ فوری طور پر بذریعہ فیکس ادارے کو بھیج دیتے ہیں۔ اب یہ تمام کاغذات ایک اکسپرٹ شخص کو پہنچا دیے جاتے ہیں۔ وہ ان کا مطالعہ کرکے فوری طور پر اپنا تحریری ردعمل ادارہ کو دے دیتا ہے۔ ادارہ اس تحریر کو دوبارہ تمام ممبران کے نام فیکس کر دیتا ہے۔ چند گھنٹوں میں تمام ممبران کی رائیں دوبارہ بذریعہ فیکس ادارہ کے صدر دفتر میں وصول ہو جاتی ہیں۔ ان کو

سامنے رکھ کر مذکورہ اکسپرٹ اپنی تحریر کو دوبارہ تیار کرتا ہے۔ وہ فوراً ہی عالمی پریس کے نام روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح صرف ایک یا دو دن میں یہودی نقطۂ نظر عالمی پریس میں آجاتا ہے۔

میری تمنا ہے کہ میں بھی دعوتی مقصد کے تحت اس قسم کا ایک انٹرنیشنل ادارہ قائم کروں۔ یہ ادارہ جدید کمیونی کیشن کو استعمال کرکے اِن شاء اللہ عالمی اسٹیج پر دعوت کی منصوبہ بندی کرے گا اور اس سلسلہ کے ضروری کام انجام دے گا۔ اور یہ سب کچھ رسمی میٹنگ کے بجائے ٹیلی فون، فیکس، انٹرنٹ کے ذریعہ انجام پائے گا۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

یروشلم میں مخصوص انداز کی ایک یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ اس کا انگریزی نام (Homage to Jerusalem) ہے۔ اس کو تین مذہبوں کا یروشلم کہا جاتا ہے:

Jerusalem: The Three Religions

اس میں تینوں سامی مذہب کے علامتی تقدس بنائے گئے ہیں۔ ان کو بتاتے ہوئے ایک یہودی نے کہا:

It represents elements that Judaism, Islam and Christianity have in common.

ایک صاحب سے مہدی سوڈانی کا تذکرہ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ مہدی سوڈانی نے اگرچہ عوام کی بھیڑ اپنے گرد اکٹھا کر لی تھی۔ مگر وہ کوئی معتدل آدمی نہیں تھے۔ انھوں نے بتایا کہ مصر کے حکمراں محمد علی پاشا نے ۱۸۳۵ میں سوڈان پر حملہ کیا تھا۔ مہدی سوڈانی کو اس کی خبر ملی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ دریائے نیل کے راستہ سے سوڈان پہنچنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مریدوں کی مجلس میں کہا کہ وہ دریائی راستہ سے سوڈان پہنچنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ خدا کی قسم، میں دریا کا سارا پانی پی کر اس کو خشک کر دوں گا (تاللہ اشرب البحر۔۔۔)

فلسطین (اسرائیل) کا ایک شہر حیفہ ہے۔ یہاں پانچ مذہب کے لوگ رہتے ہیں اور ہر ایک کی عبادت گاہیں اور مذہبی ادارے وہاں موجود ہیں ——— یہودی، مسلمان، عیسائی، دروزی اور بہائی۔ عرب مسلمانوں کی تعداد ۱۰ فی صد سے کچھ اوپر ہے۔ ایک یہودی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آپ دیکھئے، یہ سب لوگ کس طرح رواداری کے ساتھ یہاں رہ رہے ہیں:

...they share a unique spirit of tolerance.

بہائی فرقہ دنیا میں پانچ ملین ہے۔ حیفہ میں ماونٹ کارمل کے اوپر اس کا مرکز ہے جس کا سنہرا گنبد دور سے دکھائی دیتا ہے۔ بہائی مذہب ایران میں ۱۸۴۴ میں وضع کیا گیا۔ اس کے بانی کا نام باب اللہ تھا۔ حکومت ایران سے ان کا اختلاف ہوا۔ حکومت نے ان کے ۲۰ ہزار آدمیوں کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد اس مذہب کو ماننے والے دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیل گئے۔ اسرائیل کے قیام کے بعد ۱۹۴۸ میں انھوں نے یہاں اپنا مرکزی دفتر قائم کیا۔ ۱۹۵۲ میں موجودہ عمارت بن کر مکمل ہوئی۔ ایک بہائی نے کہا:

Our relations with the Israelis are proper and friendly.

اسرائیل میں بہائیوں کی تعداد ایک سو سے کچھ زیادہ ہے۔ تاہم ان کے افراد بڑی تعداد میں یہاں "زیارت" کے لیے آتے رہتے ہیں۔ بہائی اپنے مذہب کو یونیورسل مذہب کہتے ہیں۔ ان کے یہاں شادی بیاہ پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ وحدتِ ادیان کی وکالت کرتے ہیں۔ ایک بہائی نے کہا:

It doesn't matter what you believe, the scientific fact is that we are all brothers inhabiting the same world. We believe that all religions have validity and we accept them.

اسرائیل کے زمانۂ قیام میں کئی بار میں نے دیکھا کہ یہودی کس طرح یہاں ایک شاندار زندگی گزار رہے ہیں۔ "کیا یہ وہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے" میں نے سوچا۔ میری سمجھ میں آیا کہ لعنت کا کوئی لازمی تعلق خوش حالی یا بدحالی سے نہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ کوئی فرد یا قوم خدا کے نزدیک لعنت زدہ ہو مگر موجودہ دنیا میں وقتی طور پر وہ شاندار قسم کی مادی زندگی حاصل کر لے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ملعون ہونے کا مطلب رحمتِ الٰہی سے محروم ہونا ہے۔ جن فرد یا گروہ پر خدا کی لعنت ہو وہ بے حسی کا شکار ہو جائے گا۔ خدا کی نظر میں اس کا ہر عمل بے قیمت ہو جائے گا، خواہ بظاہر وہ کوئی درست عمل کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔

یہودی نفسیات فخر کی نفسیات ہے۔ ان کی ہر بات میں فخر کا احساس جھلکتا ہے۔

یہودی میوزیم (Diaspora) کے ناظم نے اپنے ادارہ کا تعارف کرتے ہوئے پر فخر طور پر کہا کہ دلائی لاما تک اسرائیل آئے تا کہ یہ دیکھیں کہ یہودیوں نے وہ کون سا طریقہ نکالا جس کے ذریعہ وہ اتنی لمبی مدت تک اپنی قومی شناخت کو برقرار رکھ سکیں:

Even the Dalai Lama visited Israel to see what technique the Jews developed to survive and maintain their identity.

میں خود اریحا (Jericho) نہ جا سکا۔ ایک کرسچین سیاح جو اریحا (مسلم علاقہ) میں گیا تھا۔ اس نے کہا کہ میں سمجھتا تھا کہ سرحد پر زبردست پہرہ ہوگا۔ لیکن مجھے تعجب ہوا جب میں نے دیکھا کہ وہاں ایک گارڈ ہے جس کو ہماری جانچ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے شلوم کہہ کر ہمارا استقبال کیا:

Expecting the border to be heavily guarded, I was surprised to see a disinterested guard, who upon seeing us welcomed us with a shalom.

فلسطین کا ایک حصہ صحرا ہے۔ یہ صحرا ہزاروں سال سے یوں ہی پڑا ہوا تھا موجودہ زمانہ میں یہ معلوم ہوا کہ پانی سے محرومی کسی زمین کو ریگستان بناتی ہے۔ اگر پانی فراہم کیا جا سکے تو ریگستان کو سرسبز علاقہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یہودی نے اس نئی دریافت سے فائدہ اٹھایا اور فلسطین کے صحرائی علاقہ کے بڑے حصہ کو کھیت اور باغ میں تبدیل کر دیا۔ ایک اسرائیلی نے اپنے مضمون میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فخر کے ساتھ لکھا تھا کہ ہم نے ڈرپ آبپاشی کے طریقہ کو ترقی دے کر ریگستان کو سرسبز و شاداب بنا دیا:

That a country can be transformed from barren desert to a lush wonderland, can be attributed to the miracle of drip irrigation.

ایک سیاح جس نے فلسطین کے صحرائی علاقہ کو دیکھا تھا۔ اس نے کہا کہ ہم یہاں آئے تھے کہ صحرا کو دیکھیں گے مگر یہاں ہمیں سبزہ دیکھنے کو ملا:

We had come here to see desert, but, instead, we found greenery.

یہاں ایک ہوٹل الحمرا ریستوراں (Alhambra Restaurant) کے نام سے ہے۔ وہ جافا

اور تل ابیب اور یروشلم میں قائم ہے۔ میں اس نام کا سبب معلوم نہ کر سکا۔ تاہم اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فلسطین (اسرائیل) پر مسلم تہذیب کا اثر کتنا زیادہ ہے۔

اسرائیل اور اردن کے درمیان ایک انوکھی جھیل ہے جس کو البحر المیت (Dead Sea) کہتے ہیں۔ وہ سطح سمندر سے ۴۰۱ میٹر نشیب میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۴۰۵ مربع میل ہے۔ اس کے پانی میں نمک اور معدنیات کی آمیزش عام سمندروں سے چار گنا زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ آدمی اس کے اندر داخل ہو تو وہ غرق نہیں ہوتا۔ رومی حکمراں وسپاسین (Vespasian) ۶۸-۶۷ء میں فاتحانہ طور پر فلسطین میں داخل ہوا۔ اس کو بتایا گیا کہ بحر مردار کا پانی اتنا گاڑھا ہے کہ اس میں داخل ہونے والا آدمی اوپر ہی اوپر تیرتا رہتا ہے، اس نے تجربہ کے لیے کچھ یہودی قیدیوں کو اس کے اندر پھنکوا دیا :

When the Roman Emperor Vespasian heard of this, he had some Jewish prisoners thrown into the water to see if they could float.

جغرافیہ کے علما، بحر مردار جیسی انوکھی جھیل (سمندر) کو سطح زمین کی قدیم تبدیلیوں کے عہد (holocene epoch) کی ایک یادگار سمجھتے ہیں۔ مگر وہ یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ تبدیلیوں کے اس دور میں، جو کہ پچھلے دس ہزار سال کی ارضی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے، اس میں صرف بحر مردار ہی استثنائی طور پر ایسی وسیع جھیل کی صورت میں کیوں تبدیل ہو گیا۔ جب کہ اس کا بھی ثبوت ملا ہے کہ ایک عرصہ پہلے تک وہ عام جھیل کی مانند تھا۔

اصل یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں یہاں قوم لوط آباد تھی۔ اس کے اندر برائیاں پیدا ہوئیں تو حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام ان کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے۔ مگر قوم سرکش ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ دو ہزار سال قبل مسیح میں ایک شدید زلزلہ آیا۔ زمین کے اندرونی آتش گیر اجزا بھڑک کر جل اٹھے۔ پورا علاقہ تباہ ہو کر رہ گیا۔

ہندستان ٹائمس (۱۸ ستمبر) کے درمیانی صفحہ پر مسٹر این سی منن (مقیم واشنگٹن) کا مضمون فلسطین کے مسئلہ پر تھا۔ اس کا عنوان تھا ــــــ اور امن کا وقت :

And a time of peace

مضمون نگار ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ کو واشنگٹن (وہائٹ ہاؤس) کی اس تقریب میں موجود تھے جہاں فلسطینی لیڈر یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیر اعظم یتزک رابن کے درمیان ایک دوسرے کو تسلیم کرنے کا معاہدہ ہوا۔ مضمون نگار نے اس معاہدہ امن کو بے نظیر مفاہمت (unprecedented accommodation) سے تعبیر کیا ہے۔

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ اس قسم کا نسبتاً کم اہم معاہدہ ۱۹۷۹ میں سابق مصری صدر انور السادات اور سابق اسرائیلی وزیر اعظم مناہم بیجن کے درمیان ہوا تھا۔ اس وقت یاسر عرفات نے انور سادات کو غدّار (traitor) بتایا تھا اور کہا تھا کہ وہ اس قابل ہیں کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ مگر آج خود یاسر عرفات، سادات کی اسی سنّت پر زیادہ بڑے پیمانہ پر عمل کر رہے ہیں۔

یاسر عرفات اب اگر امن کی پالیسی کو ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے لیے اپنی اس رائے پر عمل کرنا کوئی غلط بات نہیں۔ مگر ایسی صورت میں انھیں یہ اعلان بھی کرنا چاہیے کہ اس سے پہلے انھوں نے فلسطین کے بارہ میں جو پالیسی اختیار کی وہ درست نہ تھی۔ اور انور السادات کو برا بتانا بھی ایک سنگین غلطی تھی۔ غلطی کا اعتراف نہ کرنا ان کے لیے خود سب سے بڑی غلطی ہوگی۔

ابن عساکر (۶۰۰ - ۵۲۷ ھ) مشہور محدث اور مورخ ہیں۔ انھوں نے مسجد اقصیٰ کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کا نام ہے: الجامع المستقصی فی فضائل المسجد الاقصیٰ۔ یہ غالباً اس موضوع پر سب سے زیادہ جامع کتاب ہے۔

قبطی چرچ کے پوپ نے ۴ جولائی ۱۹۹۵ کو ایک بیان میں کہا کہ یہودی اب شعب مختار (Chosen people) کی حیثیت نہیں رکھتے۔ مسیحیت کے ظہور کے بعد اب ان کی یہ حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ میں نے ایک عیسائی اسکالر سے کہا کہ یہ بات جزئی طور پر صحیح ہے۔ کیونکہ پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کے بعد خود مسیحیت کی حیثیت بھی ختم ہو چکی۔ اور اب خدا کا مختار گروہ وہ ہے جو دینِ محمدیؐ کو اختیار کرے۔ اس نے توجہ کے ساتھ میری بات سنی اور پھر کہا: مگر کیا محمد عربیؐ ایک عالمی پیغمبر تھے۔

ایک صاحب سے جہاد (بمعنی قتال) کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کا کہنا ہے کہ اسلام میں جہاد صرف دفاع کے لیے ہوتا ہے۔ مگر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

Through History

1967

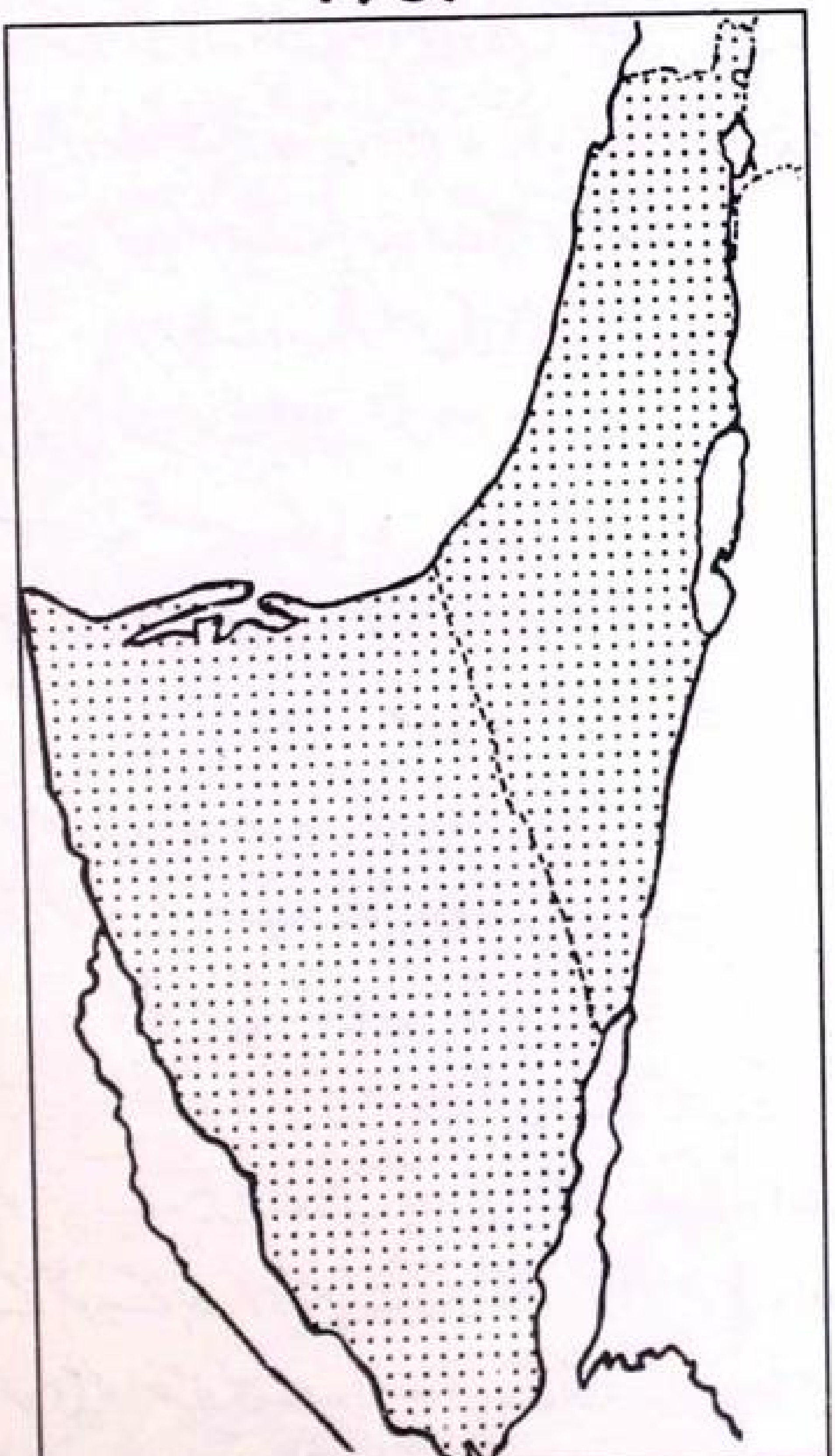

Map showing the territories occupied by Israel during the war of 1967. The occupied territories of Sinai (Egypt) were evacuated in 1982.

1994

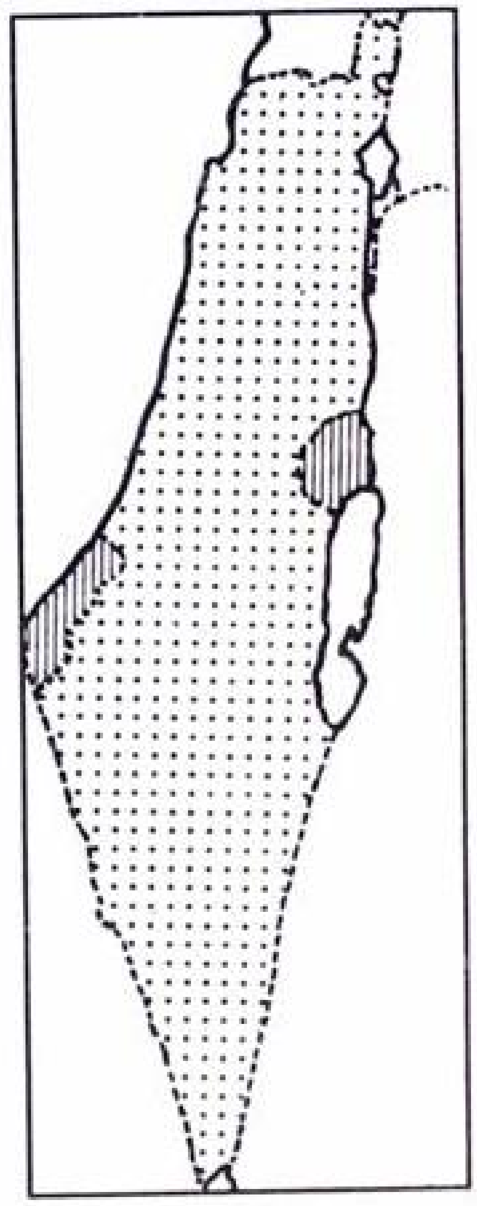

Map of Palestine after the Oslo Accord, showing the present Palestinian Authority

Palestine
Recent

1936

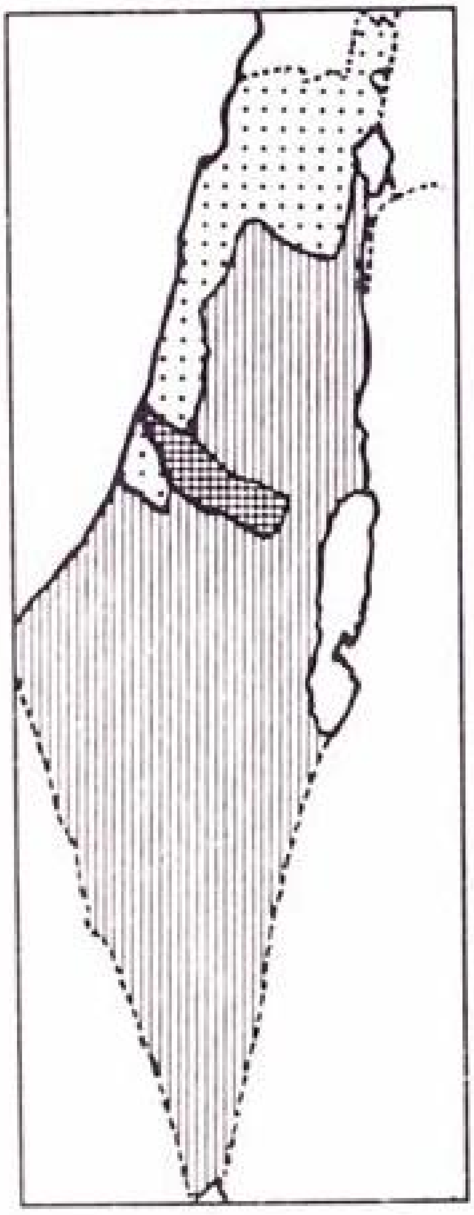

Map of Partition of Palestine recommended by the Royal (Peel) Commission

1947

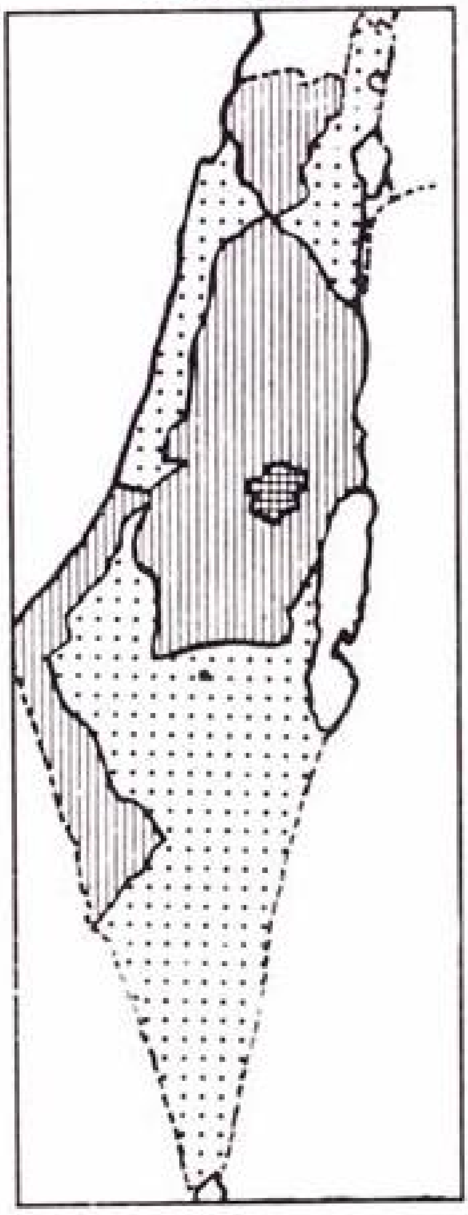

Map of Partition plan under United Nations Resolution 181 (11)

1949

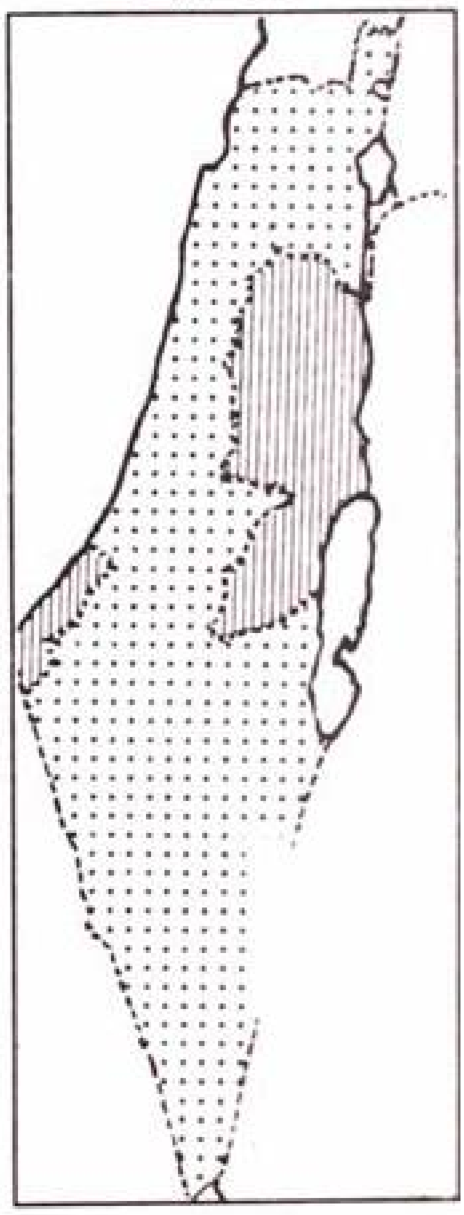

Map of Palestine after 1948 Arab-Israel War

Arab State Jewish Territories Neutral Zone

ماہرینِ جنگ کا تو کہنا ہے کہ اقدام خود بہترین دفاع ہے :

Offence is the best defence.

میں نے کہا کہ آپ لوگوں کو صرف پرانے زمانہ کی باتیں معلوم ہیں۔ نئے زمانہ کی آپ کو کچھ خبر نہیں۔ یہ سب مقولے اس زمانہ کے ہیں جب کہ جنگ صرف دو فوجوں کے درمیان ہوتی تھی۔ عام شہری اس کے نقصان سے بچے رہتے تھے۔ مگر آج کی جنگ پورے ملک میں تباہی برپا کرتی ہے۔ اب نہ اقدامی جنگ کا کوئی نتیجہ ہے اور نہ دفاعی جنگ کا۔ اب تو صرف تدبیر کا راستہ انسان کے لیے باقی رہ جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ انٹرنیشنل فیڈریشن آف ریڈ کراس اینڈ ریڈ کریسنٹ سوسائٹیز نے جنیوا سے اس سلسلہ میں ایک جائزہ (World Disasters Report 1995) چھاپا ہے۔ اس کے مطابق، دوسری عالمی جنگ کے بعد ۵۶ جنگوں میں جو لوگ شدید طور پر اس سے متاثر ہوئے ان میں ۹۵ فی صد تعداد غیر فوجی شہریوں سے تعلق رکھتی تھی :

Ninety-five percent of the victims were civilians.

ایسی حالت میں جنگ دو طرفہ تباہی کے ہم معنی بن کر رہ گئی ہے۔

اگست ۱۹۶۹ میں یروشلم کی مسجد اقصی میں آتش زدگی کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد ساری دنیا میں مسلمانوں کی طرف سے اس کے خلاف احتجاج کیا گیا۔

۲۹ اگست کی شام کو دہلی کے آسمان نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ یہ مسلمانوں کے دو جلسے تھے جو ایک ہی تاریخ کو ایک ہی مقصد کے تحت مگر دو الگ الگ شامیانوں کے نیچے کیے گئے۔ دونوں کا مقام جامع مسجد دہلی کے قریب کا آزاد پارک تھا۔ ایک جلسہ شام کو ۵ بجے ہوا اور دوسرا ساڑھے نو بجے شب میں۔

دونوں جلسوں کا مقصد ایک تھا۔ مسجد اقصی کی آتش زدگی کے خلاف یوم احتجاج منانا۔ دونوں جلسوں میں اپنے اپنے حلقہ کے لوگ اکٹھا ہوئے۔ میں دونوں ہی میں شریک تھا۔ میں نے سنا کہ دونوں جلسوں میں اسرائیل کے خلاف پرجوش تقریریں ہو رہی ہیں۔ ان تقریروں کا خلاصہ یہ تھا کہ —— اے عربو! متحد ہو کر اسرائیل کا مقابلہ کرو۔

آخری جلسہ سے فارغ ہو کر جب میں رات کے وقت اپنی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوا تھا تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے اور زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے: ہم متحد ہو کر مشورہ بھی نہیں دے سکتے، اور وہ متحد ہو کر مقابلہ کریں (الجمعیۃ ویکلی ۱۲ ستمبر ۱۹۶۹)

حال میں فلسطین کی سیاسی جدوجہد کے بارے میں ایک کتاب ایک برطانی مصنف نے شائع کی ہے۔ اس انگریزی کتاب کے مصنف کا نام گراہم اشر ہے:

Palestine in Crises: The Struggle for Peace and Political Independence, by Graham Usher

یہ کتاب ان فلسطینیوں یا ان عربوں میں پسند کی جارہی ہے جو یاسر عرفات کی کوششوں سے زیادہ اتفاق نہیں کرتے۔ اس کتاب میں برطانی مصنف نے لکھا ہے کہ یاسر عرفات کی پالیسیوں کے نتیجہ میں فلسطین کو جو امن حاصل ہوا ہے، وہ وقتی اور مصنوعی ہے۔ اور وہ امریکہ اور اسرائیل کی شرطوں پر قائم ہوا ہے نہ کہ عربوں کی شرطوں پر۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ گراہم اشر کی یہ بات کوئی زیادہ اہم بات نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے جو معاہدہ کیا تھا وہ بھی وقتی تھا اور وہ تمام تر فریق مخالف کی شرطوں پر کیا گیا تھا۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کے حق میں فتح مبین بن گیا۔ اصل یہ ہے کہ یہ دنیا مقابلہ کی جگہ ہے یہاں اصل اہمیت صلح کی دفعات کی نہیں ہے۔ بلکہ اصل اہمیت یہ ہے کہ صلح کے بعد مستقبل کی تعمیر کے لیے آپ کتنی اہلیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ کسی بھی صلح کو مستقبل کے نتائج کے اعتبار سے دیکھنا چاہیے نہ کہ حال کی لفظی دفعات کے اعتبار سے۔ میں نے کہا کہ الفاظ ہمیشہ تاریخ کے تابع ہوتے ہیں، تاریخ کبھی الفاظ کے تابع نہیں ہوتی۔

مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگ ساری دنیا میں یہ غلطی کر رہے ہیں کہ وہ اپنے مسائل کو قول سدید (الاحزاب ۷۰) کی زبان میں پیش نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ ان کو جذباتی بلکہ غیر واقعی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی بھی ملی یا قومی مسئلہ میں مسلمانوں کے درمیان حقیقت پسند رائے نہیں بنتی۔ ساری دنیا کے مسلمان ذہنی اعتبار سے غیر واقعی دنیا میں جیتے ہیں۔ اور جو لوگ غیر واقعی فضا میں جیتے ہوں وہ کبھی اپنے معاملات کی صحیح منصوبہ بندی نہیں کر سکتے۔

فلسطین کا مسئلہ بھی اسی ذہنیت کا شکار ہوا ہے۔ اس کی ایک علامتی مثال نیچے کی تصویر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

کویت سے ایک عربی ہفتہ وار نکلتا ہے جس کا نام المجتمع ہے۔ اس کو جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی نے ۱۹۷۰ میں جاری کیا تھا۔ اس کے شمارہ ۳۰ مئی ۱۹۹۵ کے صفحہ اول پر ایک نمایاں تصویر شائع کی گئی ہے۔ یہ بیت المقدس کی تصویر ہے۔ اس کے ایک طرف اسرائیلی جھنڈا گڑا ہوا ہے، اور دوسری طرف ایک اسرائیلی فوجی گن لٹکائے ہوئے کھڑا ہے۔ یہ تصویر واضح طور پر مصنوعی ہے۔ جھنڈا اور فوجی کی تصویر الگ سے کاٹ کر یہاں چپکائی گئی ہے۔ بیت المقدس کے پاس ایسی کوئی چیز حقیقۃً موجود نہیں۔

عربی اخبارات و رسائل میں مسلسل "القدس" کے بارے میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مگر وہ زیادہ تر جذباتی انداز میں لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ بظاہر ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ ان لکھنے والوں کو قدس کے حقیقی مسئلہ کی خبر نہیں۔ مثال کے طور پر مکہ سے نکلنے والے ماہنامہ الرابطہ کے شمارہ ۲، ۳ میں ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے: حول قضية القدس۔ یعنی بیت المقدس کے مسئلہ کے بارہ میں۔ اس مضمون کے ساتھ ایک تصویر نمایاں طور پر چھاپی گئی ہے جو یہاں نقل کی جاتی ہے۔ یہ تصویر واضح طور پر قبۃ الصخرة کی ہے۔ مگر اس کے نیچے لکھا ہوا ہے: مسجد اقصیٰ کو عرب سیادت کے تحت واپس لانا بالکل ضروری ہے۔

جب میں دہلی سے یروشلم کے لیے روانہ ہوا تو میرے ذہن میں بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی واضح تصویر نہ تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید دونوں ایک ہی ہیں۔ چنانچہ وہاں کی کانفرنس میں پیش کرنے کے لیے میں نے جو پیپر تیار کیا اس میں بھی میں نے مسجد اقصیٰ لکھ کر اس کے آگے بریکٹ میں بیت المقدس لکھ دیا تھا۔ گویا کہ دونوں ایک ہی ہیں۔

یہ غلط فہمی کوئی انفرادی نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ۹۹ فی صد مسلمان اس معاملہ میں اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ دونوں کے بارے میں کوئی واضح شعور نہیں رکھتے۔ حتیٰ کہ یہ غلط فہمی بہت پہلے سے چلی آرہی ہے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ اس امت کا معاملہ مستقیم رہے گا یہاں تک کہ

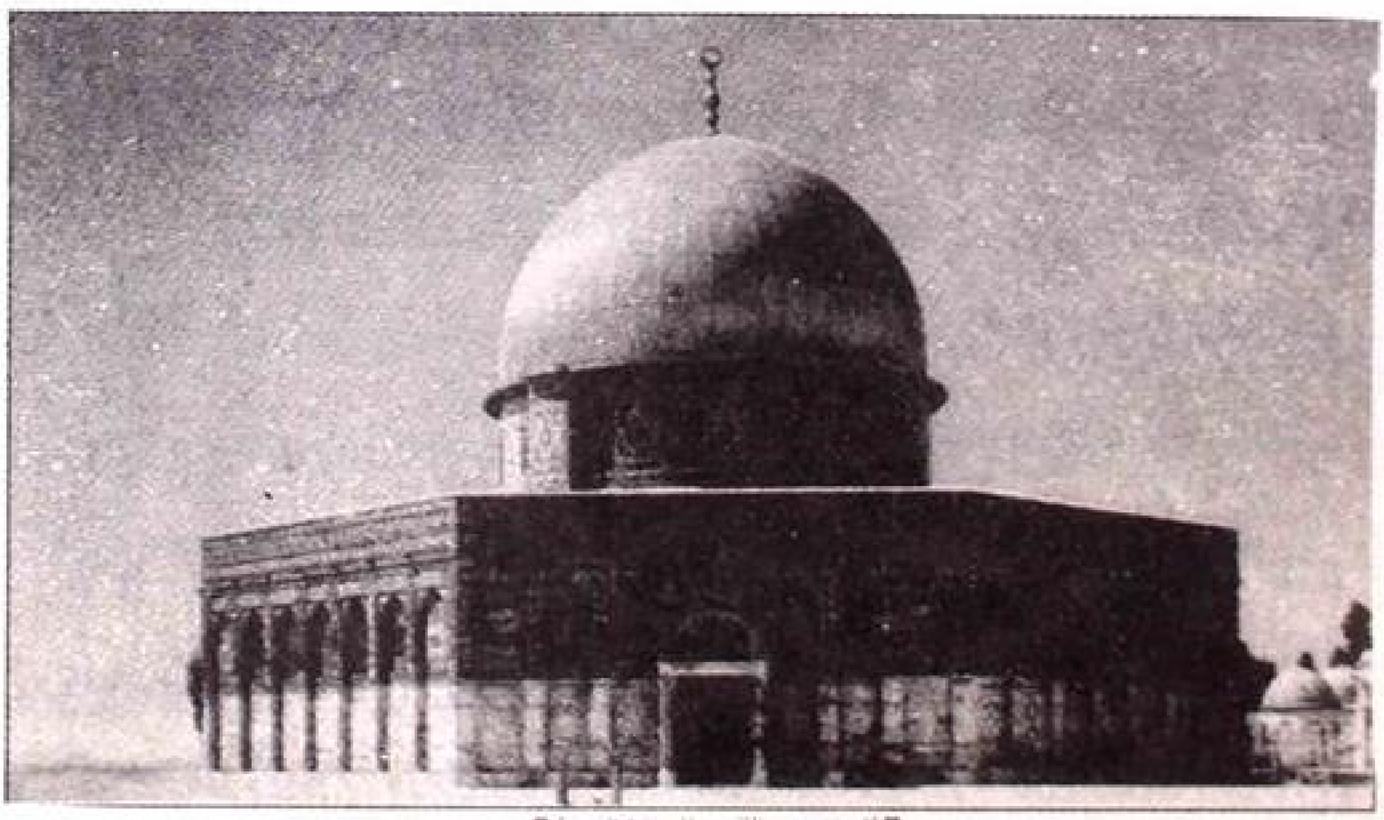

■ لابد ان يعود الأقصى للسيادة العربية ■

قیامت آجائے۔ دوسری کتب حدیث میں بھی یہ روایت الفاظ کے فرق کے ساتھ آئی ہے۔ الاوسط للطبرانی میں یہ الفاظ ہیں: یقاتلون علی ابواب بیت المقدس وما حولہ لا یضرہم من خذلہم ظاہرین الی یوم القیامۃ (فتح الباری ۳۰۸/۱۳) یعنی امت کے یہ اہل حق بیت المقدس کے دروازوں پر اور اس کے آس پاس قتال کریں گے۔ ان کا کوئی حریف انھیں نقصان نہ پہنچا سکے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ ایک اور روایت: لا تزال عصابۃ من امتی یقاتلون علی امر اللہ قاہرین لعدوہم لا یضرہم من خالفہم حتی تأتیہم الساعۃ (صفحہ ۳۰۷)

اس روایت میں قتال سے مراد جنگ نہیں ہے، بلکہ غیر حربی کوشش ہے۔ (فتح الباری ۳۰۶/۱۳)

اس سے معلوم ہوا کہ بیت المقدس کے علاقہ میں ابدی طور پر مسلمانوں کا غلبہ مقدر کرایا گیا ہے۔ اس حدیث کے مطابق، حکومت اسرائیل کے قیام کے باوجود اس غلبہ کو قائم رہنا چاہیے۔

قرآن میں دو جگہ یہود کے ایک مخصوص گروہ (نہ کہ تمام یہودی نسل) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مسلسل سرکشی اور نافرمانی کی پاداش میں ان پر لعنت کی اور ان کو ذلیل وخوار بندر بنا دیا (سورۃ البقرۃ آیت ۶۵، سورۃ الاعراف آیت ۱۶۶) سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۰ میں یہ اضافہ ہے کہ اس گروہ کو بیک وقت بندر اور خنزیر بنا دیا گیا۔ البتہ اس سلسلہ میں ابتدا سے مفسرین کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے کہ بندر اور خنزیر بنا دینے سے کیا مراد ہے۔ بعض اس کو حقیقی جسمانی تبدیلی (physical transformation) کے معنی میں لیتے ہیں اور بعض اس کو مجازی طور پر صرف فکری اور مزاجی تغیر (moral metamorphosis) قرار دیتے ہیں۔

مشہور تابعی مجاہد کا قول ہے کہ اصلاً ان کے دل مسخ کیے گئے نہ کہ خود ان کو (جسمانی اعتبار سے) بندر بنا دیا گیا۔ یہ عین اسی طرح کی ایک تمثیل ہے جیسی تمثیل یہود کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے (سورۃ الجمعہ ۵) میں بیان کی ہے کہ وہ "اس گدھے کی مانند ہیں جو اپنے اوپر کتابوں کا بوجھ لادے ہوئے ہو"۔ (مُسخت قلوبہم ولم یُمسَخوا قردۃ"... وإنما ہو مثل

ضرب بہ اللہ "کمثل الحمار یحمل اسفاراً" تفسیر المنار ۱/۳۴۳)

جرمن نومسلم محمد اسد نے مجاہد کے اسی قول کو سامنے رکھتے ہوئے بقرۃ اور اعراف کی مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں کونوا قردۃً خاسئین کا ترجمہ (Be as apes despicable) کیا ہے۔ یعنی ہو جاؤ بندروں کی مانند ذلیل و خوار۔ اس کے علاوہ حاشیہ میں مجاہد کے قول کو انگریزی میں اس طرح نقل کیا ہے :

'Only their hearts were transformed, that is, they were not really transformed into apes: this is but a metaphor (mathal) coined by God with regard to them, similar to the metaphor of "the ass carrying books." (*The Message of the Qur'an*, translated and Explained by Muhammad Asad, Dar al-Andalus, Gibralter, p. 228.)

تاہم اس لفظی بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر مسخ کو حقیقی جسمانی تبدیلی کے معنی میں لیا جائے تب بھی اس ضمن میں دو باتیں تمام مفسرین کے یہاں متفق علیہ ہیں۔ ایک یہ کہ صحیح حدیث کے مطابق نہ یہود بندر اور خنزیر کی نسل سے ہیں نہ یہ جانور یہود کی نسل سے، بلکہ دونوں اللہ تعالے کی مستقل مخلوق ہیں۔

علامہ ابن کثیر نے ابوداؤد الطیالسی کے واسطہ سے عبداللہ بن مسعود کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کیا بندر اور خنزیر مسخ شدہ یہود کی نسل ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو لعنت زدہ ٹھہرا کر اسے مسخ کیا ہو اور پھر اس سے کوئی نسل چلی ہو۔ بلکہ یہ تو ایک مستقل مخلوق ہے جو واقعۂ مسخ کے پہلے سے موجود تھی۔ چنانچہ جب یہود پر خدا کا غضب نازل ہوا اور ان کو مسخ کر دیا تو ان کو انھیں کے جیسا بنا دیا (سألنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن القردۃ والخنازیر أھی من نسل الیھود؟ فقال: "لا، ان اللہ لم یلعن قوماً قط فیمسخھم فکان لھم نسل"، ولکن ھذا خلق کان۔ فلما غضب اللہ علی الیھود فمسخھم جعلھم مثلھم") مختصر تفسیر ابن کثیر ۱/۵۳۱-۵۳۰

دوسرے یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ و تابعین سے صراحۃً منقول ہے کہ کوئی مسخ شدہ قوم تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہی، نہ اس نے کچھ کھایا، نہ کچھ پیا، اور نہ

اس سے توالد و تناسل کا کوئی سلسلہ جاری ہوا (لم یعش مسخٌ قط فوقَ ثلاثۃِ ایام، ولم یأکل ولم یشرب ولم ینسل) مختصر تفسیر ابن کثیر ۱/۴،

مسجدِ اقصیٰ کے گرد و پیش میں جو آبادی ہے وہاں زبان کو مستثنیٰ کر کے بڑی حد تک پرانی دہلی کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ بھیڑ، گندگی، بدنظمی، شور و غل، بچوں کی اچھل کود، دیواروں پر حکومت کے خلاف احتجاجی نعرے وغیرہ ——— آزادیٔ فلسطین کے لیے وہاں جو تنظیمیں زیادہ سرگرم ہیں ان میں ایک حرکۃ المقاومۃ الاسلامیۃ ہے جس کا مختصر نام (short form) حماس ہے۔ یہ ایک جذباتی اور انتہا پسند تنظیم ہے۔ اسی کے زیر قیادت، دسمبر ۱۹۸۷ کو ایک مخصوص حادثہ (المقطورۃ) کے بعد وہ پرشور تحریک وجود میں آئی جو اخبارات میں الانتفاضۃ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے تحت فلسطینی لڑکوں اور نوجوانوں کو اکسایا گیا کہ وہ جہاں کہیں بھی کسی یہودی کو دیکھیں پتھر مار کر اس کا چہرہ زخمی کر دیں۔ جن لڑکوں نے اس تحریک میں حصہ لیا انھیں پُرفخر طور پر اولاد الحجارۃ کہا جاتا ہے۔

جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح ایک طاقت ور فوج کے مقابلہ میں "پتھر" اٹھانا بلاشبہ ایک مجنونانہ حرکت ہے۔ مگر اپنے اس طریقِ کار پر حماس کو اتنا یقین ہے کہ اس کے بقول عربوں کے تمام ٹینک اور میزائل بھی وہ کارنامہ انجام نہ دے سکے جو ان کے پتھر نے کر دکھایا، وہ پتھر جو "غاصب" کے چہرہ کو لہولہان کر دیتا ہے (کل الدبابات وکل صواریخ العرب، ماساوت حجراً، حجراً یُدمی وجہ المحتل)

اس علاقہ میں جس طرف سے بھی گزر ہوا اکثر دیواریں حماس کی طرف سے لکھے گئے جذباتی نعروں (شعارات) سے رنگین نظر آئیں۔ مثلاً: ——— نعم للحجر، لا للمؤتمر، پتھر کے لیے ہاں، کانفرنس کے لیے نہیں (یعنی ہمارا مسئلہ صرف پتھر کے ذریعہ لڑ کر حل ہو سکتا ہے نہ کہ امن کانفرنسوں میں بات چیت کے ذریعہ)

——— بالقوۃ وبالقوۃ فقط تحرر ارض فلسطین، طاقت اور صرف طاقت کے ذریعہ ہی سرزمین فلسطین کو آزاد کرایا جا سکتا ہے۔

——— جند حماس للاقصیٰ حراس، حماس کی فوج اقصیٰ کی محافظ۔

--- صراعُنا مع اليهود صراعُ وجودٍ لا حدود، یہود کے ساتھ ہماری کش مکش ہمارے (قومی) وجود کی کش مکش ہے نہ کہ (جغرافیائی) حدود کی کش مکش۔

--- إن الجهاد في سبيل الله ... هو الحل الراجح والأسلوب الفعال في التفاهم مع أحفاد القِردة والخنازير... وما الحلول والمبادرات السلمية الا غثاء كغثاء السَّيل، بندروں اور خنزیروں کی اولاد کے ساتھ معاملہ کرنے کے لیے جہاد فی سبیل اللہ ہی قابلِ ترجیح حل اور موثر ترین طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ پُرامن نوعیت کے سارے حل اور پیش قدمیاں سیلاب کے جھاگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

حماس کے یہ نعرے ایک طرف اس کے مزاج اور طریقِ کار اور دوسری طرف عصرِ حاضر کے تقاضوں سے اس کی الم ناک بے خبری کا پتہ دیتے ہیں۔

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے کہ عرب اخبارات میں عام طور پر یہودیوں کو ازراہِ تحقیر (حفاد القردة والخنازير یعنی بندروں اور خنزیروں کی اولاد کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر حماس کے ایک نعرہ میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں۔ مگر ایسا کہنا حد درجہ سرکشی اور جہالت کی بات ہے۔ کیوں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، صحابہ وتابعین اور تبعِ تابعین کے مسلک کے بالکل برعکس ہے۔

ایک حدیث میں مومن کو نرم پودے (کمثل الخامة الزرع) سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ جب ہوا چلتی ہے تو وہ اس سے ہم آہنگ ہو کر دائیں یا بائیں طرف جھک جاتا ہے۔ اور ہوا کا زور گھٹنے کے بعد بدستور اپنی جگہ سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس منافق سخت تنے کی مانند ہوتا ہے جو ہوا کے ایک ہی جھٹکے میں اپنی جگہ سے اکھڑ کر گر جاتا ہے۔ دوسری طرف قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر تمہارے مخالفین صلح پر آمادہ ہوں تو تم بھی اللہ پر توکل کرتے ہوئے اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ۔ اگر مخالفین مصالحت کے بہانے تمہیں دھوکا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں تب بھی اللہ تمہارے لیے کافی ہو جائے گا (الانفال ۶۲-۶۱)

مذکورہ حدیث اور آیت کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے قائدین نے، خصوصاً مسئلہ فلسطین کے معاملہ میں، نہ تو حقیقی دانش مندی کا ثبوت دیا نہ حقیقی توکل کا۔ دانشمندی

کا تقاضا یہ تھا کہ جب ساری دنیا میں امن کا چرچا ہو رہا ہو اور قومی و بین اقوامی نزاعات کو پُر امن بات چیت کے ذریعہ حل کرنا تہذیب و شائستگی کا مسلمہ معیار بن چکا ہو، تو وہ جنگ و قتال جیسی خلافِ زمانہ باتوں سے مکمل احتراز کرتے۔ وہ "معرکۂ حطین" کی تجدید کے بجائے "معاہدۂ حدیبیہ" کی تجدید کو اپنی پالیسی بناتے۔ دوسری طرف توکل علی اللہ کا تقاضا یہ تھا کہ عہد شکنی کے امکانی خطرہ کے باوجود "اغیار" کی طرف سے صلح کی ہر پیش کش کو فوراً قبول کر لیتے۔ مگر چونکہ بر وقت ان دونوں میں سے کوئی ایک بات بھی متحقق نہ ہو سکی، اس لیے جان و مال کی بے پناہ قربانیوں کے علی الرغم آج تک ہمارے تمام مسائل، بشمول مسئلہ فلسطین، غیر حل شدہ پڑے ہوئے ہیں، بلکہ وہ مزید پیچیدہ ہو چکے ہیں۔

فلسطین کے ایک اخوانی نوجوان نے کہا کہ اسلام صرف عبادت نہیں ہے، وہ دین بھی ہے اور ریاست بھی۔ اس لیے اس الدین کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس حکومت ہو جو اسلامی قوانین کو نافذ کرے اور دشمنانِ خدا کے معاملہ میں مسلمانوں کی حمایت کرے اور دشمنوں کی سازشوں سے انھیں بچائے یہ ایک فریضہ ہے مگر اکثر مسلمان اس فرض سے غافل ہیں۔ الاخوان المسلمون مسلمانوں کو اسی کی طرف بلاتی ہے کہ وہ اس فریضہ کو ادا کریں اور اسلامی قوانین کو پوری طرح نافذ کریں:

الاسلام لیس عبادۃ فقط ولکنہ دین و دولۃ۔ وھذا الدین لا بد لہ من دولۃ تطبق الاسلام وتحمی المسلمین من اعداء اللہ وترد کید الاعداء عنھم۔ فھذا واجب لکن کثیرا من المسلمین غافلون عن ھذا الواجب۔ والاخوان یدعونھم لتحقیق ھذا الواجب والعمل علی تطبیق الشریعۃ والحکم بالاسلام۔

میں نے کہا کہ یہ پورا نظریہ ایک غلط تفسیرِ دین پر قائم ہے۔ الاسلام دین و دولۃ اسلام کی ایک مبتدعانہ تفسیر ہے۔ زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ الاسلام دین و دعوۃ۔ یعنی ذاتی زندگی میں دین دار بننے کے بعد مسلمان پر جو دوسری ذمہ داری ہے وہ دعوت ہے نہ کہ حکومت۔ عبادت اور دعوت ذمہ داری ہے، اور حکومت اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ۔ حکومت و اقتدار اسلامی عمل کا ہدف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی حاصل ہوتا ہے اور کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ

اس معاملہ کی پوری تفصیل میں نے اپنی کتاب دین کامل میں کی ہے۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ الدین الکامل کے نام سے قاہرہ سے چھپ چکا ہے۔

ایک فلسطینی نوجوان نے کویت کی دستوری تحریک کا حوالہ دیا کہ اس نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ ٹررزم میں اور قبضہ کے خلاف مقاومت میں فرق کیا جائے جو کہ قوموں کا جائز حق ہے (الحرکۃ الدستوریۃ الاسلامیۃ فی الکویت طالبت بالتفریق بین الارھاب و حق الشعوب فی مقاومۃ الاحتلال)

میں نے کہا کہ اس قسم کے فرق دماغوں میں ہوتے ہیں وہ عملی زندگی میں نہیں ہوتے اور جب دو فریق کے درمیان نزاع کی صورت پیدا ہو جائے تو اسلام اور عقل دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت ذہنی معیار کو پس پشت ڈال کر یہ دیکھا جائے کہ عملی صورت حال کے مطابق کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں۔

میں نے کہا کہ عملی بنیاد پر مذکورہ فیصلہ کو میں درست سمجھتا ہوں، آپ اگر ذہنی معیار پر اصرار کریں گے تو آپ وہ تو نہیں پائیں گے جو آپ پانا چاہتے ہیں۔ البتہ جو کچھ آپ کو ملا ہوا ہے اس کو بھی آپ کھو دیں گے۔

عرب اخبارات و رسائل اس قسم کے عنوانات سے بھرے رہتے ہیں:

بقاء القدس فی ید اسرائیل یعنی ان الاستعمار الصھیونی قائم

(قدس کا اسرائیل کے ہاتھ میں باقی رہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ صہیونی استعمار قائم ہے)

مدینۃ القدس الشریف تنادیکم (قدس آپ کو پکار رہا ہے)

ان العرب سیرمون اسرائیل فی البحر (عرب اسرائیل کو سمندر میں پھینک دیں گے)

القدس الشریف: بین مؤامرۃ التھوید وطمس ھویتھا الاسلامیۃ

(قدس تھویدی سازش اور اس کے اسلامی تشخص کو مٹانے کی کوشش کے درمیان)

یروشلم میں مسجد اقصیٰ کے قریب ڈیڑھ ایکڑ کے رقبہ میں ایک مسجد او رمرکز ہے۔ اس کا نام زاویۃ الفریدیہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غیر منقسم ہندستان کے ایک صوفی بابا فرید گنج شکر چار سو سال پہلے یہاں زیارت کے لئے آئے تھے۔ اس وقت فلسطین میں عثمانی ترکوں کی حکومت

تھی۔ ترک گورنر نے بابا فرید کو مسجد کے دو کمرے دے دیے۔ بعد کو ہندستانی نوابوں کے تعاون سے کچھ اور عمارتیں یہاں بنائی گئیں۔

سہارن پور کے خواجہ نذیر حسن انصاری کو اس وقت کی ہندستانی حکومت نے ۱۹۲۲ میں یہاں سے ایڈمنسٹریٹر کے طور پر بھیجا تھا۔ ۱۹۵۳ میں ان کی وفات ہوگئی۔ اب ان کے پوتے نذر حسن انجینیر اس وقف کے ٹرسٹی ہیں۔ انڈیا سے اس ٹرسٹ کو چھ ہزار روپے سالانہ کی امداد دی جاتی ہے۔

یروشلم کی موتمر کا دعوت نامہ مجھے مل چکا تھا کہ اس کے بعد فروری ۱۹۹۴ میں میرا ایک سفر رباط (المغرب) کے لیے ہوا۔ وہاں الجزائر کے ڈاکٹر محمد السلیمانی سے ملاقات ہوئی۔ ان سے ذکر ہوا تو انھوں نے کہا کہ آپ کو یروشلم کی موتمر کا دعوت نامہ ہرگز قبول نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کا وہاں جانا اسرائیل کی تصدیق کے ہم معنی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ میری تمنا تھی کہ میں قدس میں داخل ہو کر اللہ کے لیے سجدہ کروں جہاں پیغمبروں نے سجدہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی نیت کچھ بھی ہو مگر عملاً تو وہ اسرائیل کی تصدیق بن جائے گا۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا یہ طرزِ فکر سراسر ایک غیر مسنون طرزِ فکر ہے۔ قدیم مکہ میں تقریباً وہی صورت پیش آئی جو موجودہ زمانہ میں فلسطین میں پیش آئی ہے۔ قریش نے رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ پر سخت مظالم کیے، یہاں تک کہ ان کو ان کے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا، اور پھر مکہ کے اوپر اپنا مجرمانہ اقتدار قائم کر لیا۔ اس کے بعد یہ واقعہ ہوا کہ مکہ میں دشمنانِ اسلام کا اقتدار باقی رہتے ہوئے رسولؐ اور اصحاب رسولؐ نے عمرہ کے لیے مکہ کا سفر کیا۔ پہلی بار اہل مکہ نے داخل نہیں ہونے دیا تو اگلے سال دوبارہ سفر کیا اور مکہ میں داخل ہو کر کعبہ کا طواف کیا جس میں اب ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے اور پھر کسی احتجاج یا ٹکراؤ کے بغیر مدینہ واپس گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوچ وہ ہوتی جو آپ حضرات کی سوچ ہے، یعنی مکہ میں داخلہ کو آپ دشمن کے اعتراف کے ہم معنی سمجھتے تو آپ کبھی بھی مکہ میں داخل نہ ہوتے۔

اس واقعہ سے رسول اللہؐ کی ایک خاص سنت اخذ ہوتی ہے۔ اور وہ ہے دو چیزوں کو ایک دوسرے میں نہ ملانا۔ پس یہ بھی رسول اللہؐ کی ایک سنت ہے کہ دو مختلف چیزوں کو ایک

دوسرے سے مختلط نہ کیا جائے (عدم الخلط بین الشیئین هو سنة من سنن الرسول)

میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگوں کی سوچ منفی سوچ ہے۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورے معنوں میں مثبت انداز میں سوچتے تھے (طریقتکم فی التفکیر سلبیة والرسول کان یفکر بطریقة ایجابیة بکل معنی الکلمة)

ایک زمانہ تھا کہ عرب دنیا میں الاخوان المسلمون کے سیاسی فکر کی دھوم تھی مگر اب اس فکر کی سطحیت لوگوں پر واضح ہونے لگی ہے۔ چنانچہ اہل علم میں اس کے ناقدین پیدا ہو رہے ہیں۔ ایک صاحب نے مصر کے دکتور عبد الصبور مرزوق (پیدائش ۱۹۲۵) کا قول سنایا کہ کیا یہ بے معنی نہیں ہے کہ ہم اسلامی حکومت کا مطالبہ کریں اور حال یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہاتھ نیچے کا ہاتھ بنا ہوا ہے۔ وہ خوراک اور ہتھیار اور کپڑے اغیار سے مانگتا ہے۔ ہم ہر معاملہ میں دوسروں کے محتاج ہیں۔ اور اگر وہ چاہیں تو اپنی گاڑیاں ہمیں نہ دیں اور ہم دوبارہ گدھے اور خچر کی سواری کی طرف لوٹ جائیں:

الیس من العبث ان نطالب بدولة اسلامیة و ید المسلمین السفلی تطلب من غیرها الطعام والسلاح والملابس ونظل عالة علی غیرنا ولو شاؤا حبسوا عنا السیارات مثلا و رجعنا للبغال والحمیر۔

میں نے کہا کہ یہ درست ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان علم سے لے کر کردار تک ایک پچھڑی ہوئی قوم بن چکے ہیں۔ مفت کے پٹروڈالر سے حاصل کی ہوئی ظاہری چمک دمک کو ہٹا دیجئے تو اندر سے وہ ہر اعتبار سے کھوکھلے نظر آئیں گے۔ ایسی حالت میں حکومت اور خلافت کی باتیں کرنا وقت کا ضیاع ہے نہ کہ کوئی حقیقی کام۔

ایک سنجیدہ قسم کے عرب عالم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں پر تنقید کرتے ہوئے کہا: هم یَحُلّون العقدة بطریقةٍ تجعل العقدة الواحدة عُقدتَین (وہ گرہ کو اس طرح کھولنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ایک گرہ کو دو گرہ بنا دیتی ہے)

میں نے کہا کہ یہی بات برصغیر ہند کے تمام مسلم رہنماؤں پر صادق آتی ہے۔ ہر ملی گرہ جس

کو کھولنے کے نام پر وہ اٹھے اس نے ایک گرہ کو کئی گرہ بنا دیا۔ تقسیم کی تحریک، شاہ بانو تحریک، بابری مسجد تحریک، اس کی قریبی مثالیں ہیں۔

یروشلم کی کانفرنس میں شرکت کے لیے روم سے بار بار ٹیلی فون آئے۔ میں وہاں جانے کے لیے صرف اس لیے تیار ہوا تھا کہ اس طرح مجھ کو مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کا موقع ملے گا۔ تاہم ایک خدشہ بھی لگا ہوا تھا۔ عرب اخبارات مسلسل اس کی جو تصویر پیش کر رہے تھے، اس سے میں نے سمجھا تھا کہ مسجد اقصیٰ کے چاروں طرف اسرائیل کی بہت بڑی فوج کھڑی ہوئی ہوگی۔ اور عین ممکن ہے کہ وہ مجھے اندر داخل ہونے کی اجازت ہی نہ دیں اور میں نامراد ہو کر وہاں سے لوٹ آؤں۔

عرب اخبارات نے اس معاملہ میں اتنا غلو کیا ہے کہ انھوں نے فرضی تصویریں چھاپ کر پورے معاملہ کو غلط رنگ میں پیش کیا (اس کی کچھ تفصیل اِس سفرنامہ میں موجود ہے)

جہاں تک میں نے سمجھا ہے فلسطینیوں کے ساتھ اسرائیل کی دشمنی اصلاً سیاسی دشمنی ہے نہ کہ دینی دشمنی۔ مگر فلسطینیوں نے اور عربوں نے انتقامی جذبہ کے تحت دونوں میں فرق نہیں کیا۔ انھوں نے اسرائیل کو اپنا سیاسی دشمن بتانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا شروع کیا کہ وہ مذہبی اعتبار سے خود اسلام کا دشمن ہے۔ ان حضرات کے یہ بیانات قرآن کے اس حکم کے خلاف ہیں کہ دشمنی کے وقت بھی انصاف کی روش پر قائم رہو (المائدہ ۸)

یروشلم کی کانفرنس میں شرکت پر مجھ کو کئی سخت تبصرے سننے پڑے۔ ایک صاحب نے کہا ——— آپ بھی آخر کار یہودی سازش کا شکار ہو گئے:

You too at last fell victim to Zionist Conspiracy.

میں نے کہا کہ آپ لوگ کتنی آسانی سے اس طرح کے جملے کسی کے بارہ میں بول دیتے ہیں۔ حالاں کہ وہ اسلام میں جائز ہی نہیں۔ اس طرح کے تبصرے محض ظن و قیاس ہیں نہ کہ دلیل۔ ظن کی بنیاد پر آپ کسی کے بارہ میں اچھی رائے تو ظاہر کر سکتے ہیں، مگر ظن کی بنیاد پر بری رائے ظاہر کرنا یقینی طور پر حرام ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی کے بارے میں اس طرح کا جملہ نہیں کہا۔

عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں پر یہودی سازش کا تصور اس طرح غالب ہے کہ وہ ہر واقعہ میں یہودی سازش کو کام کرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ موجودہ صدی کے آغاز میں ترکی کی عثمانی خلافت یہودیوں کی سازش سے ختم ہوئی۔ اقبال کا شعر ہے:

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

حیرت ہے کہ یہ بات وہ لوگ بھی کہتے ہیں جو حکمتِ قرآن (Quranic Wisdom) کے علم بردار ہیں۔ حالاں کہ یہ بات قرآن کی تردید کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ اگر تم تقویٰ اور صبر کرو تو دشمنوں کی سازش تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچائے گی (آل عمران ۱۲۰) اس قرآنی ارشاد کی روشنی میں ہمیں ملی مصائب کے بارہ میں کہنا چاہیے کہ وہ ہمارے اندر تقویٰ اور صبر کے فقدان کا نتیجہ تھا نہ کہ حقیقۃً کسی کے سازشی منصوبہ کا نتیجہ۔

ایک عرب عالم سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ مسلمان کیوں ایسا کر رہے ہیں کہ ہر جگہ حکومتوں سے متشددانہ ٹکراؤ کر کے اپنے آپ کو مروا رہے ہیں۔ اس قسم کی ہلاکت خیز پالیسی تو نہ عقل کے مطابق ہے اور نہ اسلام کے مطابق۔

انھوں نے کہا کہ جب اہل حق سے ان کا حق چھینا جائے گا تو لازم ہے کہ وہ اس کو واپس حاصل کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ لوگ جب ہر قسم کا علاج کر چکے ہوتے ہیں تو آخر میں وہ داغنے والے طریقِ علاج کو استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ایک غیر پسندیدہ علاج ہے۔ ہم نے موجودہ طریقہ کو اسی وقت اختیار کیا جب کہ ہم مجبور ہو گئے۔ مشکل کو وہی اختیار کرتا ہے جو مضطر ہو:

اذا سُلبَ اهل الحق حقهم فلا بد ان يستعيدوه ۔ واذا اضطر الناس الى استنفاد كل وسائل العلاج فإن آخر العلاج الكي ، ولو انه علاج غير مستحب ۔ ولن نلجأ اليه إلا إذا اضطررنا ، فلا يركب الصعب إلا المضطر ۔

میں نے کہا کہ موجودہ حالت میں تشدد کا طریقہ علاج نہیں ہے بلکہ وہ خودکشی ہے۔ اور عملاً آج یہی ہو رہا ہے۔ انھوں نے دوبارہ سوال کیا کہ پھر یہ مسلمان کیا کریں۔ میں نے کہا کہ انھیں دو میں سے ایک کام کرنا چاہیے۔ یا تو وہ سیاسی اقتدار کے مسئلہ کو علیٰ حالہ چھوڑ کر دوسرے

غیر سیاسی میدانوں میں تعمیر و ترقی کی جدوجہد کریں جس کا میدان ہر ملک میں پوری طرح موجود ہے۔

اور اگر بالفرض وہ سیاسی جدوجہد ہی کو ضروری سمجھتے ہیں تو بم اور گن سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے خالص پُرامن انداز میں اپنی تحریک چلائیں۔ جیسے انڈیا میں مہاتما گاندھی نے اور ساؤتھ افریقہ میں نیلسن منڈیلا نے کیا۔ مسلمان پرتشدد جدوجہد کا طریقہ چھوڑ کر پُرامن جدوجہد کا طریقہ اختیار کر لیں۔ میں نے کہا کہ موجودہ مسلمانوں کا کیس اضطرار کا کیس نہیں ہے، وہ غلط چوائس لینے کا کیس ہے۔ ان کے لیے ایسر کو اختیار کرنے کا موقع پوری طرح موجود تھا۔ مگر انھوں نے ناقابلِ فہم نادانی کے تحت اعسر کو اپنے لیے اختیار کر لیا۔ حالانکہ وہ واضح طور پر سنّتِ رسولؐ کے خلاف ہے۔

اورنگ زیب نے اپنے باپ شاہ جہاں کو ۱۶۵۸ء میں گرفتار کر لیا، اور آگرہ کے قلعہ میں اس کو قید کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار شاہ جہاں نے پریشانی کا خط لکھ کر اورنگ زیب کے پاس بھجوایا۔ اورنگ زیب نے اس کے جواب میں فارسی کا ایک مصرعہ لکھ کر بھیج دیا —— زخمی چڑیا جب جال میں پھنس جائے تو اس کو برداشت سے کام لینا چاہیے :

مرغ بسمل چوں بہ دام افتد تحمل بایدش

اس کا مطلب، دوسرے لفظوں میں یہ تھا کہ حقیقت پسندی سے کام لیجئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فلسطین کا معاملہ جو اتنا زیادہ بگڑ گیا اس کا سبب یہی تھا کہ اس معاملہ میں مسلم رہنماؤں نے حقیقت پسندی سے کام نہیں لیا۔ حسن البنا سے لے کر یاسر عرفات تک بلا استثناء ہر عالم اور ہر قائد اس معاملہ میں غیر حقیقت پسندانہ رہنمائی دیتا رہا۔ یہاں تک کہ مسلمان ذلت اور تباہی کی آخری حد پر پہنچ گئے۔

۱۹۴۸ میں اقوام متحدہ نے جو تقسیم کی تھی اس میں فلسطین کا نصف سے زیادہ حصہ عربوں کے پاس تھا۔ اسی کے ساتھ پورا یروشلم بھی انھیں حاصل تھا۔ مگر مسلم قیادت نے پرجوش طور پر اس تقسیم کو نامنظور کر دیا۔ اس کے بعد دونوں فریقوں کے درمیان لامتناہی جنگ چھڑ گئی جس کا سارا فائدہ یہودیوں کو ملا اور سارا نقصان مسلمانوں کے حصہ میں آیا۔

اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جاتا تو کرنے کا کام یہ تھا کہ فلسطین کے ملے ہوئے حصہ میں

عربوں کی حکومت قائم کی جائے۔ اور اس کے یہودی حصہ میں مسلمان سیکولر شہری بن کر اسی طرح تعمیر و ترقی کے کام میں سرگرم ہو جائیں جس طرح لاکھوں عرب آج بھی غیر مسلم ملکوں میں تعمیر و ترقی کے عمل میں مصروف ہیں۔

ایک وقت تھا کہ مصر کے فوجی صدر جمال عبد الناصر اور دوسرے لوگ یہ کہتے تھے کہ عرب اسرائیل کو سمندر میں پھینک دیں گے (ان العرب سیرمون اسرائیل فی البحر) لیبیا کے کرنل معمر القذافی اتنے جوش میں تھے کہ انھوں نے اپنے ساتھی مسٹر جلود کو یہ کہہ کر اسپیشل جہاز سے چین بھیج دیا کہ وہاں سے ایٹم بم خرید کر لاؤ تاکہ اس کو اسرائیل کے اوپر گرا کر ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یاسر عرفات اور دوسرے تمام لیڈر اسی قسم کی پر جوش بولی بول رہے تھے۔

مگر آج صورت حال بدل چکی ہے۔ یاسر عرفات پچھلی سیٹ پر چلے گئے۔ یہاں لیبیا سے قریبی واقفیت رکھنے والے ایک صاحب نے کہا کہ کل کے معمر قذافی کے مقابلہ میں آج کے قذافی مکمل طور پر بدل چکے ہیں (القذافی الیوم یختلف تماما عن قذافی الامس)

یہ بات خود قذافی کی طرف سے پریس میں آچکی ہے۔ المجلہ کے نمائندے، عبد الرحمٰن الراشد اور عبد اللطیف المناوی نے لیبیا جا کر معمر قذافی کا ایک انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں قذافی نے کہا کہ پہلے ہم آزادئ فلسطین کے بارہ میں جنگ کی باتیں کیا کرتے تھے۔ لیکن انقلابات کی صورت حال نے ثابت کیا ہے کہ یہ ضروری نہیں۔ جس چیز کو بدلنا ہے وہ خود ہمارا طریق کار ہے۔ (یعنی بات چیت کا طریقہ) جہاں تک جنگِ فلسطین کا معاملہ ہے تو اس سلسلہ میں جنوبی افریقہ کو دیکھئے۔ جہاں جنگ کے بغیر اسی نوعیت کا مسئلہ حل کر لیا گیا۔ آزادئ فلسطین کے لیے بھی ضروری نہیں کہ ہم جنگ چھیڑیں، اگر فلسطینی لوگ اپنی سرزمین میں واپس آجائیں اور ان کی ۵ یا ۶ ملین تعداد یہودیوں کے ساتھ ایک جمہوری نظام حکومت میں شرکت پر راضی ہو جائے تو آخر کار ان کا مسئلہ مکمل طور پر حل ہو جائے گا (الرسالہ مئی ۱۹۹۵)

اس سے پہلے قذافی مسلح جد و جہد کے زبردست حامی تھے۔ حتیٰ کہ انھوں نے اپنی قوم کو یہ گانا سکھایا کہ احنا شرابون دم۔ مگر ہلاکت خیز تجربے کے بعد اب نہ صرف قذافی بلکہ فلسطین کے یاسر عرفات سے لے کر فلپائن کے نور مسواری تک ہر ایک مسلح جد و جہد کی بولی چھوڑ کر پر امن جد و جہد کی بولی بول رہا ہے۔

زیادہ اہم مسئلہ

ریحاوم زیوی (Rehavam Zeevi) اسرائیل کی فوج میں ایک آرمی جنرل تھے۔ ان کی عمر اب ۶۳ سال ہے۔ فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ پالی ٹکس میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس وقت وہ اسرائیل کی پارلی منٹ (Knesset) کے ممبر ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اسرائیل میں پروٹرانسفر (protransfer) کہا جاتا ہے۔ یعنی اس نظریہ کے حامی کہ عربوں کو فلسطین سے نکال کر انھیں دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔

امریکی میگزین نیوزویک (*Newsweek*) کے نمائندہ اسٹینگر (Theodor Stanger) نے ان سے اسرائیلی پارلی منٹ کے دفتر میں ملاقات کر کے ان کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال وجواب یہ تھا: (نیوزویک ۱۲ نومبر ۱۹۹۰ صفحہ ۵۶)

س: کیا آپ فلسطینیوں کے ساتھ امن چاہتے ہیں؟

ج: فلسطینی لوگوں کے لیے واحد حل یہودیوں سے علیحدگی ہے۔ ہر قوم اپنے باپ دادا کی زمین کی طرف لوٹنے کا حق رکھتی ہے۔ ہم یہودی اپنے باپ دادا کی زمین کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ فلسطینیوں کے باپ دادا یہاں سعودی عرب، سوڈان اور لیبیا سے آئے تھے (اس لیے وہ دوبارہ وہاں لوٹ جائیں)

س: کیا آپ دس لاکھ سے اوپر ان فلسطینیوں کو زبردستی بسوں اور ٹرکوں میں بھریں گے اور انھیں لے جا کر باہر ڈال دیں گے؟

ج: مسٹر زیوی نے جواب دیا کہ نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ عرب ممالک انھیں اپنے یہاں بلالیں یا فلسطینی خود ایسا کریں کہ وہ ڈیڑھ لاکھ، دو لاکھ سالانہ کی تعداد میں یہاں سے جانا شروع کریں۔ چند سال کے بعد یہاں کوئی مسئلہ نہ ہوگا:

In a few years, there would be no problem. (p. 56)

یہ ایک انتہا پسند یہودی کی بات ہے۔ اس طرح کے انتہا پسند افراد ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ نہ صرف دوسری قوموں میں بلکہ خود مسلمانوں میں بھی ایسے انتہا پسند افراد مل سکتے ہیں۔ مگر ایسے انتہا پسند افراد کبھی کسی قوم میں قبولِ عام حاصل نہیں کرتے۔ ان کے لیے صرف یہ انجام مقدر ہے کہ

وہ چند سال تک اس قسم کے سخت الفاظ بولیں اور اس کے بعد مر کر تاریخ کے قبرستان میں دفن ہو جائیں ۔

کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے ——— یہ مثل ایسے ہی مسائل کے لیے بنائی گئی ہے ، اور بلاشبہہ ایسے مسائل کا اس سے بہتر کوئی حل نہیں ۔

۱۹۷۸ کے اواخر میں مصر کے مقتول صدر انور سادات نے اسرائیل کے ساتھ امن مذاکرات کے لیے پیش قدمی کی ۔ جس کے نتیجہ میں بالآخر فریقین نے اس معاہدہ پر دستخط کیے جو کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کے نام سے مشہور ہوا ۔ اس سلسلہ میں مصر اور اسرائیل کے درمیان جو بات چیت ہوئی اس کی سرپرستی سابق امریکی صدر جمی کارٹر (Jimmy Carter) نے کی تھی ۔ نیز انھیں کے حسب منشاء معاہدہ کا آخری مسودہ تیار کیا گیا ، جس کا پورا نام یہ تھا :

A Framework for Peace in the Middle East Agreed at Camp David

اس معاہدہ کی دفعہ نمبر ۲ کی شق (C) مغربی کنارہ اور غازہ پٹی میں فلسطینیوں کی حکومت خود اختیاری (Self-governing authority) کے بارہ میں تھی ۔ مگر اس کی عبارت نہایت مبہم اور بالواسطہ انداز میں (باسلوبِ غامضٍ و غیر مباشرٍ) لکھی گئی تھی ۔ اس وقت محمد ابراہیم کامل مصر کے وزیر خارجہ تھے ۔ اسی کے ساتھ امن مذاکرات کے دوران وہ سادات کے خصوصی ایڈوائزر بھی تھے ۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے اس پہلو پر توجہ دلاتے ہوئے سادات سے کہا کہ معاہدہ میں یہ بات بالکل واضح اور براہِ راست الفاظ میں درج ہونی چاہیے کہ فلسطینی مقررہ حدود کے اندر اپنی آزاد اور خود مختار حکومت کی تشکیل کا حق رکھتے ہیں ۔ اس کے جواب میں سادات نے کہا کہ خود مجھے اس کا احساس ہے اور اس معاملہ کی مزید وضاحت کے لیے میں نے جمی کارٹر سے بات چیت بھی کی تھی ۔ لیکن انھوں نے کہا کہ اسے یوں ہی رہنے دیا جائے ۔ کیونکہ اس کو بدلنے کی صورت میں مجھے اس کی قیمت اپنی کرسیٔ صدارت سے ادا کرنی پڑے گی :

'It would cost me my chair.'

(السلام الصنائع فی اتفاقیات کامب دیفیر ، مطبوعات ادارۃ المشرق الاوسط ، صفحہ ۶۰۳)

آج انسان کھلے طور پر ایک حق کا اعتراف اس لیے نہیں کرتا کہ اس کے نتیجہ میں وہ دنیا کے وقتی اور محدود اقتدار کی کرسی سے محروم ہو جائے گا۔ حالاں کہ مرنے کے بعد جب انسان یہ دیکھے گا کہ مقتدرِ اعلیٰ کے دربار میں سچائی کی کرسی (مقعد صدق) پر صرف وہی لوگ بٹھائے گئے ہیں، جنھوں نے دنیا میں اعلانِ حق کی خاطر اپنی "کرسی" کھو دی تھی۔ تو وہاں وہ اپنی کرسی اور اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ مگر اس وقت اس کے حصہ میں حسرت وافسوس کے سوا کچھ نہیں آئے گا کیوں کہ آخرت کی کامیابی کے لیے وہی قربانی مطلوب ہے جو دنیا میں پیش کی گئی ہو۔ آخرت کے لیے آخرت میں قربانی کی پیش کش خود اپنے خلاف حجت قائم کرنا ہے۔ یہ انسان کو عذاب کا مستحق بناتا ہے نہ کہ انعام واکرام کا۔

ایک عرب اسکالر نے گفت گو کے دوران بتایا کہ مختلف ملکوں کے بارہ میں عالمی سطح پر جو تازہ اعداد وشمار سامنے آئے ہیں، ان میں تمام عرب ممالک کو بلا استثنا، علمی اعتبار سے فاقہ زدہ (الدُّوَل الجائعة علمیاً) قرار دیا گیا ہے جب کہ ان کے مقابلہ میں اسرائیل کو جدید ٹکنالوجی کا حریص ملک (دولة نهمة تكنولوجياً) بتایا گیا ہے۔ یہی فرق ایک لفظ میں عربوں کی ہر محاذ پر مسلسل شکست کا واحد سبب ہے۔ قدیم زمانے میں کہا جاتا تھا ——— جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ آج "لاٹھی" کی جگہ سائنس اور ٹکنالوجی نے لے لی ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں "بھینس" پر براہِ راست یا بالواسطہ قبضہ اسی کا ہوتا ہے جس کے پاس سائنس اور ٹکنالوجی کی طاقت ہے۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ میں سائنس کو طاقت کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ایسی حالت میں سائنس میں پس ماندہ قوم کا برتر قوم سے جنگ کرنا صرف خودکشی ہے نہ کہ جہاد فی سبیل اللہ۔

ایک یہودی سے گفت گو ہوئی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور عربی زبان اچھی جانتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کہا جاتا ہے کہ آپ لوگ پورے علاقہ پر اسرائیلی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں مدینہ اور خیبر بھی شامل ہے۔ اس نے کہا کہ یہ اسرائیل کی کوئی قومی پالیسی نہیں۔ کچھ یہودی انفرادی طور پر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔

پھر اس نے کہا کہ بالفرض یہودیوں کا ایسا ہی خیال ہو تب بھی آپ لوگ اس کو اتنا

زیادہ اہمیت کیوں دیتے ہیں۔ ہم کو دیکھئے۔ ہم جانتے ہیں کہ الاخوان المسلمون کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا نشانہ ساری دنیا میں اسلامی حکومت قائم کرنا ہے (ھدف الاخوان ھو اقامة دولة الاسلام العالمیة) اس کے مطابق، نہ صرف اسرائیل کو اسلامی حکومت کا جزیہ گزار بننا ہے بلکہ ہم دنیا کے جس حصہ میں بھی ہوں ہر جگہ ہمیں اسلامی حکومت کا ماتحت بننا پڑے گا۔ مگر ہمیں اس قسم کی باتوں پر کوئی پریشانی نہیں۔

میں نے پوچھا کہ آپ کے پریشان نہ ہونے کی وجہ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ الاخوان المسلمون مصر میں ۱۹۲۸ میں قائم ہوئی۔ اس طرح اس کے قیام کو تقریباً ستر سال ہو رہے ہیں۔ ستر سال کے عرصہ میں وہ خود اپنے ملک مصر میں بھی اپنے تصور کی اسلامی حکومت قائم نہ کر سکی۔ پھر اس رفتار سے پوری دنیا کو اسلام کا سیاسی ماتحت بنانے کے لیے تو سات ہزار سال بھی ناکافی ہیں۔ ایسی حالت میں ہم ابھی سے اس کے لیے کیوں پریشان ہوں۔

قرآن میں واقعہ اسراء کے ذکر کے تحت ارشاد ہوا ہے: سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ لنریہ من آیاتنا (بنی اسرائیل ۱) اس آیت میں ایک سوال یہ ہے کہ لنریہ من آیاتنا (تاکہ رسول کو ہم اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں) سے کیا مراد ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کو بارکنا سے جوڑا ہے۔ یعنی قدس کے آس پاس کی برکتیں دکھائیں۔ لیکن زیادہ صحیح رائے ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اس کو اَسریٰ سے جوڑا ہے اور کہا ہے کہ اس سے مراد آپؐ کو ایک رات میں مکہ سے مسجد اقصیٰ لے جانا ہے جو ایک مہینہ کی مسافت پر واقع ہے (اسراؤہ من مکة الی المسجد الاقصیٰ فی لیلة وھو مسیرة شھر) القرطبی ۱۰/۲۱۲

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اِس آیت میں ایک اہم سبق تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم دانش وروں نے اور مسلم علماء نے نہ اس کو سمجھا اور نہ وہ اس کو استعمال کر سکے۔

یہ اسراء دراصل فطرت کے اس عظیم امکان کو دکھانا تھا جس کو ہم تیز رفتار کمیونی کیشن کہتے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس نئے دور کے سرے پر پیدا کیے گئے۔ اس لیے آپ کو مخصوص اہتمام کے تحت اس فطری طاقت کو پیشگی طور پر دکھا دیا گیا۔ تاکہ آپ کی امت اس

سے آشنا ہو جائے اور جب یہ امکان اپنی پوری شکل میں ظاہر ہو تو اس کو دین کی خدمت میں استعمال کر سکے۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں اور مسلم دانش وروں نے قدس کے سیاسی پہلو کو دیکھا، مگر اس سے وابستہ وسیع تر اور عظیم تر پہلو (جدید کمیونی کیشن) کی حقیقت کو وہ سمجھ نہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست کی چٹان سے تو وہ نصف صدی سے ٹکرا رہے ہیں مگر کمیونی کیشن کی جدید طاقت کو دینِ حق کے لیے استعمال کرنا ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا۔

پاکستان کے لوگ پاکستان کو ملک خداداد کہتے ہیں۔ مثلاً لاہور کے ایک اسلامی ماہنامہ (اپریل ۱۹۹۶) میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کا قیام اللہ کی ایک آیت اور معجزہ ہے۔ اس کی پشت پر اکابرینِ ملت کی چار سو برس کی کوششیں ہیں۔ پاکستان خدائی تدبیر کے تحت وجود میں آیا۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی درج ہے کہ پاکستان جو اسلام کے لیے بنا تھا وہ اسلام کو چھوڑ کر سیکولرزم کی طرف بگٹٹ رواں دواں ہے۔ اسی رسالہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پاکستان مکمل طور پر یہودی نرغہ میں ہے۔ یہودی سازشوں نے اس کا رخ اسلام کے بجائے سیکولرزم کی طرف کر دیا ہے۔ حالاں کہ اس کے بعد پاکستان کے علاحدہ ملکی وجود کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔

یہ رسالہ قرآنک وزڈم کا علم بردار ہے۔ مگر مذکورہ بات کا قرآنک وزڈم سے کوئی تعلق نہیں۔ کیوں کہ قرآن میں تو یہ تصور دیا گیا ہے کہ خدا کی تدبیر ہر مخالف تدبیر پر بالا ثابت ہوتی ہے، وان کان مکرھم لتزول منہ الجبال۔ مگر پاکستان کے قرآنی دانشور یہ خبر دے رہے ہیں کہ پاکستان میں نعوذ باللہ خدائی تدبیر پر یہودی تدبیر غالب آگئی۔

کہنے والے ایسی عجیب بات کیوں کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس کا سبب خود تشکیلِ پاکستان میں ہو سکتا ہے۔ اور جب آدمی ایک غلطی کو نہ مانے تو اپنی غلطی کو درست کرنے کے لیے وہ مزید ایسی غلطیاں کرتا ہے جو پہلے سے بھی زیادہ غیر معقول ہوتی ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر کی قبر یروشلم میں مسجد اقصیٰ کے قریب ہے۔ مولانا محمد علی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ بیمار تھے۔ چنانچہ لندن کے ایک

ہوٹل میں ۴ جنوری ۱۹۳۱ کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ہالی ڈے پارک (محمد علی پارک) میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ پھر سمندری جہاز کے ذریعہ ان کی میت لندن سے یروشلم لائی گئی جو کہ ایک تابوت میں بند تھی۔ جب ان کی میت پورٹ سعید پہنچی تو مصر کے وزیر اعظم آئے اور میت کو مسجد عباس میں لے گئے۔ وہاں دوبارہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ شہزادہ محمد علی نے غلافِ کعبہ کا ایک ٹکڑا تابوت پر رکھا۔ اس کے بعد جب میت یروشلم پہنچی تو جنازہ میں تقریباً دو لاکھ آدمی شریک تھے۔ مفتی اعظم آگے آگے چل رہے تھے۔ مسجد اقصیٰ پہنچ کر جنازہ کی آخری نماز ادا کی گئی۔ مولانا محمد علی کی سوانح عمری میں یہ الفاظ درج ہیں: "اولین قبلہ اسلام کا سینہ پھٹ گیا اور وہ اس میں سما گیا۔ ان کے جسد خاکی کی آخری آرام گاہ وہ ارض قدس ہوئی جس کو قرآن نے (الذی بارکنا حولہ کہا ہے"۔ اس تدفین پر اقبال نے کہا:

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

قرآن میں ہے کہ لقد انزلنا الیکم کتابا فیہ ذکرکم (الانبیاء ۱۰) اس کی تشریح سہل بن عبد اللہ نے یہ کی ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر قرآن اتارا۔ اس میں وہ عمل بتایا گیا ہے جس میں تمہارے لیے زندگی ہے (العمل بما فیہ حیاتکم) القرطبی ۲۷۳/۱۱

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس آیت کے مطابق، یقیناً فلسطین کے مسئلہ کا حل بھی قرآن میں مذکور ہونا چاہیے۔ پھر میں نے کہا کہ اس معاملہ میں واضح رہنمائی قرآن میں موجود ہے، اور وہ یہ آیت ہے: ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثلہ وتلک الایام نداولہا بین الناس (آل عمران ۱۴۰)

اس آیت میں اسلامی تاریخ کے اس واقعہ کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کو بدر کے دن مشرکوں کے اوپر غالب کیا۔ اس کے بعد احد کے دن اللہ نے ان کے دشمنوں کو ان کے اوپر غلبہ دے دیا (اظہر اللہ عز وجل نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ علی المشرکین یوم بدر و اظہر علیہم عدوہم یوم احد) تفسیر الطبری ۱۰۵/۴

اس وقت مسلمانوں میں غم اور مایوسی کے جذبات پیدا ہوئے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا کہ آخرت کی نعمتیں تو صرف اہل ایمان کے لیے ہیں۔ مگر دنیا کا نظام امتحان اور

آزمائش کے اصول پر قائم کیا گیا ہے۔ اس لیے یہاں غلبہ اور مغلوبیت کا تجربہ باری باری ہر ایک کو کرایا جائے گا، تاکہ ہر ایک کی ہر پہلو سے آزمائش ہو سکے (تلك الايام نداولها بين الناس)

یہی بات ایک فارسی شاعر نے ان الفاظ میں کہی ہے کہ —— دانش مند چڑیا جب جال میں پھنس جائے تو اس کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے :

مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

تحمل کا مطلب سپر اندازی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جذباتی ردعمل سے بچ کر صابرانہ منصوبہ بندی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں تمام مسلم دانشور اور رہنما فلسطین کی بازیابی کے مسئلہ کو ملت مسلمہ کا مسئلہ نمبر ایک بتاتے ہیں۔ مگر عین اسی وقت تمام دنیا کے مسلمان باہمی لڑائیوں میں اپنی بہترین طاقت ضائع کر رہے ہیں۔ اس میں متشددانہ جنگ اور غیر متشددانہ جنگ دونوں شامل ہیں۔ مزید ستم یہ ہے کہ ہر ایک اپنے کو خادمِ دین اور مجاہدِ اسلام سمجھ رہا ہے۔

ایران اور عراق دونوں مسلسل فلسطین کے خلاف پرشور بیان دیتے رہتے ہیں۔ مگر دونوں آٹھ سال (۱۹۸۰ - ۱۹۸۸) تک خوں ریز قسم کی باہمی لڑائی لڑتے رہے۔ اس جنگ کے زمانہ کے ایرانی لیڈر آیت اللہ خمینی کے حامی کہا کرتے تھے کہ قدس کا راستہ بغداد ہو کر جاتا ہے (الطريق الى القدس يمرُّ ببغداد) عین اسی وقت عراقی لیڈر صدام حسین کے حامی بلند بانگ طور پر یہ کہتے تھے کہ قدس کا راستہ تہران ہو کر جاتا ہے (الطريق الى القدس يمرُّ بطهران) دوبارہ صدام حسین نے ۱۹۹۰ میں کویت پر فوج کشی کر دی۔ اب صدام حسین کے حامی یہ کہنے لگے کہ قدس کا راستہ کویت ہو کر جاتا ہے (الطريق الى القدس يمرُّ بالكويت)

اس قسم کے الفاظ فلسطین کے مسئلہ سے دلچسپی کا ثبوت نہیں ہیں۔ بلکہ صرف مسلم رہنماؤں کی استحصالی ذہنیت کا ثبوت ہیں۔ یہ صرف ان کے جرم میں اضافہ کرتے ہیں، وہ ان کو کسی انعام کا مستحق نہیں بناتے۔

۳۱ اگست ۱۹۹۵ کی شام کو واپسی ہوئی۔ یروشلم سے تل ابیب تک کا راستہ

بذریعہ کار طے ہوا۔ تل ابیب سے ال آل کی فلائٹ ۸۱ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔

تل ابیب پہنچ کر پہلے ہم لوگ شہر میں گئے۔ میں چاہتا تھا کہ تل ابیب پر ایک طائرانہ نظر ڈال لوں۔ یہ ایک ماڈرن شہر ہے۔ یہ میڈیٹرینین کے کنارے واقع ہے اور اسرائیل کا سب سے بڑا شہری مرکز ہے۔ یہ ایک قدیم بستی کو ترقی دے کر ۱۹۵۰ میں بسایا گیا ہے۔ تل ابیب اور حیفہ اور یروشلم میں اسرائیلی آبادی کا تقریباً ۵۵ فی صد حصہ رہتا ہے۔

ایل آل کی ایرہاسٹس اخبارات لے آئی۔ یہ انگریزی اور عبرانی کے اخبارات تھے۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے اسرائیلی تاجر نے عبرانی اخبار لیا۔ اس تقریب سے ان سے عبرانی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اسرائیل میں سب سے بڑا عبرانی اخبار ایودیت (Y'edio) ہے۔ اس کے معنی ہیں تازہ خبریں۔ اس کے بعد نمبر ۲ کا اخبار ماریو (Maariv) ہے۔ عبرانی زبان دائیں سے بائیں کی طرف لکھی جاتی ہے۔ اس کے طرز تحریر کا ایک نمونہ یہ ہے :

חברת אל על שמחה להציג בפניכם תרגילי "התעמלות כסא", שנ:עדו לשפר את הרגשתכם בזמן הטיסה.
את התרגילים, המיועדים לאנשים בריאים, מומלץ לבצע מספר פעמים במשך הטיסה (5-8 פעמים כל תרגיל,
בקצב איטי). את התרגיל האחרון רצוי לבצע כשעה לפני הנחיתה. אין להתעמל מיד לאחר הארוחה, אלא
כשעה וחצי אחריה. תרגילים 1, 2, 3, ו-7 יש לבצע לשני הצדדים. תיהנו!

مذکورہ تاجر سے میں نے پوچھا کہ عبرانی تو ایک مردہ زبان تھی۔ پھر اتنی کم مدت میں وہ اسرائیل کی ایک زندہ قومی زبان کس طرح بن گئی۔ اس نے کہا کہ عبرانی اگرچہ ہمارے یہاں عام استعمال میں نہیں تھی۔ مگر عام طور پر لوگ عبرانی کو سمجھتے تھے۔ کیوں کہ دعا اور عبادت میں وہ اس کو روزانہ استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ جب اس کو قومی زبان بنانے کا فیصلہ کیا گیا تو آسانی سے عبرانی زبان قومی زبان کے طور پر رائج ہوگئی۔ اور یہ صرف ایک شخص کی کوششوں سے ہوا۔

پاکستان میں کچھ رہنماؤں نے چاہا کہ عربی زبان وہاں کی قومی زبان بن جائے۔ مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ حالاں کہ پاکستان میں بھی تمام مسلمان عربی کو دعا اور عبادت کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ یہودیوں کو صرف عبرانی کے الفاظ نہیں رٹائے جاتے تھے بلکہ اس کا مطلب بھی انھیں پڑھایا گیا تھا۔ پاکستان کے مسلمانوں کو صرف عربی کے الفاظ یاد کرائے گئے تھے، اس کے مفہوم سے وہ ناآشنا تھے۔

دوران پرواز اسرائیلی ایرلائنز (El Al) کا میگزین بابت جولائی - اگست ۱۹۹۵ دیکھا۔ اس میں کثرت سے مکانات کے اشتہار تھے۔ مختلف کمپنیوں کے بنائے ہوئے مکانات کی خوب صورت تصویریں، اور ان کے نیچے اس طرح کے خوش کن الفاظ لکھے ہوئے تھے :

Your dream home in Israel

یا یہ کہ اس خوب صورت کامپلکس میں اپنے لیے ایک اپارٹمنٹ حاصل کیجئے اور دنیا کی جنت میں رہنے کا لطف اٹھائیے۔ میں نے ایک اسرائیلی مسافر کو یہ اشتہارات دکھا کر اس کا تاثر پوچھا۔ اس نے کہا کہ ہم نے خوب صورت قسم کے رہائشی مکانات تو ضرور بنا لیے ہیں۔ مگر ایک نامعلوم خوف ہر یہودی کے دماغ میں ہوتا ہے کہ کیا معلوم، کب کہاں ایک بم پھٹ جائے۔

میں نے سوچا کہ موجودہ دنیا میں پر مسرت زندگی ممکن ہی نہیں۔ یہاں ہر حال میں کوئی نہ کوئی حزن لگا رہتا ہے۔ اس لیے حقیقی معنوں میں پر مسرت زندگی صرف آخرت کی جنت ہی میں ممکن ہے جہاں خدا اپنی برتر طاقت سے حزن کو حذف کر دے گا — (اذھب عنا الحزن (فاطر ۳۴)

بمبئی ایرپورٹ پر مسز سوزن جیکب (Ms Susan Jacob) نے پریشان کیا تھا۔ اس کے بعد اسرائیلی کمپنی کا ایک نوجوان آیا۔ اس نے اپنا نام نیویل مستری (Naville Mistry) بتایا۔ اس نے مزید بتایا کہ اس کا باپ پارسی ہے اور اس کی ماں کیتھولک عیسائی ہے، ماں کے اثر سے لڑکا بھی عیسائی ہو گیا ہے۔ اس نوجوان نے ایرپورٹ پر میری رہنمائی کی۔ اس نے میرا بیگ اصرار کر کے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھ کو آخری گیٹ تک پہنچایا۔

سفر سے واپسی کے بعد مولانا انیس لقمان ندوی کا خط (۸ جولائی ۱۹۹۶) ملا۔ وہ آجکل ابوظبی میں مقیم ہیں۔ یہ خط فلسطین کے مسئلہ سے متعلق ہے اس لیے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے :

ابوظبی میں قیام کے دوران پچھلے چھ مہینوں میں سو سے زیادہ عربوں سے ملاقات ہوئی۔ جن میں مقامی باشندوں کے علاوہ مصر، فلسطین، شام اور دیگر ملکوں سے آئے ہوئے (وافدین) بھی شامل ہیں۔ ان کے ساتھ جن موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی ان میں مسئلہ فلسطین سر فہرست ہے۔ جس شخص نے بھی عربی جرائد و مجلات اور عالم عرب میں چھپنے والی جدید کتابوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ فلسطین پر یہود کا قبضہ عرب دنیا کا واحد سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

اب تک میرا احساس یہ تھا کہ قبلۂ اول (بیت المقدس) کو اسلام میں جو مقام حاصل ہے اس نے فلسطین کو اتنا زیادہ اہم اور سنگین مسئلہ بنا دیا ہے۔ بلکہ فلسطین کے مسئلہ پر بولنے اور لکھنے والا ہر شخص خواہ وہ عرب ہو یا غیر عرب عام طور پر یہی سمجھتا ہے کہ آزادیٔ فلسطین کے لیے عربوں کے مجاہدانہ جوش وخروش کا اصل محرک دینی اور اسلامی ہے۔ مگر عربوں کے ساتھ رہنے اور قریب سے ان کی نفسیات اور مزاج کا تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ "جہاد فلسطین" کا حقیقی محرک دینی حمیت یا اسلامی غیرت سے زیادہ عربوں کی قومی نخوت اور نسلی تفاخر ہے۔

مسئلۂ فلسطین غالباً واحد مسئلہ ہے جس کے بارہ میں عرب دنیا کا تقریباً ہر شخص حساس ہے۔ بلکہ یہی ایک معاملہ ایسا ہے جس میں وہاں کا سیکولر اور اسلام پسند طبقہ دونوں ایک دوسرے کا ہمنوا ہے حالاں کہ دوسرے تمام معاملات میں ان کا حال یہ ہے کہ پہلا گروہ دوسرے کو انتہا پسندی اور دہشت گردی کا الزام دیتا ہے تو دوسرا گروہ پہلے کو کافر اور ملحد قرار دیتا ہے۔ اگر آزادیٔ فلسطین کا اصل محرک اسلامی غیرت وحمیت کو قرار دیا جائے تو پھر اس واقعہ کی توجیہہ ناممکن ہو جاتی ہے کہ کیوں ایسے لوگ ہی اس "جہاد" میں اسلام پسندوں کے شانہ بشانہ شریک ہیں، جنھیں یہ کافر اور ملحد سمجھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حسن البنا، اور شاہ فیصل کی طرح عرب حکام اور عوام دونوں کے درمیان ایک تعداد ایسے افراد کی پائی جاتی ہے جن کے لیے فلسطین پر یہودی قبضہ ان کی دینی غیرت کو چیلنج ہے اور فلسطین کی بازیابی کے لیے کوشش کرنا ایک اسلامی ذمہ داری۔ مگر عربوں کی اکثریت کے لیے یہ حقیقتہً عرب قومیت (العروبۃ) کو چیلنج کرنے کا مسئلہ ہے۔ یہ بات ان کے لیے حد درجہ ناقابل برداشت ہے کہ یہود، جو تعداد میں انتہائی قلیل ہیں اور سیکڑوں برس تک ان کے محکوم رہے ہیں، وہ ان کے اپنے ایک ملک پر اس طرح قابض ہو جائیں کہ بقیہ ممالک کے لیے ان کا وجود خطرہ بن جائے۔ عربوں کی قومی نخوت اس کا تحمل نہیں کر سکتی کہ وہ یہود کے مقابلہ میں پست ثابت ہوں یا یہود ان کے پڑوس میں ان کے ہم سطح اور ہمسر کی حیثیت سے آزادانہ زندگی گزاریں۔ ایک لفظ میں یہ کہ اصل مسئلہ یہودی نسل پرستی (صہیونیت) کے

بالمقابل عرب قومیت (العروبۃ) کی بالادستی کے درمیان کش مکش کا مسئلہ ہے۔

چونکہ تقریباً ڈیڑھ ہزار برس تک یہود کے اوپر عرب کا غلبہ اور تسلط رہا ہے۔ اس صدی کے نصف اول تک عرب دنیا میں یہود کی حالت کم و بیش وہی تھی جو قرآن کے ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ "حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون" مگر جب حالات بدلے اور نئے دور میں طاقت اور غلبہ کے جدید وسائل کو بروقت استعمال کر کے یہود نے داخلی طور پر اپنے آپ کو مستحکم کرلیا۔ جب کہ عرب دنیا ایسا کرنے میں ناکام رہی۔ اور بالآخر یہود فلسطین کے اوپر قابض ہو کر عربوں کے لیے مستقل خطرہ بن گئے تو نہایت شدت کے ساتھ ان کے قومی جذبات بھڑک اٹھے۔ ذہنی اور نفسیاتی طور پر وہ سخت تناؤ اور جھنجلاہٹ اور احساس کمتری کا شکار ہو گئے۔ اسی جھنجلاہٹ اور احساس کمتری کو دور کرنے کے لیے وہ ایک طرف اپنے عظیم ماضی کا تذکرہ کرتے ہیں اور دوسری طرف یہود کو احفاد القردۃ والخنازیر (بندر اور خنزیر کی اولاد) اور اسی طرح کے دوسرے حقارت آمیز ناموں سے پکارتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ یہود کو اپنے ماضی کے آئینہ میں دیکھ کر یہ جھوٹی تسکین حاصل کرتے ہیں کہ ہمیں ان کے اوپر برتری اور بالادستی حاصل رہی ہے۔ مگر وہ اپنے حال کا تقابل یہود کے حال سے نہیں کرتے۔ کیوں کہ ایسا کرنے میں ان کے اندر جھنجلاہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ ان کی قومی نخوت اس واقعہ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ ان کی غفلت اور دوسروں کی زمانہ شناسی کے نتیجہ میں (احفاد القردۃ والخنازیر کہیں) براہ راست ان کے اوپر غالب ہیں اور کہیں بالواسطہ طور پر مسلط ہیں۔

آج کل عرب دنیا کی اسلامی تنظیموں خصوصاً آزادئ فلسطین کے لیے سرگرم تنظیم حرکۃ المقاومۃ الاسلامیۃ (حماس) میں ایک نیا رجحان ابھر رہا ہے۔ وہ یہ کہ اس تنظیم کے افراد اپنے جسم پر بم باندھ کر دشمن کے کسی ٹھکانے یا کسی اہم سرکاری یا عسکری اہمیت کے حامل دفتر میں کود پڑتے ہیں، ان کے جسم سے بندھا بم جب پھٹتا ہے تو وہ خود تو ہلاک ہوتے ہی ہیں مگر اپنے ساتھ دشمن کے بھی بہت سے افراد اور املاک کو تباہ کر دیتے ہیں۔ عام آدمی اگر ایسا عمل کرے تو اسے خودکشی کہا جائے گا۔ مگر بعض مسلم علماء حماس کے اس عمل کو خودکشی (عملیۃ انتحاریۃ) کے

بجائے شہادت طلبی (عملیۃ استشہادیۃ) کہہ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں دکتور یوسف القرضاوی کا ایک مفصل مقالہ کویت کے ہفت روزہ المجتمع (۱۸ جون ۱۹۹۶، صفحات ۳۵ - ۳۴) میں چھپا ہے۔

مذکورہ مقالہ میں یوسف القرضاوی نے مختلف دلائل کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حماس کے نوجوانوں کا یہ اقدام شہادت طلبی کا عمل ہے نہ کہ خودکشی کا۔ کیوں کہ وہ دشمن کو خوف زدہ کرنے (ارھاب العدو) کی ایک جدید اور موثر تکنیک ہے۔ دوسرے یہ کہ ان نوجوانوں کا مقصد محض خدا کی رضا جوئی ہے اور اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف کسی کارروائی پر اگر کوئی اس طرح اپنے کو ہلاک کرتا ہے تو یہ لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کا مصداق ہلاکت نہیں بلکہ شہادت ہے۔ جس طرح صحابہ کرام کے بارے میں آتا ہے کہ مختلف غزوات میں انھوں نے اپنے آپ کو دشمن کے نرغہ میں ڈال دیا اور بالآخر شہید ہو گئے۔

اس سلسلہ میں دو باتیں ملحوظ رکھنی چاہئیں۔ اولاً یہ کہ صحابہ وغیرہ نے بعض غزوات میں جو یہ کیا کہ میدان جنگ میں دیوانہ وار کود پڑے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ انھوں نے ایسا میدان جنگ میں کیا جہاں عملاً جنگ برپا تھی۔ نہ کہ ایسی جگہ جہاں دشمن کے علاوہ بھی بہت سے غیر متعلق لوگ موجود ہیں۔

دوسرے یہ کہ صحابہ نے اگرچہ شہادت کے شوق میں جاں بازی دکھائی۔ مگر اس جاں بازی میں جتنا ان کا لڑ کر مر جانے کا امکان تھا اتنا ہی امکان اس بات کا بھی تھا کہ وہ لڑ کر دشمن کو ماریں گے اور فتح یاب ہو کر لوٹیں گے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ جب قتال کرتے تھے تو یا دشمن کو قتل کرتے تھے یا دشمن کے ہاتھوں قتل ہوتے تھے (فیقتلون ان یقتلون) گویا صحابہ کے اقدام میں احتمالی طور پر دو بہتر نتائج (احدی الحسنیین) پوشیدہ تھے۔ یعنی وہاں فتح اور شہادت دونوں کا پچاس پچاس فیصد امکان رہتا تھا۔ مگر اس کے برعکس حماس وغیرہ کے موجودہ اقدام کا نتیجہ یقینی موت ہے۔ ایسی صورت میں اس کو صحابہ کے جاں بازانہ اقدام کے متابہ قرار دینا قیاس مع الفارق ہے۔ قرآن وحدیث اور آثار صحابہ میں اس بات کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں کہ جہاں پیشگی طور پر صد فی صد موت یقینی ہو ایسے موقع پر اقدام درست ہے۔

دوسری بات یہ کہ اسلام کا ایک متفقہ اصول یہ ہے کہ جہاد کے معاملہ میں مسلمانوں کی داخلی قوت اصل معیار ہے۔ اگر داخلی اعتبار سے مسلمان مستحکم ہیں تو جہاد کا اقدام کیا جائے گا اگر داخلی استحکام مطلوبہ معیار سے کم ہے تو اسی تناسب سے جہاد کے حکم میں تخفیف ہو جائے گی۔ ابتداءً اہلِ اسلام اپنے ایمان اور اللہ و رسولؐ کے ساتھ محبت و وفاداری میں بہت بڑھے ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے سے دس گنی طاقت کے مقابلہ میں جہاد کا حکم دیا۔ مگر جب اس پہلو سے اہل اسلام کی صفوں میں کمزوری آگئی تو اللہ تعالیٰ نے اس میں تخفیف کر دی اور صرف اپنے سے دوگنی قوت کے مقابلہ میں اقدام کی اجازت دی۔ یہ تخفیف اس گروہ کے لیے کی گئی جن کو صحابہ کہا جاتا ہے اور جو نبی آخر الزماںؐ کے ساتھ تھا۔ آج کوئی قائد یا گروہ یہ دعویٰ کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا کہ وہ کسی بھی اعتبار سے پیغمبر یا آپ کے اصحاب سے زیادہ مستحکم اور طاقت ور ہے۔ چنانچہ آج مسلمانوں کے اوپر تخفیف کا اصول بدرجۂ اولیٰ منطبق ہوتا ہے (الآن خفف عنکم ...)

۳ جون کو مغرب کی نماز کے بعد دو عرب طالب علموں سے ملاقات ہوئی۔ ایک کا نام محمد داؤد تھا جو فلسطین کے رہنے والے ہیں اور ابوظبی کے مدرسہ بن درید میں اول ثانوی میں پڑھتے ہیں۔ فون (459025) دوسرے کا نام عمار مصطفےٰ تھا جو مدرسہ ربعی بن عامر، ابوظبی، میں زیر تعلیم ہیں۔ فون (458752) گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ وہ ابھی ابھی اپنا سالانہ امتحان دے کر فارغ ہوئے ہیں۔ اور اب ان کی گرمی کی چھٹیاں شروع ہوئی ہیں۔

میں نے کہا کہ اسکول کا امتحان تو معمولی امتحان ہوتا ہے اس کو چند ہفتوں یا مہینوں کی محنت کے ذریعہ پاس کیا جا سکتا ہے۔ مگر ایک بہت بڑے امتحان میں پوری عرب دنیا پچھلے پچاس برس سے مبتلا ہے لیکن ابھی تک وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ یہ امتحان فلسطین کو یہودی قبضہ سے آزاد کرانے کا مسئلہ ہے۔

پھر میں نے کہا کہ آپ لوگوں کا تعلق اس نسل سے ہے جسے اکیسویں صدی میں میدانِ عمل میں اترنا ہے۔ شاید آپ لوگ اس امتحان میں کامیاب ہو جائیں جس میں پچھلی تین نسلیں مسلسل ناکام ہوتی رہی ہیں۔ میں نے ان سے سوال کیا کہ فلسطین کو آزاد کرانے کے سلسلہ میں

آپ لوگوں کا کیا خیال ہے۔ اسے طاقت کے ذریعہ آزاد کرایا جا سکتا ہے یا دعوت کے ذریعہ (ترى، كيف يُمكِنُ أنْ تُحرَّرَ أرضُ فِلَسْطِين، بالقُوَّة أم بالدَّعوة ؟)

یہ سوال میں نے ایک کاغذ پر لکھ کر دونوں نوجوانوں کو دیا اور کہا کہ اس پر کم از کم تین دن غور کر کے مجھے بذریعہ ڈاک تحریری یا بذریعہ ٹیلی فون زبانی اپنے جواب سے مطلع کرو۔ اور ہو سکے تو اس معاملہ میں اپنے والدین سے بھی مشورہ کر لو۔

تین دن بعد میں نے خود ان کے گھر فون کیا۔ داؤد کے والد نے کہا کہ اپنے لڑکے کو میں نے امتحان کے زمانے میں بھی اتنا سنجیدہ غور و فکر اور مطالعہ میں غرق نہیں پایا جتنا وہ پچھلے تین روز سے آپ کے سوال کا جواب تیار کرنے میں محو ہیں۔ انھوں نے بڑا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ چھٹیوں میں ہم اپنے بچوں کو کوئی بامعنی سرگرمی یا کام نہیں دے پاتے۔ آپ نے بڑا اچھا کیا کہ ان کے خالی اوقات کو ایک بامعنی سرگرمی سے پر کر دیا (لقد أحسَنْتَ إذ ملأتَ فراغَهم بنَشاطٍ هادِف)

اس کے بعد داؤد سے براہِ راست گفتگو ہوئی۔ وہ اپنا اور اپنے ساتھی عمار کا مشترک جواب مجھے فون پر پڑھ کر سنا رہے تھے۔ ان کے تفصیلی جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ سرزمین فلسطین کو یہود کے جابرانہ قبضہ سے طاقت کے سوا کسی اور ذریعہ سے آزاد نہیں کرایا جا سکتا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ دعوت طاقت کی متبادل یا قائم مقام ہو سکتی ہے (لا يُمكِنُ تحريرُ أرضِ فلسطين مِن الاحتلالِ اليهوديِ الغاشِمِ إلا بالقوة، ولا نظُنّ أنّ الدَّعوةَ يُمكِنُ أنْ تكونَ بديلاً عَنِ القُوَّة أوْ أنْ تَحِلَّ مَحَلَّها)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان ابھی تک دعوت کی تسخیری طاقت کا راز دریافت نہیں کر سکے ہیں۔ حالاں کہ تاریخ میں اسلام کی تمام عظیم فتوحات کا دروازہ دعوت ہی کے ذریعہ کھلا ہے۔ اگر اکیسویں صدی میں فلسطین اور اس جیسے دوسرے ملی اور عالمی مسائل کو حل کرنا ہے تو جدید مسلم نسل میں صحیح دعوتی شعور پیدا کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر ہمارے مسائل آئندہ کئی صدیوں میں بھی غیر حل شدہ پڑے رہیں گے۔

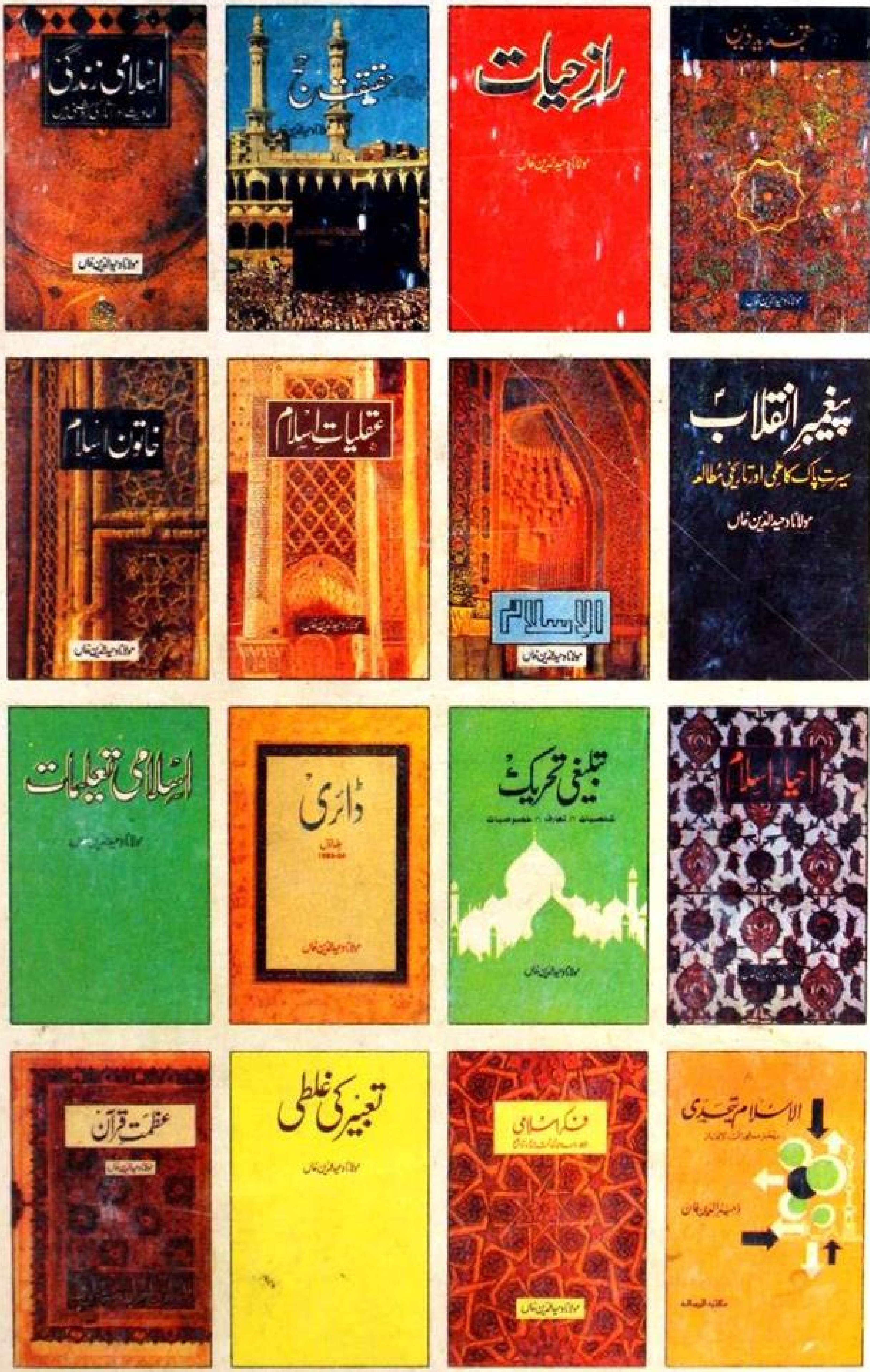

ISBN 81-85063-32-X
Rs. 60

Al-Risāla